مضحکات و مطائبات سر سید

حصہ اول

قیمت ۱۲

نوٹ[1]

ظرافت و خوش طبعی سرسید کی جبلت میں داخل تھی
اسقدر کہ اگر انکے تمام لطائف و ظرائف جمع کئے جائیں
تو ان سے ایک مستقل رسالہ مرتب ہو سکتا ہے
(حیات جاوید حالی)

[1] یہ رسالہ اس قول کا عملی ثبوت ہے ؛

گیلانی برقی پریس لاہور باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپا

رسالہ مضحکات و مطائباتِ سر سیّد

فہرست مضامین

دیباچہ

میرزا غالب ایک مرتبہ اپنے مکان کی انگنائی میں بیٹھے چاندنی رات کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے۔ وہ اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ان ستاروں کو آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنایا۔ جبھی تو یہ ایسے بکھرے ہوئے ہیں۔ کہ نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیر نہ بیل نہ بوٹا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ادب اُردو میں لطائف وظرایف کے مجموعے بھی اپنے رطب و یابس اسی طرح کسی خاص ترتیب کیساتھ پیش نہیں کیا کرتے۔ لیکن اس کتاب میں جو در حقیقت سرسید۔ نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد خاں وغیرہ ہی کے قومی لطائف کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کو اس خاص ترتیب سے شایع کیا گیا ہے کہ اوّل اس میں سرسید کی ایک مختصر سوانح عمری درج کی گئی ہے۔ اور پھر ان کے مخالفوں یا دوستوں نے جو کچھ ان کے خلاف یا انکی تائید میں لکھا تھا اس کا ایک انتخاب درج رسالہ کر دیا گیا ہے اور پھر ان کے کالج کے متعلق یا اسکی اندرونی زندگی جس طرح بیان کیگئی ہے۔ اسکو سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اسی مجموعہ میں سرسید اور نواب محسن الملک کے وہ پرائیویٹ خطوط بھی شامل ہیں جنمیں سرسید کی نوائب صوف کیساتھ بے تکلفی اور محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ اخیر کتاب میں اسی مضمون کے متعلق بعض اور بھی قومی لطائف درج ہیں۔ جو ان احباب کیلئے جو قوم کی نشوونما اور اسکے ترقی کے خواہاں ہیں قومی

ظرافت کا ایک نمونہ کے طور پر کام دے سکتے ہیں :

راقم مولف کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال مولانا حالی کی حیات جاوید کی ایک تحریر سے پیدا ہوا۔ جس میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ظرافت و خوش طبعی سرسید کی جبلت میں داخل تھی اور وہ اس قدر کہ اگر انکے تمام لطائف و ظرائف جمع کئے جائیں تو ان سے ایک مستقل رسالہ لطائف و نوادر کا مرتب ہو سکتا ہے۔ پس میں نے مولانا حالی کے اس قول پر صاد کیا اور جس طرح ایک شکاری اپنے شکار کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور جنگلوں بنوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ رسالہ ہذا کی تالیف کے وقت مجھ کو بھی سرسید کی تمام تصنیفیں اور تحریریں ایک نظر دیکھنی پڑیں۔ اور ان میں جہاں کہیں کوئی لطیفہ یا ہنسی کی بات موجود تھی۔ اسکو فوراً ماخوذ و محفوظ کر لیا۔ اور اسی طرح نواب محسن الملک وغیرہ کی تالیفات سے بھی اپنے مطلب کی باتیں اس ڈھب سے اخذ کیں کہ پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی۔ اس کتاب کا ظریفانہ مواد اتنا بڑھ گیا تھا۔ کہ اسکو ایک جلد میں سمیٹنے کیلئے بہت عرصہ درکار تھا۔ ادھر علیگڈھ کے جشن جوبلی میں صرف چند یوم باقی تھے! اسلئے سرسید احمد خاں اور انکے کالج ہی کے متعلق جو کچھ مضحک تحریریں اور لطائف و نوادر جمع ہوئے تھے۔ ان کو اس کتاب کے حصہ اول میں جمع کر کے شایع کر دیا گیا ہے اور اسکے دوسرے حصے میں جو اس سے بھی کچھ زیادہ مضحک و لطیف تر ہوگا۔ اس میں سرسید محسن الملک۔ مولانا حالی شبلی اور خصوصاً مولوی نذیر احمد خاں صاحب کے وہ قومی لطائف و ظرائف درج ہونگے۔ جو ان بڈھوں کے دلوں کو گرماتے رہے۔ یہاں اس خاص بات کا لکھنا ضروری ہے کہ میں نے ان لطائف کو ان بزرگوں کی متبرک روحوں کی ہنسی اڑانے یا بازی بازی باریش بابا

یا باہم بازی کی نظر سے مرتب نہیں کیا۔ بلکہ دی سر سید اسکول آف ہیومر کو
THE SIR Syed School of HUMOUR. یعنی سر سید نے
قوم میں جو زندگی اور زندہ دلی کے آثار پیدا کئے۔ انہیں کو مضحکات و مطائبات سر سید
میں واضح کرنیکی کوشش کی ہے جشن جوبلی کے خاص موقع کی اطلاع مجھے دیر سے ہوئی
تو ملازمت کی وجہ سے میری رخصت کے نام پر حکام بالا اپنے کاموں پر ہاتھ رکھتے
تھے۔ اسلئے ایک ایسی قلیل مدت میں جو کاتب پریس دستیاب ہوا۔ جوں توں اس
کتاب کا پہلا حصہ طبع کرا دیا گیا۔ لہذا امید ہے کہ طباعت و کتابت کے نقص کو ناظرین
رسالہ ضرور نظر انداز فرمائینگے۔ یہ کتاب دراصل مولانا حالی کی حیات جاوید کا ایک سپلیمنٹ
ہے گویا ۔ پر اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ سر سید کی سوانحعمری نہیں ہے۔ نری بُری مدحی
و نعت خوانی ہے لیکن میرے خیال میں یہ سپلیمنٹ اگر اسپر اضافہ کیا جائے۔ تو جو اصحاب مولانا
حالی کے شاکی ہیں وہ اس باقی داستان کے مطالعہ سے ضرور بالضرور خوش ہو جائینگے۔
میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ اس کتاب میں اردو فن ظرافت کا ایک خاص اسکول یعنی سر سید اسکول
آف ہیومر پیش کیا گیا ہے اسکے مقابلہ میں "دی غالب اسکول آف ہیومر" یعنی (غالب کی اردوئے معلے
وغیرہ) پرانے اردو علم ادب کا ایک تتمہ تھا۔ مگر یہ مسلمانوں کے ایک ایسے قومی لٹریچر کا خاص
باب ہے کہ جس کا آغاز سر سید ہی کی تحریروں اور لیکچروں سے ہوا تھا۔ میرزا غالب کو
اس سے کیا واسطہ ؎ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ مولانا حالی نے قوم کو اپنے مسدس
میں رلا رلا کر قوم کی حالت پر متوجہ کرایا تھا۔ شاید مجھے انکو ہنسا ہنسا کر اس خاص مقصد
میں کچھ کامیابی حاصل ہو جو اگر نہ بھی ہو۔ تو میں اسی بات سے خوش ہوں کہ مولانا حالی
نے سر سید کے قول کی پیروی کی اور مسدس لکھا میں نے حالی کی بات مان کر بعض قومی لطائف

کا یہ مجموعہ مرتب کر دیا۔ اب حق تو یہ تھا کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ آیندہ جشن جوبلی کی تقریب کیلئے تیار رہنے دیا جاتا۔ مگر وہ کالج کا پنجاہ سالہ جشن جوبلی ہوگا۔ اسوقت تک کون جیئے اور کون مرے۔ اسلیئے اس کتاب کا دوسرا حصہ (جو زیر طبع ہے) وہ بھی عنقریب شایع کر دیا جائیگا۔ اس میں زیادہ تر نواب محسن الملک مرحوم اور مولوی نذیر احمد صاحب کے لیکچروں اور انکی تحریروں کے رطب یابس درج ہیں۔ جو حقیقت میں سر سید اسکول آف ہیومر (مضحکات و مطائبات سر سید) ہی کا ایک ضروری نتیجہ و تکملہ ہیں۔

اب جو نئی پود پیدا ہو رہی ہے۔ وہ اپنی دل لگی کے مصالحے خود پیدا کر رہی ہے ان بڈھوں کے مفید قوم و مضحک مگر اصلاحی نکات سے ان کو کچھ سروکار نہیں البتہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ادب اردو کے پڑھنے والے سید انشا اور جرات و مصحفی دیزہ کے منظوم لطائف و شاعرانہ ہجوؤں پر ہنستے ہنساتے تھے۔ وہ ایک شاہی دور تھا۔ اور حسن و عشق یا فواحش و آزادی کا زمانہ تھا۔ وہ وقت اور وہ سماں تو جاتا رہا انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں میں ایک طرح کی غلامی اور اقتصادی تنزل کے تقاضا نے سر سید سے اردو علم ادب میں ایک اور نوع کے علم ادب نثر نگاری کی بنا ڈلوائی۔ یہ اسکی ایک یادگار رہے گی۔ آہ۔ اب سر سید نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد مرحوم جیسے زندہ دل لیکچرار اور مصنف ہی کہاں ہیں۔ جو دوبارہ پیدا ہونگے اور ہمیں ایسی دلخوش کن باتیں پھر اس خاکی دنیا میں آکر سنائیں گے بقول شخصے ؎

یہ چمن یوں ہی رہیگا اور ہزاروں جانور　　اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائینگے

(سرخوش)

مضحکات و مطائبات سرسید

پیر نیچر

تمہید۔ ہندوستان جنت نشان میں سن ستاون کے غدر کی وجہ سے جو ہڑبونگ مچا اور ہیجان اور ہنگامہ ہر طرف یہاں نمودار ہوئی۔ ۔ ۔ اس کا یہ ایک لازمی نتیجہ تھا۔ کہ اس ملک میں بھی کوئی ناشدنی یا غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہو۔ جیسے کہ ملک فرانس میں شہرہ آفاق غداری و بغاوت کے بعد اس ملک کا انقلاب یعنی فرنچ ریوولیوشن فی الفور رونما ہو گئی تھی۔ اور ایک مرہنگ و بنگ نپولین کو معاً منظر کے اسٹیج پر لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ اور اس واقعہ سے سرزمین یورپ کی تمام پرانی سلطنتیں دفعتاً تہس نہس ہو گئی تھیں۔ اور کتنے ہی بڑھے بڑے تاجدار نوجوان نپولین کے آگے سر جھکانے لگے تھے۔ اور مغرب کی تمام سلطنتوں کا نقشہ ہی ایک آن میں بدل گیا تھا۔

قریب قریب یہی حال ہندوستان کا ہوا۔ یعنی ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر اسیر فرنگ ہوئے۔ اور وہ نواب زینت محل بیگم و جہاں بیگم و جنس بیگم یا مرزا جواں بخت و مرزا ام بخت وغیرہ وغیرہ کی معیت سے بہ یک بینی و دو گوش رنگون بھیج دیے گئے۔ اور وہ سب شہزادے شہزادیاں قلعہ دہلی کے قورمہ پلاؤ کھانے کھاتے خفیف بنگالی دال بھات پر گذر اوقات کرنے لگے تھے۔

اور یہ سلطنت مغلیہ کی اس گھڑی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اور جس شاندار عمارت کی بنیاد بابر نے ڈالی تھی۔ اور اس پر اکبر و شاہجہاں نے گویا پچی کاری و گلکاری کی تھی۔ بعض آخری تاجداران مغلیہ کے عہد میں وہ سب عمارت ہی بوسیدہ ہو کر دھڑام سے گری۔ اور اس کے گرنے کے ساتھ تمام ملک میں گویا گدھے کے ہل چل گئے۔ اسی ہل چل میں سب کی آنکھیں یک بیک منحرف ہو اٹھنے لگیں۔ اور ملک میں برٹش حکومت کے چار ستون قائم ہوئے۔ بازیگروں نے ہر جگہ نئے نئے اڈے جمائے گئے۔ کیونکہ جدید سی انتظامات ہو کر لوگ انگریزی تعلیم اور مغربی معاشرت کی ہوا کھانے لگے تھے۔ اور ہر طرح کے دقیانوسی پرانے دھرانے خیالات جن کی بنا مذہب پر تھی

سر سید مرحوم کا حسب و نسب

وہ جب خود بخود اس خاکی دنیا میں آدھمکے تو خاص دلّی میں تراہہ بیرم خاں سے کچھ ادھر اُن کا ظہور ہوا تھا۔ اس سے پہلے ان کے خاندان میں جب کبھی ایسا اتفاق ہوا تو عین خاموشی کی حالت میں ہو جاتا رہا۔ یعنی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ ان کے نانا کون اور دادا کون ہیں۔ مگر ایک مہدی اور پھر ایک بار سر کی آمد کو ہمیشہ کچھ دقت [illegible] بمصداق اس مثل کے کہ چاند چڑھے تو چھپا کیسے رہ سکتا ہے سب کے سب سر سید کے حسب و نسب کی تحقیق و تلاش کا خبط سوار ہوا۔ آخر یہ راز کھلا کہ آپ چھتیس واسطوں سے ایک نقوی و رضوی سید ہیں۔ اور ان کے نانا۔ نانا کے پڑنانا بلکہ اس سے بھی کچھ اوپر کے رشتہ سے آپ کے خاندان کا سلسلہ نبوت کی ایک آخری کڑی یعنی امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا خاں علیہما السلام سے وابستہ ہے۔ غرض آپ نجیب الطرفین سید۔ خالص سید اور سید القوم ہیں۔ غلط از آں پیشوا کے سید نہیں [illegible] حالی مرحوم نے ان کے نقوی و رضوی سید ثابت کرنے میں[1] ناحق کی اتنی زحمت اٹھائی تھی۔ وہ نہ صرف نام و خاندان ہی کے سید بلکہ اپنی زندگی اور اس کے اعمال کے رو سے بھی بلاریب ایک سید اور خادم قوم سید تھے۔ اور اس سے بڑا درجہ طبقہ سادات میں بعض کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ مثلاً میر تقی میر کی نسبت بعض لوگوں نے شبہ کیا تھا کہ وہ سید نہیں ہیں۔ اس پر آزاد نے آبحیات میں صرف اتنا لکھ کر سب کا منہ بند کر دیا تھا۔ کہ میر صاحب کی مسکنت اور ان کی عزت طبع شہادت پہنچاتی ہیں کہ وہ فی الواقع سید تھے چنانچہ ایک دفعہ زمانہ کے ہاتھوں تنگ آکر آپ نے یہ شعر کہا تھا۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

القصہ ایک شاعر محض حسن طبیعت کے تقاضا سے سید بنائے جانیکا مستحق ہے۔ تو پھر ایک [illegible] مرحوم نے علم و فلسفہ کے لاکھوں دفتر سیاہ کر دئے ہوں۔ اور جس کے لیکچروں سے مردہ قوم میں کن فیکون کا سا سماں کھنچ گیا ہو۔ وہ کیسے سید نہ ٹھہرتے۔ جی ہاں وہ ضرور بالضرور سید بلکہ سر سید ہیں۔ [illegible] مرحوم تھا ہے لیکن ایک سید پیر نیچر کیسے بن گیا یا بنایا گیا۔ یہ داستان صفحات آئندہ میں بیان ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[1] حیات جاوید کا صفحہ ۱ جلد ۱ عبارت ۲ ملاحظہ ہو۔

سر سید مرحوم کا حسب و نسب

وہ جب خود بخود اس خاکی دنیا میں آ دھمکے تو قصبہ دہلی میں تراہہ بیرم خاں کے پچھواڑے اُن کا ظہور ہوا تھا۔ اس سے پہلے اُن کے خاندان میں جب کبھی ایسا اتفاق ہوا تو عین خاموشی کی حالت میں ہو جاتا رہا۔ یعنی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ ان کے نانا کون اور دادا کون ہیں۔ مگر ایک مہدی اور پیغمبر کی آمد کو ہمیشہ چھپا [illegible] بمصداق اس مثل کے کہ چاند چڑھے تو چھپایا کیسے رہ سکتا ہے سب کے سر پر سر سید کے حسب و نسب کی تحقیق و تلاش کا خبط سوار ہوا۔ آخر یہ راز کھلا کہ آپ چھتیس ۳۶ واسطوں سے ایک نقوی و رضوی سید ہیں۔ اور ان کے نانا، نانا کے پڑنانا بلکہ اس سے بھی کچھ اوپر کے رشتہ سے آپ کے خاندان کا سلسلہ نبوت کی ایک آخری کڑی یعنی امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا خاں علیہما السلام سے وابستہ ہے۔ [illegible] نجیب الطرفین سید۔ خالص سید اور سید القوم ہیں۔ غلط از زبان [illegible] کے سید نہیں ہیں لیکن مولانا حالی مرحوم نے اُن کے نقوی و رضوی سید ثابت کرنے میں ناحق کی اتنی زحمت اٹھائی تھی۔ وہ نہ صرف نام و خاندان ہی کے سید، بلکہ اپنی زندگی اور اپنے اعمال کے رو سے بھی بلا ریب ایک سید اور خادم قوم سید تھے۔ اور اس سے بڑا درجہ طبقۂ سادات میں بعض کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ [illegible] میر تقی میر کی نسبت بعض لوگوں نے شبہ کیا تھا کہ وہ سید نہیں ہیں مگر آزاد نے آبحیات میں صرف اتنا لکھ کر سب کا منہ بند کر دیا تھا۔ کہ میر صاحب کی مسکنت اور ان کی عزت طبع شہادت پہنچاتی ہیں کہ صحیح الاصل سید تھے چنانچہ ایک دفعہ زمانہ کے ہاتھوں تنگ آ کر آپ نے یہ شعر کہا تھا۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی۔

القصہ ایک شاعر محض حسن طبیعت کے تقاضا سے سید بنائے جانے کا مستحق ہے۔ تو پھر ایک [illegible] مرحوم نے [illegible] کے لاکھوں [illegible] کر دئے ہوں۔ اور جس کے لکچروں سے مردہ قوم میں کن فیکون کا سا [illegible] ہو وہ کیسے سید نہ ٹھہرتے۔ جی ہاں وہ ضرور بالضرور سید بلکہ سر سید [illegible] لیکن ایک سید پیر نیچری کیسے بن گیا یا بنایا گیا۔ یہ داستان صفحات آئندہ میں بیان ہوگی [illegible]

۱؎ حیات جاوید [illegible]

سر سید مرحوم کی جوانی چنانکہ آفتِ دیوانی

بچپن کا زمانہ بقولِ حالیؔ ہمیشہ بادشاہت کا زمانہ ہوا کرتا ہے۔ اسکا تو ذکر ہی کیا مگر سر سید سے جب کبھی اس امر میں بھی دریافت کیا گیا۔ تو آپ نے ذرا ٹالنا چاہا۔ اور نہ صرف جوانی اور لڑکپن ہی کے حالات لکھنے سے احتراز کیا۔ بلکہ سرے سے اپنی تمام بائیوگریفی ہی کے قلم لئے جانے سے انکار کر دیا۔ تاہم اہلِ تحقیق کے لئے نچلا بیٹھنا دشوار اور مصنفوں یا مولفوں کا قلم کبھی بیکار رہے۔ یہ کیا معنی۔ آخر سر سید کے حالات کھود کھود کر نکالے گئے۔ اور انکی ایک ایک بات ہر جگہ "الم نشرح" کر دی گئی۔ چنانچہ لکھا ہے۔

کہ وہ اپنے نانا خواجہ فرید کی حویلی میں ان کے ساتھ شب و روز رہا کرتے تھے۔ وہ حویلی اسقدر چوڑی چکلی تھی کہ اس کے صحن اور چھتوں پر لڑکوں کا ایک جم غفیر عموماً بھاگ دوڑ اچک پھاند لگایا کرتا تھا۔ ان میں سر سید مرحوم بھی صبح و شام شریک ہوا کرتے تھے۔ اور آنکھ مچول۔ کبڈی۔ گیڑیاں۔ باگلی ڈنڈا اور چیل چلیتو وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔ کبھی ان لڑکوں میں کچھ جھگڑا ہو جاتا۔ اور گدھے بازی کی نوبت آتی تو ان کے بڑوں میں سے کوئی صاحب درمیان آ کر تصفیہ کرا دیتے تھے۔ اور جسکی طرف جیت معلوم ہوتی۔ اسکو شیر بنایا جاتا۔ اور چیند کر لینے کی نسبت یہ حکم صادر کیا جاتا تھا۔ کہ جو لڑکا چیند کرے۔ اسکو اپنے ساتھ کھیلنے ہی نہ دو۔

یہاں تک تو مولف کے ارشادات ہیں۔ مگر حضرت سر سید نے اپنے لڑکپن میں کتنی دفعہ چیند کی تھی۔ یہ اہم نکتہ مصنف نے نظر انداز کر دیا ہے۔ لہذا ہم بھی افسوس کہ بیٹھ اب اس معاملہ پر کچھ زیادہ روشنی ڈالنا نہیں چاہتے۔ تاہم سر سید سے جب کبھی اپنی سوانح عمری لکھوانے کو کہا جاتا تھا۔ تو آپ مسکرا دیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ کہ ہم کیا۔ اور ہماری بیوگریفی ہی کیا۔ اس میں سوائے اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں۔ کنکوے اڑائے۔ کبوتر پالے۔ ناچ مجرے دیکھے۔ اور بڑے ہو کر نیچری۔ کافر۔ یا بیدین کہلائے۔ اور رکھا ہی کیا ہے۔

خوب خوب۔ ایک اتنا بڑا مصلح قوم۔ اپنی زندگی کو یوں حقیر سمجھے۔ انکسار اور فروتنی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ بڑے آدمی اپنے کو چھوٹا کہیں۔ تو جانو اور بھی بڑا بننا چاہتے ہیں۔

مسٹر [illegible] سر سید جب نو نہال ہوں گے تب [illegible] ننہال میں بڑے مزے کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ان [illegible] جب ان پر جوانی آئی۔ تو نئے جوبان کا بھوت ان کے سر پر ایسا چڑھا۔ کہ توبہ ہی بھلی۔ مگر ان۔

کی جوانی کی کہانی سننے سے پہلے اُن کے لڑکپن کے کچھ لطائف یہاں نقل ہوتے ہیں۔

ماں بی بی کی محبّت

سر سیّد کی دایہ کا نام ماں بی بی تھا۔ وہ انکو بہت محبت سے رکھتی تھی جب یہ پانچ برس کے ہوئے تو ملک الموت نے اُس سے نبض پارچ کئے۔ اور وہ چلتی بنی۔ سر سیّد کہتے ہیں۔ کہ جب ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے مجھے دالیے کا شربت پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی۔ اور اس کیلئے سب رونے لگے۔ تو مجھے بھی سخت رنج ہوا۔ مگر میری والدہ نے مجھے یہ کہکر سمجھایا۔ کہ بیٹا۔ تم غم مت کرو۔ تمہاری ماں بی بی اللہ میاں کے ہاں چلی گئی ہے۔ جہاں اُسکو بہت اچھی چیزیں کھانیکو دی جاتی ہیں۔ اور وہ ایک بڑے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اسکی خدمت کیا کرتے ہیں۔ اور اسکی زندگی بہت آرام کے ساتھ بسر ہوتی ہے؟

ان باتوں سے سر سیّد کی فوراً تسکین ہو جاتی تھی۔ اور جب کبھی جمعرات کو ماں بی بی کی فاتحہ ہوا کرتی اور کوئی اچھا کھانا محتاجوں کو کھلایا جاتا تھا۔ تو سر سیّد خیال کیا کرتے تھے کہ وہ کھانا سب کا سب اسکو پہنچ جائیگا۔ اور وہ اسکو خوب مزے لیکر کھائیگی۔ مگر میرا خیال ہے۔ کہ اسوقت سر سیّد خوش ہو تے تھے جب کبھی اپنی ماں بی بی کی زندگی کو اسقدر مزے میں گذرتی ہوئی سنتے ہونگے۔ تو ان کے دل میں بھی یہ امنگ ضرور پیدا ہوتی ہوگی۔ کہ کاش ہم بھی ماں بی بی ہی کے ہاں چلے جائیں۔ اور وہاں خوب خوب نعمتیں کھائیں۔ اور اسیطرح آرام سے رہا کریں نہ کہ دنیا میں رہکر استادوں کی مار کھایا کریں؟

بچپن میں سر سیّد کی ایک شوخی

مولانا حالی فرماتے ہیں۔ کہ وہ اپنے کھیل کود کے زمانے میں بڑے مستعد چالاک اور بہت شوخ طبع تھے چنانچہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھی شرارتیں کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ انکا ایک رشتہ کا بھائی استنجا کرنے میں مصروف تھا۔ آپ دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ اور جہاں وہ بیٹھا تھا۔ وہاں پہنچکر اس کو زمین پر چت گرا دیا۔ جس سے اُس غریب کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لیکر ان کے پیچھے دوڑا۔ اور دور تک تعاقب کیا۔ مگر یہ بچ گئے کیونکہ ایک عزیز نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

ایک اور شرارت ایک دن کسی رشتے کے بھائی سے سر سید شطرنج کی بازی کھیلنے میں مصروف تھے۔ کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ آپ نے اسکو پکڑ کر ایک ایسا گدا دیا۔ کہ اس بیچارے کی ہاتھ کی انگلی ہی اتر گئی۔ اور وہ لڑکا کئی دن تک بیمار رہا۔ مگر یہ اپنی شرارتوں سے کب باز آنیوالے تھے ہمیشہ یونہی لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوا کرتی تھی۔ اور سر سید اپنی طفولیت کے دن عموماً بہت آوارگی کی حالت میں گذارا کرتے تھے۔

تیراکی اور تیر اندازی کی مشق

سر سید کے والد دلی کے شہزادوں میں سے مرزا مغل اور مرزا طفیل کے مقابلے میں سو سوا سو شاگردوں کا ایک غول اپنے ہمراہ لیکر تیراکی کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ یہ بھی ان کے ساتھ جا کر دریائے جمنا میں ڈبکیاں لگایا کرتے تھے۔ اور سارا سارا دن دریا ہی پر گذار دیا کرتے تھے۔ پھر جب تیراکی کا ایسا شوق کچھ مدھم پڑ گیا تو تیر اندازی کی مشق نے ان کے دل کو گدگدایا۔ چند ایک ہمسائے وہیں کے لڑکوں کے ساتھ مل جل کر تیر اندازی کرنے لگے۔ ایکدن انکا تیر ایسا نشانے پر بیٹھا۔ کہ ان کے والد نے انکو بہت شاباش دی۔ اور یہ بھی کہا کہ مچھلی کے جائے کو بھلا تیرنا کون سکھائے۔ غرض سر سید ہر کھیل ہر بازی میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ اور میرا تو یہ عقیدہ ہے۔ کہ جو لڑکا اپنی صغیر سنی میں اچھا کھلنڈرا نہیں بن سکتا۔ وہ ایک بڑا آدمی بھی کبھی نہیں بن سکتا۔

عنفوانِ شباب

سر سید کی جوانی اور ان کا شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گذرا تھا۔ وہ رنگ رنگ کی جلسوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اور دوستوں کے ساتھ شب و روز باغوں کی سیر بھی کیا کرتے تھے۔ جہاں عیش و مسرت کے جلسے اور دعوتیں قرار پاتی تھیں۔ اور سب جوانی کے نشے میں خوب ہنسی کھیل کرتے تھے۔ بلکہ ہولی کے جلسوں۔ تماشوں۔ پھول والوں کی سیر اور بسنت کے موقعوں پر تو خاص خاص اہتمام کئے جاتے تھے۔

ان کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر جو چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلہ لگتا تھا۔ اس میں سر سید ہی

اپنے بھائیوں کی بہ نسبت منتظم و مہتمم بنا کرتے تھے۔ اسی طرح خواجہ محمد اشرف صاحب کے مکان پر جو بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ اس میں شہر کے خواص مدعو کئے جاتے تھے۔ نامی نامی طوائفیں زعفرانی زرد پشوازیں پہنکر وہاں آتی تھیں۔ گھر کی دیواریں بلکہ فرش فروش سب زرد ہی نظر آتے تھے۔ حوضوں میں زرد پانی کے فوارے چھوٹتے۔ اور صحن میں جو چمن کھلتا تھا۔ اسمیں بھی پھول جھاڑ ان زرد کھلا کرتے تھے۔ اور ان جلسوں میں شہر کی طوائف باری باری بیٹھ کر گاتی بجاتی تھیں۔ سر سید کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ وہاں آیا جایا کرتا تھا۔ اور ان جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔

خود سر سید کے ماموں نواب زین العابدین کے مکان پر بڑے بڑے نامی گوئیے دھرپت اور خیال گانیوالے جمع ہوا کرتے تھے۔ میر ناصر احمد جو دلی بھر میں مشہور بین بجانیوالے تھے۔ وہ بھی وہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اسیطرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کی رات ایک دلچسپ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اسمیں بھی بڑے بڑے نامی گوئیے آتے تھے۔ اور قوالی ہوتی تھی۔ ان سب رنگین محفلوں اور جلسوں میں سر سید اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ رائے پیارن کشن کے مکان پر قرار پاتا تھا۔ وہاں بھی نہایت وضعدار اور شوقین لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ اور چمپا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز تھی۔ اور رائے صاحب کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اسکی خاطر سے جو مجلس ہر مہینے وہاں منعقد ہوتی تھی۔ سر سید اسمیں بھی بلا ناغہ شریک ہوا کرتے تھے۔ پھر جب وہ نوکر ہو کر آگرہ گئے۔ تو یہ سب عادات ان کے ساتھ تھیں۔ وہاں بھی بعض زندہ دل دوستوں سے روضہ تاج گنج۔ اعتماد الدولہ۔ اور بوز افشاں وغیرہ میں آئے دن عیش و نشاط کے جلسے مناتے رہے۔ اور ایک عرصہ تک اپنی زندگی لہو و لعب میں بسر کی۔

ایک لطیفہ کہتے ہیں۔ دلی میں ایک مشہور طوائف مسمی شیریں جان[1] جو نہایت حسین اور شوخ چنچل تھی۔ کسی جلسہ میں شریک تھی۔ ساتھ اس کے اسکی والدہ شریفہ بھی آئی تھیں۔ جو کہ نہایت کریہ سانولے رنگ کی تھی۔ انہی دونوں کے سامنے سر سید کے ایک قندھاری دوست بھی تشریف رکھتے تھے۔ باتوں باتوں میں اس قندھاری دوست نے پہلے شیریں جان کی تعریف کی پھر اسکی ماں کیطرف نظر اٹھا کر کہا۔ "بلے مادرش بسیار تلخ است"۔ سر سید نے فوراً یہ مصرعہ پڑھا۔

"گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد"۔

[1] [illegible] تخلص عبداللہ خاں نام ۴۰ - ۴۵ برس کے مشتاق تھے۔ رنگ سخن بدیہ الشعرا یا اس کے حریف ناسخ دہلوی کے کلام پر ضو میں مارتا تھا اور ان سے ریختہ کسیقدر بہتر کہتے تھے۔ مضمون ایسے نازک اور [illegible]

غرض سرسید کی جوانی چنانچہ انتہا دیوانی یہ سب کہانی مولانا حالی نے تو اسیقدر بیان کی تھی۔ مگر لکھنؤ
کا مشہور ظریف پرچہ "اودھ پنچ" اِن حالات پر کچھ اضافہ کرتا ہے۔ اور ۲۷ فروری سنہ ۱۹۰۲ء کے ایک
ایشوع میں نیچری نامہ مقیمان کے عنوان سے اپنا چھٹا سبق یوں قلمبند کرتا ہے۔

سرسید احمد خاں کی بے قید مطلق العنان زندگی میں ہزاروں باتیں ہونگی۔ مگر میں اُنکا ہمزاد تھوڑا ہوں۔
کہ ایک ایک کو تفصیل وار گنوا دوں۔ یہ کام تھا۔ مولانا حالی کا سو گردہ تو دائم ولے تقویم کی گھنگنیاں اپنے
منہ میں بھرے بیٹھے ہیں۔ حال معلوم ہو تو کیونکر۔ خیر "مشتے نمونہ از خروارے"۔ اس نیچری الف لیلہ میں کی
صرف ایک بھولی بسری ہوئی حکایت آپکو سناتا ہوں۔ سنتے ہی شہریار[1] نہ ہوجائیں۔ تو میرا ذمہ۔

بعض خاص صحبتوں میں سرسید احمد خاں نے خود اپنی زبان سے بیان کیا۔ کہ جن دنوں دِلّی زندہ تھی۔ اور
ہم خود بھی زندہ تھے۔ اور زندگی زندہ دلی ہی سمجھی جاتی تھی۔ سو ان زندہ دلوں کی سوسائٹیوں کا میں بھی ایک
جاندار رکن تھا۔ کوئی سیر کبھی خالی نہ جاتی تھی۔ اور کوئی جلسہ تماشا ناغہ نہ ہوتا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تفریح
کے موقع حاصل کرتا تھا۔ اور تلاش کر کرکے دل لگی کے سامان بہم پہنچاتا تھا۔ اس اوباشانہ و مستانہ طریق زندگی
میں ایکدن یہ دھن سمائی۔ کہ برسات کے بہار دن ہیں۔ لال قلعہ ان دنوں اپنے جوبن پر ہوگا۔ امرئیوں میں
جھولے پڑے ہونگے۔ بیگمیں جھولتی ہونگی وہاں مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں۔ چلو اسکے وہاں کی بھی سیر
دیکھیں لیکن کوئی تجویز قلعہ کے اندر جانیکی خیال میں نہ آتی تھی۔ ایک بزرگ دوست سے جو کہ قلعہ میں
تعلق خدمت رکھتے تھے۔ بے تکلف ہمارے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اپنی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے چھوٹتے
ہی کہا۔ کہ یہ بات کوئی مشکل نہیں۔ بس شہزادوں کیسی صورت بنالو۔ اور میرے ساتھ چلے چلو۔ نہیں
کوئی پوچھنے کا بھی تو نہیں لہذا انہی حضرت کے ارشاد کے مطابق سرسید کہتے ہیں۔ کہ میں شہزادہ بنا۔
اور اپنے مرشد کو ہمراہ لیکر شہزادوں کی طرح قلعے میں داخل ہوا۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ کہ وہاں کیا سماں
دیکھا۔ گویا باغ میں اندر کا اکھاڑہ اتر آیا تھا۔ نفیس نفیس نیم رنگ ملکی پوشاکیں سب زیب بدن تھیں۔ کوئی
دلہن بن دلہن روپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ کوئی گلبدن گلابی جوڑے کی بہار دکھا رہی تھی۔ اور کوئی قتالہ
بالکل اپنی سادہ وضع ہی میں کٹاؤ کر رہی تھی کہیں پیازی رنگ کی انگیا پر لیکا صالحہ ٹنکا تھا۔ کہیں

---

[1] الف لیلہ کو شہریار سے گہرا تعلق ہے۔

فکر مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ چنانچہ ہوش جاتے جاتے ایکطرف سفید ہوگیا تھا۔
ایکدفعہ شیریں جان سے حج بیت اللہ جانے کی خبر سنی تو [illegible]

آنچل محرم پر خوش آب موتی ڈھلک رہے تھے۔ بناؤ سنگار، زیورات بھی اپنی اپنی جگہ پر سب جگمگا رہے تھے گویا متعدد جواہر خانے تھے۔ کہ طلسم آرائش سے لال پری۔ سبز پری۔ نیلم پری۔ پکھراج پری بنکر ہر طرف طاؤس طناز کی طرح وقف خرامِ ناز تھیں۔ ان میں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں۔ کنواری بالیاں بھی۔ اور خوب خوب جوان جہان بھی۔ اٹھتی جوانی۔ ابھرتا جوبن۔ نکھرتا حسن۔ ان سب نے مل ملاکر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ پہچھ بوچھے ہی نہیں چھوٹتی وہ تھیں۔ اور پاؤں تلے سے زمین سرکی جاتی تھی۔ اُمنڈی ہوئی گھٹائیں۔ ہلکی ہلکی پھواریں صندل کے تختے۔ ریشمی ڈوریاں لٹکتی ہوئی تھیں۔ بڑھتی ہوئی پینگیں ہنسانی مانند پاؤں نور کے گلے۔ قیامت کے دوہرے۔ اور گیت۔ ایک سماں تھا۔ کہ بہشت اور جنت کے نظارے نظر سے گر گئے۔ شاخِ طوبیٰ مرجھا گئی۔ یا حوروں پر اوس پڑنے لگی۔ اور وہ شرما کے رہ گئیں۔

گھر آیا تو سمجھا نواں گلفام کی طرح کئی دن حواس بجا نہ تھے۔ ہفتے عشرے کے بعد حواس خمسہ کچھ درست ہوئے۔ اور حسب معمول چاندنی چوک کی سیر کو نکلا۔ تو وہاں ایک مرشد زادے اتفاقاً مل گئے۔ ان سے میری کچھ دور کی صاحب سلامت تھی۔ ہنستے ہوئے قریب آئے۔ اور چپکا کر کہا۔ کہ واہ سید تم وہاں بھی جا پہنچے۔ میں نے انکار کیا۔ اور کہا کہ نہیں مجھ سے کیا علاقہ مرد کوئی تمہارے سے ہی یار آشنا ہوں گے۔ کہنے لگے۔ کہ نہیں۔ واللہ باللہ تمہیں تھے۔ اس پر ہم ہنس دیئے اور وہ بھی کچھ دیر تک ہنستے رہے۔

اودھ پنچ کا نامہ نگار اتنا لکھ کر پھر اس پر یہ حاشیہ پڑھاتا ہے۔ کہ سر سید کی جوانی کی کہانی انکی اپنی زبانی تو اسی قدر ہے۔ لیکن تعجب ہے۔ کہ دنیا کے شاہزادوں کا بیگمات میں رہتے رہتے یہ حال ہو گیا تھا۔ کہ ان کی سب باتیں عورتوں کی سی ہو گئی تھیں۔ مگر جہاں شاہزادوں کا زنانہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ وہیں بیگمات کے مزاج و اخلاق کا مردانہ پن بھی نمایاں ہوتا ہے۔ کیا اُن (بیگمات) کی مطلق النانی یہ نہیں دکھاتی۔ کہ وہ بیجا۔ بیجا عورتوں اور مردوں میں بہت شوق سے ترغیب کرتی تھیں۔ یعنی وہ گھر کے مردوں سے کہیں زیادہ باہر کے مردوں کو دیکھکر اپنے دل میں خوش ہوتی تھیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں۔ کہ یہی ہمارے حسن و جمال کے پورے پورے قدردان ہیں۔ ہماری آرائش و زیبائش کی داد اگر ملیگی تو انہیں سے ملیگی۔ سید احمد خاں کو دیکھ کر انکا نہ جھجکنا۔ دلیل ہی بات کی ہے۔ کہ یہ آئے دن کے واقعات تھے اور جہاں اور بیسیوں نوجوان روز بھیس بدل بدلکر وہاں آتے تھے۔ اور جھک مارکر چلے جاتے تھے ہم نہیں کہتے کہ حضرت سر سید بھی وہاں کسی ناپاک غرض سے جایا کرتے تھے۔ مگر حالی کا حیات جاوید

سر سید باوجود استعداد و عائے دونوں کے ثواب حج سے محروم ہی رہے۔ اگر وہ سیر حجاز فرماتے تو شاید حجاج کی کی سہولت کیلئے وہاں بھی کچھ نہ کچھ کر دکھاتے۔ مگر سر سید پہ ہی کیا موقوف ہے علی شبلی سو کا اللہ کسی نے بھی جا کر مولانا نے کچھ حج ...

میں اس شکایت کو نہ بیان کرنا گویا چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔ اور حقیقت میں سر سید نے اپنی ایسی صحبتوں
میں اُس انسانی فطرت کا اصلی جوہر صاف دکھا دیا ہے۔ جو یورپین سوسائٹی میں عورتوں کے ہر جگہ مردوں
کیساتھ شریک ہونے سے عام نفسانی جذبات کا محرک ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح موسم برسات
میں یہ جھولے دراصل چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے مشغلے ہیں۔ نہ یہ کہ اچھی خاصی نوجوان شہزادیاں۔ بلکہ
سن رسیدہ بڑھیاں بھی اپنے کمر کوٹے کا وزن دکھاتی پھریں۔ اور اُن بہروپیے مردوں کا شکار ہوا
کریں۔ بس وہ اگلا زمانہ بھی ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ جس میں سر سید کی جوانی اور اُس کا شباب
یوں بسر ہو گیا ؎ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

دم الاخوین

سر سید جن دنوں امتحانِ منصفی کی طیاریاں کر رہے تھے۔ انکا بڑا بھائی سید محمد خاں
اور انکا ماموں زاد بھائی حاتم علی خاں بھی اس کام میں اُن کے شریک تھے۔ سب بھائیوں نے امتحان
منصفی کیلئے قواعد دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ مرتب کیا۔ اور اس کا نام انتخاب الاخوین رکھا۔ مگر
یار لوگوں نے اس مجموعہ کو دم الاخوین کہکر سر سید پر خوب پھبتیاں اڑائیں۔ کیونکہ فارسی میں دم الاخوین
ایک سرخ گوند کو کہتے ہیں۔ جو اکثر نگینے اور دوائیں ڈالنے کے کام آتی ہے۔ اور ویسے بھی دم الاخوین کے لغوی
معنے دو بھائیوں کا خون ہے

آثار الصنادید

سر سید نے انگریزی عملداری کے شروع ہوتے ہی اپنے آپکو خوب سنبھال لیا تھا۔
اور وہ ملازمت کے دھندوں کیساتھ تصنیف تالیف کے مشغلوں میں بھی شبانہ روز
منہمک رہنے لگے تھے۔ چنانچہ دہلی کی تمام پرانی عمارتوں کی ہسٹری اور ان کے کتبوں کے چربے لینے کا
شوق پیدا ہوا۔ اور جب قطب صاحب کی لاٹھ کے حالات لکھنے کی نوبت آئی۔ تو دیکھا۔ کہ وہ لاٹھ کمبخت
اتنی بلند ہے۔ کہ وہاں تک سیڑھی لگا کر بھی پہنچنا ایک امر محال ہے۔ اس لئے سر سید لکھتے ہیں۔ کہ اس کے
متعلق یہ تجویز کی گئی تھی۔ کہ قطب صاحب کی نہایت بلند چوٹی کے کتبے پڑھنے اور انکی نقل لینے کیخاطر ایک چھینکا
دو بلیوں کے درمیان ہر ایک کتبے کی محاذی بندھوا لیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اس چھینکے میں بیٹھ
جاتا تھا۔ پھر وہ چھینکا قطب صاحب کی لاٹھ کے سرے کے ارد گرد چند روز میں گھوم گیا تھا۔ تاکہ وہ تمام عبارت

ہر طرف سے بخوبی نقل ہو جائے۔
یہ چھینکا بتی کے بھاگوں ہرگز ٹوٹا نہیں۔ مولانا صہبائی سرسید کے گاڑھے دوست تھے۔
جب انکو اس چھینکے میں اترتے ہوئے اور بیٹھتے دیکھتے تھے۔ تو حالی کہتا ہے۔ کہ مولانا موصوف مارے خوف کے سہم جاتے تھے۔ اور انکا رنگ لاٹھ کے نیچے کھڑے کھڑے بھی متغیر سا ہو جایا کرتا تھا۔ حالانکہ سکی عمر اسی تھی یہ سرسید کی آئندہ ترقی اور اس کے روز افزوں اقبال کی گویا پہلی سیڑھی تھی۔ کیونکہ اس قسم کی خاص خاص کوششوں سے جب انہوں نے آثار الصنادید کو مرتب کیا۔ تو ہندوستان سے لیکر ولایت تک ان کے نام کے ڈنکے بجنے لگے تاہم ایک بد نہاد شخص کی بے ایمانیوں اور ایام غدر میں اس کتاب کے پہلے اڈیشن کے اکثر نسخے تلف ہو جانے سے سرسید کو اس تصنیف سے کچھ فائدہ ہرگز نہیں پہنچا۔ اور نہ پہنچ ہی سکتا تھا۔ کیونکہ ابتدا میں بڑے بڑے مصنفوں کی اکثر تصنیفات کا عموماً یہی حال ہوا کرتا ہے۔ کہ کچھ بھی پلے نہیں پڑتا

آئینِ اکبری کی تصحیح

سرسید مرحوم بجنور میں منصف تھے۔ تو انکو آئین اکبری کا خیال ایک سوداگر کی بدولت پیدا ہوا وہ کتاب ایک عرصہ سے غلط سلط فارسی زبان میں رائج چلی آتی تھی۔ اسکا کوئی صحیح نسخہ دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ تاریخ کی رو سے یہ ایک قیمتی تصنیف تھی۔ اور اسکی تصحیح بھی بہت ضروری تھی۔ مگر جب سرسید نے اس کام سے فراغت پائی۔ اور میرزا غالب سے اس کے متعلق ایک تقریظ لکھوانے کی استدعا کی۔ تو میرزا صاحب ان دنوں میں سلطنت مغلیہ کے بڑھتے ہوئے زوال اور انگریزوں کے خاص اقبال کے معترف ہو چکے تھے۔ اس معاملہ کی نزاکت کو ہرگز نہ سمجھ سکے۔ اور اس کتاب کی تقریظ میں لکھدیا کہ جو جو آئین یا قوانین انگریزوں سے متحقق ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے آئین اکبری یا قوانین مغلیہ کی اب کیا حقیقت ہے۔ غالب کی تقریظ کے بعض اشعار یہ ہیں۔ ؎

کس[1] محز باشد ہمیتی ایں متاع   خواجہ راچہ بود امید انتفاع

---

[1] کوئی شخص بھی اس متاع کو نہ لیگا۔ اس سے سرسید کو کیا فائدہ۔

گر ز آئین سے رود با ما سخن ۔ چشم بکشا در این دیرِ کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر ۔ شیوہ و انداز اینان را نگر ۔
تا چہ آئینہا پدید آوردہ اند ۔ آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند ۔
زین ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت ۔ سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت ۔

حق این قوم است آئین داشتن
کس نیارد ملک بہ زین داشتن

وہی مثل ہے ۔ کہ من از آسمان دراز ریسمان ۔ سرسید مرزا کی اس تقریظ سے بہت مایوس ہوئے ۔ اور اسکو اپنی کتاب کیساتھ ہرگز شائع نہ کیا ۔

میرزا غالب سے سرسید کا دوسرا معرکہ

تقریظ مذکور کے واقعہ کے کچھ عرصہ بعد میرزا غالب جب نواب یوسف علیخاں والی رامپور کی ملاقات کو ریاست مذکور میں گئے ۔ اور پھر واپس ہوتے ہوئے شہر مراد آباد کی ایک سرائے میں ٹھہرے ۔ تو سرسید بھی بہ سلسلہ ملازمت مراد آباد میں موجود تھے ۔ انکو میرزا کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا ۔ تو فوراً سرائے میں پہنچے ۔ اور میرزا غالب کو معہ اسباب اور ان کے ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آئے ۔ چونکہ مرزا نے سرسید کی کتاب پر ایک ایسی نامناسب تقریظ لکھی تھی اور ان سے بہت جھینپتے تھے ۔ اس لئے انکو پہنچنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی ۔ مگر سرسید کا اخلاق میرزا غالب پر غالب آیا ۔ اور وہ ان کو اپنے گھر لے آئے ۔ تو مرزا نے پالکی سے اترتے ہی اپنی شراب کی بوتل ایک ایسی جگہ رکھدی جہاں سب کی نظر اسپر پڑتی تھی ۔ سرسید کو یہ برا معلوم ہوا ۔ اور اس بوتل کو اٹھا کر علیحدہ کسی کوٹھے نہ خانے میں رکھدیا ۔ جب میرزا نے اس بوتل کو وہاں نہ پایا ۔ تو سخت گھبرایا ۔ یہ دیکھکر سرسید نے ان سے کہا کہ گھبرائیے نہیں ۔ میں نے آپکی چیز کو بہت احتیاط سے ایک جگہ رکھدیا ہے ۔ میرزا نے کہا ۔ کہ میری تسکین نہیں ہوتی ۔ ذرا دکھا دیجئے ۔ سرسید نے انہیں ایک کوٹھڑی میں لیجا کر وہ بوتل حوالے کی ۔ تو میرزا صاحب بوتل کو اٹھا کر مسکرانے لگے ۔ اور اشاروں ہی

اشاروں میں کہنے لگے ۔ کہ بھئی اسمیں کچھ خیانت ضرور ہوئی ہے ۔ سچ بتاؤ کس نے پی اور کتنی پی ہے
جبھی تو یہ اندھیری کوٹھڑی میں لا کر رکھی گئی تھی ۔ حافظ سچ کہتا ہے ۔۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند۔
چوں بخلوت مے روند آں کار دیگر میکنند۔

بیچارے سرسید مرزا کی یہ بہکی بہکی باتیں اور بہتان سنکر کٹے جاتے تھے ۔ مگر خود کردہ را علاجے نیست
ایک شرابی کو گھر میں لانیکا اکثر یہی انجام ہوا کرتا ہے ۔

سرسیّد نیچری کیونکر ہوئے

کچھ تو سائینٹفک سوسائٹی گزٹ کچھ تہذیب الاخلاق میں اپنی غیر متعصبانہ اور آزادانہ تحریروں کی بدولت جو عام مولویوں کے کٹر خیالات سے برعکس ہوتی تھیں ۔ اور زیادہ تر خطبات احمدیہ کی وجہ سے لوگ انکو نیچری کہنے لگے تھے ۔ اور یہ نیچریت کا تلازمہ اسقدر ترقی کر گیا تھا ۔ کہ ہر شخص جو انکا دوست بنتا تھا ۔ عوام اسکو بھی نیچری ہی سمجھا کرتے تھے ۔ چنانچہ نواب محسن الملک ۔ چراغ علی ۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۔ مولوی نذیر احمد اور شبلی وغیرہ جب یکے بعد دیگرے ان کے دائرہ احباب میں شامل ہوئے ۔ تو عام پبلک نے ان سب کو درجہ بدرجہ ایک نیچری مولوی شمار کیا ۔ اور مولوی نذیر احمد کو تو بوجہ ان کی ظریفانہ طبیعت کے نہ صرف نیچری مولوی بلکہ ایک نیچری بھانڈ[1] بھی کہا گیا ۔ اور حقیقت میں وہ اس عجیب و غریب خطاب کے مستحق بھی تھے جنہوں نے اگر ہمارا خیال راستی پر مبنی ہے ۔ تو آپ توبۃ النصوح ۔ بنات النعش ۔ اور ان کے خاص خاص لیکچروں کا مطالعہ کر کے خود بھی اس امر کی تصدیق کریں ۔ کہ آیا وہ نیچرل بھانڈ تھے یا نہیں تھے ۔

سرسید ایک تو اس نازک وقت کے لحاظ سے اور دوسرے اپنی سپاہی پالیسی کی وجہ سے محتاط

---

[1] محرم علی چشتی سابق ایڈیٹر "رفیق ہند" کا مولوی نذیر احمد سے جب تنازعہ ہوا ۔ تو اس نے بار بار انکو نیچرل بھانڈ ہی اپنی تحریروں میں لکھا تھا ۔ ملاحظہ ہو "حیات النذیر"۔

زمانہ شناس واقع ہوئے ہے۔ لہذا ان کی تفسیر نے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کئے مگر عام طور پر سینکڑوں مولوی انکو کافر جاننے لگے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے۔ کہ وہ بھی ایک طرح کے کرسٹان ہیں۔ یا پکے نیچری ہیں۔ اور عیسائیوں کو اس تفسیر سے کچھ اور ہی شبہ گذرا۔ اور مسٹر جان میولیسن آرنلڈ نے جب اس کو پڑھا۔ کہا۔ کہ اگر سر سید کی تفسیر القرآن صحیح ہے۔ اور وہ ان باتوں کے ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کہ عیسائیت اور اسلام میں حقیقتاً کچھ فرق نہیں ہے۔ تو یا تو انجیل صحیح ہے۔ اور قرآن غلط۔ اور اگر قرآن صحیح ہے۔ تو انجیل ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ایک عجیب منطق تھی۔ غرض سر سید کی تفاسیر نے مسلمانوں میں انکو ایک نیچری مولوی مشہور کیا۔ اور سینکڑوں مولویوں کا یہی پیشہ رات دن قرار پایا۔ کہ وہ بیچارے سر سید کو خدا واسطے کی گالیاں ہر وقت نکالتے رہتے تھے۔ اس پر مولانا حالی نے ایک قطعہ لکھا تھا۔ جسکا ایک شعر یہ ہے۔

ع سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے۔[1]

خیر مولویوں نے تو نیچری کا لفظ سر سید یا اُن کے حواریوں کی ذات تک ہی محدود رکھا تھا۔ مگر جب ملک کے بعض منہ پھٹ اور پنچ اخباروں کو اسکی اطلاع ہوئی۔ تو انہوں نے علیگڈھ کالج کا نام تو نیچر گڈھ اور وہاں کے پڑھنے والے طالب علموں کو نیچری پودے لکھنے میں سبقت کی۔ اب نہ معلوم یہ اصلاح کب ہو گی۔ اور نیچریت کا داغ علیگڈھ والوں کے چہرے سے کیونکر اور کس وقت دھویا جائیگا۔ وہ نیچری کالج اب تو نیچری یونیورسٹی ہو گیا۔

چونکہ سر سید اپنی تفسیر اور جملہ مذہبی و اخلاقی مضامین میں عموماً نیچر کا تتبع کیا کرتے تھے۔ اور ہر ایک بات میں نیچر ہی کی تطبیق اپنے اوپر لازمی جانتے تھے۔ نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ وفات سے بعد بھی وہ مولویوں کے طبقے میں ہمیشہ نیچری ہی کہلاتے رہے۔ اور ان شاء اللہ تا قیامت وہ نیچری ہی کہلاتے رہینگے ع

زندہ است نام فرخ سید بہ علم و فضل + گرچہ بسے گذشت کہ او نیچری نماند

سر سید کی اشاعت تعلیم کے متعلق جدوجہد

سب جانتے ہیں۔ کہ علیگڈھ کالج کی بنا سر سید ہی نے رکھی تھی۔ مگر جب انہوں نے عام مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو جاری کرنیکا ارادہ کیا۔ تو قُل اعوذی مولویوں ہی نے نہیں

[1] ملاحظہ ہو دیوان حالی۔ قطعات

بلکہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ اشخاص بھی اُنکی خدا واسطے کی مخالفت کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور خوب آستینیں
چڑھا چڑھا کر انکا مقابلہ کرنے لگے چنانچہ اورینٹل کالج لاہور جو اسوقت انگریزی تعلیم سے مطلقاً کورا تھا
اور بڑے بڑے مہوپادیا۔ منشی۔ مولوی عالم اور فاضل بنانے ہی کی ایک مشین تھا۔ اس کے
حمائتیوں کو بھی سرسید کی وہ تجاویز جو انگریزی تعلیم کے متعلق تھیں سخت ناگوار گذریں۔ اور
ایک صاحب نے پنجابی اخباروں میں سرسید کو انتہا سے زیادہ جلی کٹی سنائیں بھلا سرسید کیسے چپ چاپ
کی بالکی بنے بیٹھے رہتے فوراً جواب دیا۔ اور یوں لکھا کہ سنو بھائیو ہمارے لیئے اب یہی ناگزیر ہے۔ کہ ہم
انگریزی علم و ادب اور یورپین سائنس میں ضرور بالضرور اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کریں۔ اور جہانتک
ہندوستان کی یونیورسٹیاں ہمیں خطاب اور ڈگریاں دے سکتی ہوں۔ وہ سب لیں بلکہ اگر ہم میں کچھ اور ہمت
ہو تو آکسفورڈ اور کیمبرج کی اعلیٰ مدارج تعلیم بھی حاصل کریں۔ اور اپنے تئیں ایک فرسٹ کلاس مہذب
اور اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ جنٹلمین بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ بیشک ہمکو اس امر میں سخت
مشکلات کا سامنا ہوگا۔ چنانچہ ادھر ایک حد درجہ کی جاہل بلکہ اجہل قوم کے تعصب کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔
اور اُدھر ان اینگلو انڈین حضرات کی تنگدلی سے جو مزاحمت پیش آئیگی۔ وہ بھی سب جوں کی توں برداشت
کرنی ہوگی۔ کیونکہ یہ فاتح قوم کے اعضا و جوارح ہماری انگلش لائف۔ ہمارا جدید انگریزی نما تمدن
اور ہمارے جنٹلمینوں کے سے اخلاق یہاں تک کہ ہمارے اس نیم انڈین اور نیم یورپین لباس
سے بھی ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے ناراض ہوتے ہیں۔ کہ ہم کو وہ خون آلود نگاہوں سے
دیکھنے لگتے ہیں۔ گویا ہم بھی ان کے نزدیک کوئی ایسے تازہ مجرم ہیں۔ کہ جنپر ہرگز رحم یا ترس نہیں
کھایا جاتا۔ مگر باوجود ان سب رکاوٹوں اور ہر شخص کے للہ ہمارے رستے میں کانٹے بچھانے کے ہم
کو اپنی اور اپنے اہل ملک کی بھلائی ہی مدنظر رکھنی چاہئے۔ اور خواہ کسی طرح ہو ہمیں آئندہ انگریزی
تعلیم چار دانگ ہندوستان میں پھیلا دینی چاہئے۔ اچھا یہ بھی کوئی تعلیمی ترقی ہے۔ کہ بنارس کالج
نے طلبا کو سنسکرت پڑھانے میں اپنا خون اور پسینہ ایک کردیا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے لکھائے پڑھائے
پادھوں کو ہرگز ان پنڈتوں کے برابر نہ بنا سکا۔ جو ہی آدھی ننگی کمر سے دھوتی باندھے۔ چوٹی لٹکائے
جنیو اوڑھے منگلنکا اور شوالہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھے اپنی اجارہ شدہ سنسکرت زبان کو
تحصیل کرتے تھے۔ ہاں اس موجودہ طریق تعلیم سے بجز اس کے کہ بنارس میں مہارانی گنگا جی

کے کنارے دس پانچ منگتے پنڈت اور زیادہ ہو گئے۔ بھلا اور کیا نفع ہوا۔ اسی طرح زبان عربی یا فارسی کو رٹنے والے (خواہ وہ بلخ اور بدخشاں تک سے لاہور کے مشرقی کالج میں بغرض تعلیم آئے ہوں) مولویوں میں ایک بھی ایسا لایق و فایق نظر آتا ہے۔ جیسے کہ پہلے مسجدوں کے چبوتروں اور ہماری خانقاہوں کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور لوگوں کی فاتحہ اور درود کی روٹیوں پر گذران کر کے پڑھنے والوں کی لیاقت ہوا کرتی تھی۔ بقول شخصے ؎

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا۔

بھائیو وہ جو لاہور یونیورسٹی کالج نے اپنے مولویوں اور منشیوں میں خاص علم فضیلت پیدا کیا ہے۔ آخر وہ کس کام آیا سوائے اس کے کہ وہ لوگ کچھ تو مسجدوں کے مجاور بن گئے۔ اور جو باقی رہے۔ مُردوں کی روٹیاں کھا کر گذارہ کرنے لگے۔ بلکہ یہ پریفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی سننے کو تو بڑے بڑے خطاب ہیں۔ مگر اونچی دوکان اور پھیکا پکوان۔ یہ ڈگریاں آخر کس کے گھر کی ترقی کرینگی۔ یہ ہیں کس مرض کی دوا۔ اچھا ان سے ملک و قوم کو اِرا وغیرہ یا نتھو خیرا کو فائدہ کیا۔ کیا اس سے ہماری دولت میں حشمت میں تجارت میں اخلاق میں روشن ضمیری میں کچھ وسعت ہوئی ہے۔ ہرگز نہیں تو پھر زر دادن و دردِ سر خریدن اور کس جانور کا نام ہو سکتا ہے۔ لہذا ہم کو چاہئے کہ ان مردہ مشرقی یونیورسٹیوں اور گئے گذرے مشرقی علوم کی طرف بھولے سے بھی متوجہ نہ ہوں۔ کیونکہ ان دقیانوسی کرم خوردہ تجاویز سے ہمارے لئے۔ ہمارے ملک کیلئے قوم کیلئے۔ گورنمنٹ کوئی بہتری یا بھلائی کی صورت ہرگز نہیں ہو سکتی یہ ہم اسقدر اپنا سر قوم کا سر کھا کر لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ کہ اُن کا واحد مقصد آئندہ مغربی علوم و فنون کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا۔ اور سرکار عالیہ سے یہ خاص طور پر عرض و معروض کرنا چاہئے۔ کہ وہ حتی الوسع ہماری امداد کو تعلیم مغربی دلانے اور اہل یورپ کی حکمتوں کو ہندوستان میں بھی فی الفور رائج ہو جانے دے۔ آمین۔ آمین۔ ثم آمین

سر سید مرحوم کے یہ قیمتی جذبات جو مغربی تعلیم کے متعلق ان کے دل میں۔ دماغ میں سر میں طبیعت میں ذرہ ذرہ حلول کر گئے تھے۔ وہ بلاشک اُس زمانے کے لحاظ سے گویا ایسے اچھوتے خیالات تھے۔ جو کسی کو اُس سے پیشتر کبھی سوجھے ہی نہیں تھے۔ تاہم انکو پورا پورا الیقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ سب سے بڑا ریفارمر یعنی زمانہ نبی عوام کو تعلیم کی طرف کشاں کشاں اور اس نئی روشنی۔ اور

جدید تہذیب کیطرف لے آرہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے صاف کہدیا کہ اگر گورنمنٹ نے ہمارے ان پختہ ارادوں
میں کچھ بھی حیل و حجت سے کام لیا۔ تو ہمارا استقلال۔ استقلال۔ استقلال۔ ہمت ہمت ہمت۔ کوشش۔
کوشش۔ کوشش۔ گورنمنٹ کی کسی خاص پالیسی کی ہمیں کچھ پرواہ نہیں کرنے دینگی۔ اور ہم خود اپنے
لئے ہر طرح کی ہائر انگلش ایجوکیشن کے وسائل حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کرینگے۔ اور اگر ہم میں
سیلف ریسپکٹ کا کچھ بھی اثر باقی ہے۔ تو گورنمنٹ کو دکھا دینگے۔ کہ بلا ریب گورنمنٹ کو ہم لوگوں کی
جان اور مال پر پورا پورا اختیار ہے۔ مگر ہماری رگ حمیت اور رائے پر ہرگز وہ کوئی جبر نہیں کر سکتی۔
دراصل سرسیّد کی تمام عمر کا سب سے بڑا کارنامہ یہی انگریزی تعلیم کا پھیلانا۔ اور مسلمانوں کی ایسی
قدامت پسند اور جاہل قوم میں اسکا رائج کرنا تھا۔ جسمیں وہ خود اپنی زندگی ہی میں بہت کامیاب
ہوئے۔ کہ انکا بائیوگرافر خاص مولوی حالی لکھتا ہے۔ کہ اگرچہ تعلیم و تعلیم کی ایسی تحریک بظاہر مشکل
روکھی پھیکی تھی۔ مگر اسکو چند سال کے عرصہ ہی میں سرسیّد نے اتنا چٹپٹا بنا دیا۔ کہ وہی مسلمان
جو ان باتوں سے کوسوں بھاگتے تھے۔ پانچ پانسو اور ہزار ہزار روپیہ کے خرچ کثیر برداشت کر کے
سرسیّد کی ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہونے لگے۔ اور ایسے چاؤ امنگ اور خواہش کیساتھ
کہ جیسے کوئی پھولوالوں کی سیر دیکھنے یا خواجہ اجمیری کے عرس کو اپنے گھر سے پیدل کھڑا ہوتا ہے جیسے
از حد ذوق و شوق میں لوگ شہر لاہور سے شالامار کے میلے کیطرف بڑی مسافت طے کر کے
چلے آتے ہیں۔ اور کئی کئی دنوں تک یہ تماشہ دیکھتے رہتے ہیں؟

سرسیّد کی خاص خاص ابتدائی تصنیفات و تالیفات

وہ جب دہلی کے منصف تھے۔ تو قلم انکا بیکار نہیں رہ سکتا
تھا۔ یعنی کہنے والوں نے کہا ہے۔ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ آپ نے
پہلے فوائد الافکار فی اعمال الفرجار جو فارسی میں ان کے نانا
نواب دبیر الدولہ نے پرکار تناسب کے اعمال پر لکھی تھی۔ اس کو
اردو لباس پہنایا۔ پھر قول متین در ابطال حرکت زمین ایک مختصر رسالہ کو ترتیب دیا۔ مگر بعد کو آپ نے
اس مولویانہ خیال کی اصلاح فرمائی۔ کہ زمین ضرور گھومتی ہے۔ اور لکھنؤ کے قریب دریائے گھومتی
کیطرح تحرک کرتی رہتی ہے یعنی ساکن نہیں رہتا ہے۔ بلکہ ہمیشہ ایک لٹو کی مانند گھوما کرتی ہے واللہ اعلم۔
"کلمۃ الحق" ۱۲۶۹ھ میں پیری مریدی کی برکتوں اور ایسے ہی لوگوں کی حرکتوں کے خلاف لکھا۔

مگر تعجب ہے۔ کہ وہ خود تمام عمر پیر غلام علی شاہ اور اُن کے خاندان کے معتقد رہے۔ ۱۸۵۰ء میں وہابیت کا ہندوستان میں ایسا شور اُٹھا تھا۔ جیسے آجکل مسئلہ خلافت کا۔ اب سرسید نے وہ کام کیا۔ جو اسی زمانے میں ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر صاحب کے خاص ہنٹر یعنی رسالہ "وہابی ازم" سے ظہور پذیر ہوا یعنی اس کے متعلق سرسید نے "رسالہ ردِّ بدعت" شایع کیا۔ جسمیں اتباعِ سنت کی تاکید کی۔ اور وہابیت کی تردید ...... لیکن ہندوستان میں وہابیت کا اسوقت اتنا اثر ہوا تھا۔ کہ لوگ کچھ تو سرکار کے برخلاف ہوگئے تھے۔ اور کچھ روزمرہ رسم و رواج کی قیدیں توڑنے لگے تھے۔ اگر آجکل کے ایسے اسلامی لیڈر ہوتے۔ تو شاید سرسید کی سخت مخالفت کرتے۔ مگر اسوقت کسی کو کانوں کان یہ خبر بھی نہ ہوئی۔ کہ سرکار والا مدار اور دلی کے منصف صاحب میں کیا کچھ پرائیویٹ گفت و شنید ہوئی۔ جو رسالہ "کلمۃ الحق" کی تصنیف کا موجب ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے "نمیقہ در بیان مسئلہ تصورِ شیخ" قلمبند کیا۔ جسمیں طریقہ نقشبندیہ کے ہمیشہ پیرو رہنے اور اس کو وسیلہ محبتِ خدا اور رسول قرار دینے میں سبقت کی۔ یعنی ایک طرف تو سرسید مسلمانوں کو کٹر توحید و نیچر پرست بننے اور فقرا کی متابعت سے انحراف برتنے کی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اور دوسری طرف خود وہی کچھ کرتے تھے۔ جس کے مانع آتے تھے۔ مگر یہ فقرائی فیضان (بیعتِ نقشبندیہ) ایک خاص نقش تھا۔ جو اوائل عمر ہی سے ان کے دل پر بٹھا دیا گیا تھا۔ بعلاوہ اس کے انکار ہی کیسے کر سکتے تھے۔ سرسید کا چھٹا رسالہ سلسلۃ الملوک مرقومہ ۱۸۵۲ء ہے جسکو راقم اوراق نے بھی دیکھا ہے۔ یہ ایک فہرست اُن ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کی ہے۔ جو پانچہزار سال تک ہندوستان پر نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے تھے۔ اس میں ہندوؤں کے یدھشٹر مہاراج سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور ہندوستان و ولایت کی ملکہ مشفقہ کوئین وکٹوریہ پر کتاب کا خاتمہ ہوا ہے۔ ۱۸۵۳ء میں کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ کیا۔ ان سب ابتدائی تالیفات سے سرسید کا میلانِ طبع مذہب، سیاست، قومی اصلاح اور تاریخ کیطرف صاف طور سے پایا جاتا ہے۔ لہذا ایک قومی لیڈر یا ریفارمر کی تعلیم ہمیشہ انہی مضامین پر مبنی ہوا کرتی ہے جو ہم نے کہا ہے بعض جوشیلے لسان۔ اور شوخ لڑکوں کو پڑھوا دینے چاہئیں۔ جو وہ انہیں کچھ دلچسپی لینے لگیں۔ تو یہ سمجھو کہ گویا عمر ہی کو آپ نے کوک دیا ہے۔ اب وہ خود بخود ہمیشہ چلتی رہیگی۔ سادہ اور نوجوان کو قومی ریفارمر ہونا لازمی امر ہے۔

سر سید مرحوم کی شاعری

وہ رنگین صحبتیں جنکا لطف سر سید اپنی جوانی میں عموماً اٹھا چکے تھے - انہیں راگ رنگ کا ہونا - تو ایک لازمی امر تھا - لہذا شعر و شاعری کی چیٹک دل و دماغ پر اکثر اسطرح لگا کرتی ہے - کہ ایک عشقیہ غزل کا کوئی چبھتا ہوا شعر مثلاً ؎ آیا کرو ادھر بھی میری جان کبھی کبھی ٭ نکلیں ہمارے دل کے بھی ارمان کبھی کبھی ٭ انسان کسی وقت سُن پاتا ہے - تو فی الفور طبیعت اس کی نقالی پر مائل ہو جاتی ہے - انجام یہ ہوتا ہے - کہ اپنا آدھا شعر خود ہی کچھ ایسا جی کو بھلا لگتا ہے - کہ ہم اناپ شناپ شعر پہ شعر کہتے جاتے ہیں - اور آپ ہی آپ اُس کے مزے لئے جاتے ہیں - اگر اسوقت ہمکو کوئی دوست بھی ہمطبع ہم مذاق مل جائے - تو پھر ہمارے شاعر بننے میں کوئی کسر ہی باقی نہیں رہتی - یہی واقعات سر سید مرحوم کو پیش آئے - بلکہ شعر و اشعار سے بوجہ طبیعت کی رنگینی کے ایک قدرتی لگاؤ ہوتا تھا - اسپر صحبت بھی ایسے لوگوں کی پائی گئی جو گویا فنا فی الشعر تھے یعنی مولانا صہبائی - آزردہ - اور غالب وغیرہ - آپ شاعر ہوئے - اور ایسے ہوئے - کہ کچھ فارسی اور کچھ اردو - اشعار فی الفور کہہ ڈالے - مگر ان میں سے صرف دو ایک فارسی شعر اور بالعموم یہ اردو شعر ہی اب تک ان کے نام سے منسوب ہے ؎

ہزار حیف کہ عمر اپنی مفت صرف ہوئی ٭ نہ کچھ خدا کی عبادت کی نے بتوں کی چاہ کی

نقادانِ سخن کے نزدیک یہ شعر بلحاظ کمال شاعری وہی حیثیت رکھتا ہے - جو اِس فارسی شعر کی ہے -

؎ دندانِ تو جملہ در دہان اند ٭ چشمانِ تو زیرِ ابرو انند ٭

البتہ انکی ذات کیساتھ اہل قلم نے نہ صرف نثر میں بلکہ نظم میں بھی اکثر شوخیاں کی ہیں - چنانچہ کسی نے ان کے ہجو میں اور کسی نے ان کی تعریف میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا ہے - یا اُن کے خیالات اور اصلاح وغیرہ کی نسبت نہایت مضحک کلام تصنیف کئے ہیں - مثلاً مولانا حالی کہ رونے اور بسورنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے تھے - مرحوم سر سید کے متعلق وہ بھی دو ایک جگہ شگفتہ خاطر پائے گئے ہیں - اسی لئے آپ فرماتے ہیں - ؎

وہ محوِ تماشائے نیرنگِ قدرت

وہ ہنگامہ آرائے تزویرِ دنیا — وہ اندازہ فرمائے تدبیرِ دنیا
وہ تسخیر اندازِ تسخیرِ دنیا — وہ سرتاقدم نقش تصویرِ دنیا

وہ سرگشتۂ نفسِ امّارہ یعنی
پرستارِ دنیائے مکّارہ یعنی

عجیب السجایا بدیع الخصائل — غریب المزایا شنیع السمائل
مضل البرایا محد الرزائل — محل الرزایا محد القلائل

ہے اک تازہ فرقہ ہوا خواہ جن کا
لقب خاص ہے فطرت اللہ جن کا

اصولِ شرائع کے ابطال والے — فضولِ مذاہب کے اہمال والے
زر و دولت و جاہ اقبال والے — بڑے دھوم کے والے بڑی چال والے

نئی روشنی کے دکھا دینے والے
چراغ ہدیٰ کے بجھا دینے والے

کہوں کیا وہ کیسے ہیں کیا ہیں کدھر ہیں — بڑے نامور ہیں بڑے معتبر ہیں۔
ابو الجان کے خاص صلبی پسر ہیں — وجودِ پدر سے مگر بے خبر ہیں۔

ولایت میں سب ہے لنڈنی اُن کی بولی
تو ہندوستاں میں وہی خاص کولی[1]

کہیں مودۃ الدولہ سے ہیں ملقب — کہیں معرفت جنگ سے ہیں مخاطب
بلا کے عقیل اور غضب کے مہذب — رئیسوں کے اور حاکموں کے مقرب

یہ تمغے سے ان کی ہے عزت فزائی
کہ لاکھوں دئے جاتے ہیں ایس آئی۔

نسب میں تو فخرِ اب و عم و جد ہیں۔ — حسب میں بڑے آپ اہلِ خرد ہیں

[1] کولی یعنی کونسل کی یا علیگڑھ سے مخصوص۔

بڑے معتبر ہیں بڑے معتمد ہیں　　غرض ان کے اوصاف بیحد و عد ہیں
یہ ہیں سحر اقبال کے بے بہا در
ملا ہے خطاب ان کو خان بہادر

بنائے مدرسۃ العلوم علیگڈھ

بنا مدرسے کی جو یاروں نے ڈالی　　نئی راہ چندے کی پہلے نکالی
لگا بننے پھر ایک ایوان عالی　　جسے دیکھ کر کعبہ کہتے ہیں حالی
کہ بانی بنی دست از حق بشوئید
قلندر چوں گوید ہمہ دیدہ گوید

بشارت ہو اے امتیانِ نیچیرہ　　علیگڈھ میں ہوتا ہے اب حج اکبر
یہ حج ہے کہیں حج لندن سے بہتر　　کہ ہے مدرسہ کعبہ اور اس کے در پر
کسی کا دلِ پاک ہے سنگ اسود
بڑھو کہہ کے لبیک یا سید احمد

یہ والاگہر سید خاندانی　　ہیں اس کعبۂ نیچریت کے بانی
عرب میں جو ہے کعبۂ باستانی　　وہ حضرت کے دادا کی ہے کاروانی
یہ جو مدرسہ کول میں بن رہا ہے
وہ کعبہ بنایا ہوا آپ کا ہے

یہی دینِ نیچیر کے ہیں خاص مرسل　　یہ نیچیر انہی کا ہے وحی منزل
یہی جانتے ہیں کتابِ مفصل　　انہی پر کھلا ہے ہر اک رازِ مجمل
عیاں ہیں نبوت کے مصداق ان کے
صحیفے ہیں تہذیبِ اخلاق ان کے

کھلے ان صحیفوں سے اسرارِ مذہب　　کہ حل ہو گئیں دین کی مشکلیں سب
نکالے گئے ٹھیٹھ اسلام کے ڈھب　　مسلمان ہونے لگے کچھ مہذب

یہ ہے ان صحیفوں کی اصل مقرر
کہ ہے نیچر اسلام اسلام نیچر

یہ ٹھہرا ہے ایمان کا رکن اول — کہ نیچر ہے دنیا کے دینوں سے افضل
خلیل ایک تھے نیچری مکمل — اور ان سے ہی تھے نیچری سارے مرسل

اور اس سے ہی کیا حصر نیچر گری ہے
خدا ایک یکا چھٹا نیچری ہے

نبوت کہاں اور کہاں نیچری پن — نبی اصطفیٰ ٹھہرے اور فلسفی پن
اور اس سے زیادہ یہ کفر تبرا بن — کہ ہے خاک شان در دہن خون جگر بن

خدا کو بھی نیچر میں دیتے ہیں جکڑ دے
رسول انکو سمجھے خدا انکو پکڑ لے

یہ ہے نیچریت کا قول مقرر — کہ اسلام کا نام اصلی ہے نیچر
اور اسلام والے بھی باہم برادر — خدا نیچری ٹھہرے اللہ اکبر

تو اب نیچریوں کی اچھی بن آئی
کہ ٹھہرے خدا کے دو عالم کے بھائی

یہ باتیں انہوں نے نئی ہیں نکالی — نئی مشکلیں ہیں شریعت نے ڈالی
نیچ ہے ان کی کچھ ملت ہے نرالی — غرض تیرہ تکلف ہیں سارے خیالی

نہ تاویل میں کچھ نہ تفسیر میں کچھ
نہ تبدیل میں کچھ نہ تغییر میں کچھ

کلامی بنا فلسفہ کر کے قائم — جماتے ہیں ارکان دین کے دعائم
لگاتے ہیں کیا کیا خیالی ضمائم — اٹھاتے ہیں کیا کیا قیاسی قوائم

دلائل پہ رکھتے ہیں بنیاد ملت
شریعت کو کرتے ہیں محتاج ملت

کہیں اشعریہ کی ہے موشگافی — کہیں ماتریدیہ کی ژند بافی

نہ قرآن کافی نہ اخبار کافی تو — اگر معتقد ہے تو رائے خلافی تو

خیالات سے پڑ رہے ہیں بکھیڑے
مقالات کے چل رہے ہیں دریڑے

نہ ہو پنجگانہ تو ہے کیا قباحت — مقدم ہے انسان کو اپنی راحت
نہ قرآن میں پانچ کی ہے صراحت — نہ اسلام میں ممتنع ہے اباحت

غرض گنڈے دار ایک دو جیسی تیسی
ادا ہو تو اس میں خطا کیا ہے ایسی

زکوٰۃ معیّن کہ فرض خدا ہے — وہ قرآں میں جس پہ حق کی بنا ہے
ہماری جگہ ذکر اسکا ہوا ہے — ادا ہو نہ ہو نام اک ٹیکس کا ہے

مگر کول کے مدرسے کا وہ چندہ
نہ دے تو مواخذ ہے اک ایک بندہ

گیا پھر نئی رائے تشریعی حج تو — کہ کعبہ کو جانا ہے رسم مروّج
ولایت کی گلگشت ہے کام کا حج — ترقی و تہذیب کے صاف منہج تو

وہیں سے ہے تہذیب اخلاق حاصل
وہیں ہیں کمالات آفاق حاصل

نیچری جہاد کیا ہے

جہاد و غزا کی جو تھی تیغ رانی — وہ تھی بدو اسلام کی کارروائی
مگر اب تو یہ مصلحت ہے زمانی — کہ ہو صرف تیغ زبان کو روانی

یہی تو ہے جس کو یہ ہو استقامت
کہ تا مِن الیٰ حِین یوم القیامت

وحی و الہام کے بارے میں نیچر کی رائے

بتاؤں تمہیں وحی و الہام کیا ہیں — تنزل کے دعوے نرے ادعا ہیں
یہ سب فطرت عام کے اقتضا ہیں — ہر اک آدمی کے طبعی قویٰ ہیں
کسی میں ہیں کم اور کسی میں زیادہ
مگر مادہ سب میں ہے یہ بے ارادہ
ہوا فیصلہ وحی و الہام کا جب — ہوا حق ادا حق کے احکام کا جب
اٹھا تفرقہ خاص اور عام کا جب — مٹا حرف اسلام کے نام کا جب
تو بس اب نہ کوئی نبی ہے نہ مرسل
فقط نیچری پن ہے وحی منزل

سرسید مرحوم کے خاص خاص حواریوں کی شان میں

بڑے کام کے پہلے دو تھے حواری — کہ کرتے تھے احکام تشریع جاری
انہی کو تھی تہذیب کی پائیگاری — انہی سے تھی نیچر کی خدمت گذاری
چراغ[1] ان کی تحقیق کے ٹمٹمانے
تو آئینۂ مہدویت[2] دکھانے

منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم پروفیسر

دو ملکان میں اوہام عقلی کے داعی[3] — کہ ہیں نام کے آفتاب الٰہی

۱؎ مراد چراغ علی اور مولوی مہدی ۳؎ دانا

ریاضی و راضی کے ماہر ہیں سارے | تواریخ کے ماہر بے تناہی
عروج خیالات میں سب سے اونچے
ہر اک طور کی قید مذہب سے اونچے

خداوند عالم کو اَبُ کہنے والے | نبی کو حکیم عرب کہنے والے
شرایع کو دنیا کے ڈھب کہنے والے | عقاید کو قومی ادب کہنے والے
عقیدے ہیں پورے معقولے پہ پکے
کہ ہیں برزخ و حشر قومی ڈھکوسلے

خیالات ان کے مضامین ان کے | مقالات ان کے براہین ان کے
سیاسیات ان کے قوانین ان کے | غرض دین میں جب فرامین ان کے
انہیں سے ہے تحقیق انواع مذہب
انہیں سے ہے قانون فطرت مرتب

خطاب بہ مولانا حالی

وہ ہیں دوسرے صاحب طبع عالی | فن نظم میں ہم صفیر زلالی[2]
بہت کچھ ہے جن کا عروج خیالی | ہر اک قال کے راز ہیں جن پہ حالی
یہ کچھ لطف گفتار ہے کام ان کا
کہ مجموعۂ[3] لطف ہے نام ان کا

اگر آپ ہیں ناظم ملک نیچر | سخن آپ لکھتے ہیں دفتر کے دفتر
صفائے بیاں کا یہ بدلا ہے پیکر | کہ ہر شعر ہے آپ کا موج گوہر
نئی ٹھیٹھ اردو کی یہ شد و مد ہے
کہ بھاشا کے الفاظ لانے میں کد ہے

---

[1] باپ۔ [2] ایک شاعر کا تخلص۔ [3] یعنی الطاف حسین حالی۔

سخن میں نیا ڈھنگ ہے خوب اور عجب ہے — طبیعت میں ایجاد طرزِ عجب ہے
کلام آپکا جو ہے سو منتخب ہے — مدوجزر اسلام لیکن غضب ہے

مدوجزر اسلام یعنی مسدس
مسدس کہو یا کتابِ مقدس

بہت شور ہے اہل نیچر میں اس کا — فصاحت بلاغت کے ہوتے ہیں غوغا
لگایا ہے نیچر کے مرسل نے فتوی — کہ یہ نظم ہے سارے عالم میں یکتا

نہیں مثل کا اس کے امکان ہرگز
یہ اک وحی نیچر میں ہے نظم معجز

بڑے ناز سے اس کے اشعار پڑھکر — سنا ہے کہ فرماتے تھے پیر نیچر
اگر مجھ سے پوچھا گیا روزِ محشر — عمل کون سا لائے ہو سب سے بہتر

تو حاضر کروں گا یہی نظم حالی
یہے ہدیۂ حضرت لایزالی

ذرا آپ سے کوئی پوچھے کہ حضرت — قیامت کے ہونے پہ قائل فطرت
نہیں مانتے کوئی دعوی و حجت — بھلا آپکو کیا ہے محشر سے نسبت

کہ یہ اعتقاد اہل اسلام کا ہے
نہ قانون نیچر کے احکام کا ہے

غرض سرسید کو مولوی تسلیم الدین نے پیٹ بھر کر اس مسدس میں کوسا ہے۔ اور اُن کے اکثر حواریوں کو بھی ان کے ساتھ ہی لے ڈالا ہے۔ لیکن نہ معلوم آپ حالی سے کیسے راضی ہو گئے۔ کہ اس واقعہ کے بعد حضرت تسلیم نے مولانا موصوف کی تعریف میں کچھ لکھ کر بھیجا اور جناب حالی نے اس رباعی میں اسکا اعتراف کیا ہے۔ جب کہ شعر و شاعری کے مشغلے سے بوجہ امراض آپ سبکدوش ہو چکے تھے۔

جوشِ خُم بادہ جام خالی میں ہوا — پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
تسلیم نے دی اس طرح کچھ دادِ سخن — شک مجھکو بھی اپنی بے کمالی میں ہوا

جن دنوں سر سید کی تمام اطراف ہندوستان میں یوں مخالفت ہو رہی تھی۔ اودھ پنچ۔ اور بعض اور ظریف اخبار تو گویا یہ فیشن ہی اختیار کر چکے تھے۔ کہ نیچر گڈھ (علیگڈھ کالج) اور اُس کے بانی پیرِ نیچر اور ان نیچری پودوں کو جو اس کالج میں اُسوقت پڑھتے تھے۔ جی بھر کے ہدفِ ظرافت بناتے تھے اس خصوص میں حضرتِ اکبر نے خاص طور سے حصہ لیا۔ کیونکہ ان دنوں وہ بھی اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں تھے۔ اور نیچروں کیلئے تو ایسے مضامین جن میں کسی بزرگ قوم کو ناٹا جائے۔ مغتنم ہوا کرتے ہیں۔ پس اس تعلق سے سید اکبر کی نیچرل شاعری اور ان کے بعض نیچرل مضامین انتخاب ہو کر یہاں قلمبند کئے جاتے ہیں۔ بغور ملاحظہ ہوں ؎

پردے کا گیا ہے خود اڑنگا پیدا | خود ہم نے کیا آزار اور انگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے | نیچر نے کیا ہے ہمکو ننگا پیدا

دیکھ کاریگری حضرتِ سید اے شیخ | دیکھئے لوح وہ مذہب میں کمائی کیطرح
بحرِ ہستی کا یہی دور چلا جاتا ہے | برف کیطرح جمے بہہ گئے پانی کیطرح

نیچریت چیست از دیں گم شدن | نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

مولانا روم فرماتے ہیں

چیست دنیا از خدا غافل شدن | نے قماش و نقرہ و فرزند و زن ؎

ظاہر میں اگرچہ راز سربستہ ہے | مضمون لطیف و خوب و برجستہ ہے
بودہ نہیں پھول کا علیگڈھ کالج | گلداں میں مسلمانوں کا گلدستہ ہے

مسلمانوں نے کالج کی بُری کیا راہ پکڑی ہے | رہی تو اِک ٹھکانہ ہے وہی اللہ کی لکڑی ہے

فیض کالج سے جوانی رہ گئی بالائے طاق | امتحانِ پیشِ نظر اور عاشقی بالا طاق

وہ چراغوں سے ہیں جلتے ایسے ہیں روشن ضمیر
کہتے ہیں رکھیے پرانی روشنی بالائے طاق

یہی فتوا ہے نیچر ہے۔ کہ ہم بھی ہوں سریں انکے
زر انکا زور انکا علم انکا سلطنت انکی

پیچ مذہب کا کسی صاحب نے ڈھیلا کر دیا
سادہ طبعوں کو بھی بالآخر رنگیلا کر دیا

شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا
وہ مثل ہے مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا

واہ رے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا

قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا
ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا۔
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

ہر قدم انکا شہیدِ لغزشِ مستانہ تھا۔
سر میں تھا سید کے قرآں زیرِ پا میخانہ تھا

حاضر ہوا میں خدمتِ سید میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات

بولے کہ تجھکو دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

ڈیلیگیٹوں نے جو شملہ میں بہم کی ہے صلاح
بعد عمدہ کھانے کے ایسی ہی تو کاریں ہیں مباح

سنٹرل بھی ہو کمیٹی اور پراونشل بھی ہو
حامیِ پبلک بھی ہو رخ جانبِ کونسل بھی ہو

بابوؤں کیطرح لیکن غل ہے کچھ مطلب نہ ہو
کر دیں بس توضیحِ جز و کل ہے کچھ مطلب نہ ہو

ولولے ایسے نہیں محتاج کچھ تشریح کے۔
کیوں نہ ہو دانے تو ہیں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے

گنڈے اب قومی گلے کا ہار ہو جائیں گے یہ
پالسی کے طرۂ دستار ہو جائیں گے یہ

بحثِ ملکی میں تو پڑنا ہے نری دیوانگی
پالسی انکی رہے قائم ہماری دل لگی

ہم یہ کہتے ہیں کرو جو استخارہ راہ دے — تم فقط پتلے بنا سکتے ہو جان اللہ دے

عقلِ سید بود از انوارِ حکمت یافتہ — زورِ بازوئش عدو را انجبار نافتہ
مشکلے در پیش ہست او را اگر گو ہم نبی — زانبیا ہرگز کسے نگذشت پیشین یافتہ

اعزازِ نسب کے مٹتے جاتے ہیں نشاں — اگلے سے خیال ہند میں اب وہ کہاں
سید بننا ہو تو بنو سر سید — ہونا ہو خان تو ہو انگریزی خواں

تعجب سے کہنے لگے بابو صاحب — گورنمنٹ سید پہ کیوں مہرباں ہے
اسے کیوں ہوئی اس قدر کامیابی — کہ ہر بزم میں بس یہی داستاں ہے
کبھی لاٹ صاحب ہیں مہمان ان کے — کبھی لاٹ صاحب کا وہ میہماں ہے
نہیں ہے ہمارے برابر وہ ہرگز — دیا ہم نے ہر صیغے کا امتحاں ہے
وہ انگریزی سے کچھ بھی واقف نہیں ہے — یہاں جتنی انگلش ہے سب برزباں ہے
کہا ہنس کے اکبر نے اے بابو صاحب — سنو مجھ سے جو رمز اس میں نہاں ہے
نہیں ہے تمہیں کچھ بھی سید سے نسبت — تم انگریزی داں ہو وہ انگریز داں ہے

سید سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا — چرچا ہے جا بجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا — دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج — کچھ ڈر نہیں جنابِ رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر — بندہ بنا دیا ہے تجھے حبِ جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج — راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر — کیا جانئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر — گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا

وہ آب و تاب شوکتِ ایوانِ خسروی ۔۔۔ وہ حکموں کی شان وہ جلوا سپاہ کا
آئے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی ۔۔۔ جس سے مجلّی ہے نورِ رخِ مہر و ماہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپکی ۔۔۔ کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا
نوخیز دلفریب گل اندام نازنین ۔۔۔ عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رکئے اگر تو ہنسکے کہئے اک بیت حسب میں ۔۔۔ ویل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا
اسوقت قبلۂ عجب کے کروں آپکو سلام ۔۔۔ پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون کوٹ بنگلہ و بسکٹ کی دھن بندھے ۔۔۔ سودا جناب کو بھی ہو ہٹ کی کلاہ کا
ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب ۔۔۔ سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

اکبر کا ایک مشہور قطعہ ہے ۔

وفات سر سید

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا ۔۔۔ نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنیوالے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہی کہتا ہوں اے اکبر ۔۔۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں

سرچشمۂ نیچر

اِن نظموں میں جو اُوپر درج ہوئیں ۔ سر سید کے نیچری پن کیطرف اکثر اشارہ کیا گیا ہے لیکن انکا ایک خاص خط بھی اسی مضمون کے متعلق موجود ہے ۔ لہذا اس کا مطالعہ بھی مسرت سے خالی نہیں وہ سنہ ۱۲۸۹ ہجری میں سید مہدی علیخاں کو لکھتے ہیں ۔ پیارے مہدی ۔ آپ جانتے ہیں ۔ نبی آخر الزماں کو امی محض رکھنے میں کیا مصلحت تھی ؟ اسمیں بھی حکمت تھی ۔ کہ نیچر لیعنی جو اندرونی چشموں کا جاری رہتا ہے ۔ اسکی کوئی بیرونی چیز مزاحم نہ ہو ۔ اور جو کچھ باہر نکلے خالص بے میل ہو ۔ پس ہمیشہ نیچر کے سرچشمہ کے جاری رکھنے کیطرف متوجہ رہا کریں ۔ اور العلم حجاب الاکبر اس کا کچھ خیال نہ کریں ۔ اس سے ظاہر ہے ۔ کہ سر سید کو نیچری کہنا ۔ گویا انہیں کے ایک قول کی تائید کرنا ہے ؟

سرسید کے خاص اہلِ خاندان۔

آپ کی والدہ اور دایہ اور آپ کے ننھیال وغیرہ کا کچھ مجمل حال تو پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ اب ان کے ددھیال اور آبائی خاندان میں سے صرف اُن کی ایک بہن صفیۃ النساء بیگم اور ان کے ایک بھائی سید محمد خاں کے متعلق ہمیں کچھ باتیں یاد آئی ہیں جو لکھنے سے رہ گئی تھیں۔ انکی ہمشیرہ موصوف خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ قریب نوّے برس کی عمر پاکر ایک ایسے موقع پر واصل بحق ہوئیں تھیں جبکہ ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ خوب زور روں پہ تھا۔ اور سرسید اسکی کارگذاریوں میں منہمک تھے۔ مرحومہ ضروریاتِ دین سے عموماً باخبر اور حدیث کی عربی کتابیں معترجمہ بخوبی سمجھنے کے قابل تھیں۔ اسی طرح ان کے بھائی سید محمد خاں نے گو معمولی تعلیم پائی تھی۔ مگر نہایت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ وہ بھی سرسید کی طرح شاہ غلام علی صاحب کے پکے مرید تھے۔ لیکن وضع قطع نہایت آزادانہ رکھتے تھے۔ ڈاڑھی منڈوایا کرتے تھے۔ اور میرانیس کے دادا میر ضاحک کیطرح راہ چلتے سے الجھتے اور ہنسی دل لگی میں بسر کیا کرتے تھے لیکن آخر کار سرسید کیطرح نوجوانی کے ڈھلتے ہی وہ بھی تائب ہو گئے تھے۔ اور اُن کا وہ جوش و خروش سب جاتا رہا تھا۔ بلکہ رسوم مذہبی کے وہ اسقدر پابند ہو گئے تھے کہ تہجد اور اشراق تک بھی قضا نہ ہونے پاتی تھی۔ چونکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے۔ دسہرے کی تعطیلوں میں دلی آئے۔ شہر دلی میں ملیریا بخار اکثر وبا کیطرح پھیلا کرتا ہے۔ اسی سے دلی کے ہزاروں حکیموں اور نیم حکیموں کی روٹی چلتی ہے۔ اُن کو بھی سخت بخار چڑھا۔ اس سے یہ وہم ان کے دل میں بھی اُٹھا کہ اب ہماری خیر نہیں۔ موت آیا ہی چاہتی ہے۔ انکو سرسید نے بہت سمجھایا۔ مگر ؎

بدگماں وہم کا دارو نہیں لقمان کے پاس

اُن کی طبیعت بیچ بیچ ہر لحظہ زیادہ بگڑنے لگی۔ اور ان کو اپنے مرنے کا پورا پورا الیقین ہو گیا۔ پس بخار ہی میں اُٹھے۔ اِدھر اُدھر چل پھر کر دیکھا۔ باقی باللہ کی درگاہ تک افتاں و خیزاں پہنچے۔ وہاں اپنی قبر کیلئے زمین ڈھونڈنے لگے۔ پھر باوجود اپنے حیات ہونے کے قبر کے کھدوائے جانیکا حکم بھی دیدیا۔ اور جب وہ قبر طیار ہو گئی۔ تو آپ نہایت اطمینان سے اس میں اُترے کچھ لیٹے۔ اور پھر

پنی قبر کو بہ وجوہ پسند کر کے گھر لوٹ آئے۔ سرسید اس واقعہ سے بہت پیچ و تاب کھانے لگے۔ اور دل ہی دل میں کہتے تھے۔ کہ اس دیوانے کو کیا ہو گیا۔ مگر ظاہرا اپنے بھائی کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ ان کا جنون جو پہلے نقلی تھا۔ رفتہ رفتہ اصلی ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنے کفن کے لئے کپڑا بھی منگوا لیا۔ اسکو اپنے سامنے درزی سے سلوایا۔ کھڑے ہو کر پہنا۔ اور اسمیں لیٹ کر بھی جب تسلی کر لی۔ تو آخر دم دے ہی دیا۔ سرسید کو سخت رنج ہوا۔ مگر ان کے بھائی پر کیا گلہ شکوہ ہے۔ وہ تو اپنے عزیزوں کو کئی دن پہلے اپنی موت سے آگاہ کر چکے تھے؟

"سرسید کی ایک دلچسپ تصنیف"

ایام غدر میں مسلمانوں کو بات بات پر سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ اردوئے معلےٰ میں میرزا غالب بھی فرماتے ہیں۔ کہ یہ ایک عجیب مصیبت کا زمانہ تھا۔ نہ داد نہ فریاد۔ انہی دنوں میں کسی مولوی کی تحریر میں انگریزوں کو نصارٰے کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ بس اسی پر ان مولوی صاحب کو پھانسی دیا گیا تھا۔ جب کتنے ہی ایسے مولوی اس مسئلے کی بھینٹ چڑھے۔ تو سرسید نے ایک مختصر سا رسالہ تحقیق لفظ نصارٰے میں لکھا۔ اور یہ ثابت کیا۔ کہ نصارٰے کا لفظ ناصرہ سے نہیں۔ بلکہ نصر سے مشتق ہے۔ اور قرآن میں کہیں قریۂ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا۔ اور نہ حضرت عیسٰی کو کہیں ناصری کہا گیا ہے۔ بلکہ آیات قرآنی تو صاف کہتی ہیں۔ کہ مسلمانوں کو نصارٰے اور عیسائیوں سے بہت زیادہ دوستی رکھنی چاہیئے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ المائدہ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى یعنی اے محمدؐ تو پائیگا۔ اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست انکو جنکا قول ہے۔ کہ ہم نصارٰے ہیں)

خیر سرسید کی مذہبی تحقیقات کا گو عام مسلمانوں میں اعتراف نہیں ہوا۔ مگر ان کی فلاسفی سے بعض مولویوں کا پھانسی سے بچ جانا۔ یہ بات کیسی قدر اور وقعت کے قابل ہے۔

ایام غدر

۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے تلنگوں نے فساد برپا کیا جو اس قدر بڑھا کہ سلطنت خاندانیہ تو

جڑ بنیاد سے اکھڑ گئی۔ ہندوؤں نے اپنی جگہ اور مسلمانوں نے اپنی جگہ سلطنت برطانیہ کے استحکام میں خاص طور پر مسابقت کی۔ اور جو پیشین گوئی سید انشا نے کی تھی ؎

انگریز کے اقبال کی ہے ایسی ہی رسّی
آویختہ ہے جس میں فرانسیس کی لوٹپی

وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور یورپ کی دو باقی ماندہ ٹوپیاں یعنی فرانسیسی اور پرتگالی ہندوستان کی فرقِ سلطنت سے اتر گئیں۔ اور یہاں کی فتوحات کا سہرا انگریزوں کے سر باندھا گیا۔ سر سید اس طوفان بے تمیزی میں بھلا کہاں تھے۔ وہ بجنور کے صدر آمین تھے۔ اور اُن کا کلکٹر یا حاکم ضلع مسٹر شکسپیر صاحب تھا۔ جو غدر میں اسقدر ہراساں اور خوفزدہ ہوا۔ کہ سر سید تمام رات اس کے بنگلے کی پاسداری کیا کرتے۔ اور شب و روز ان کی میم صاحبہ کی دلداری میں مصروف رہتے تھے۔ مگر پھر بھی ان دونوں میاں بی بی کے دل کا دھڑکن اور خوف کسیطرح رفع نہیں ہوتا تھا۔ آخر یہ صلاح ٹھہری۔ کہ اس علاقہ کے بیس یورپینوں سمیت جناب شکسپیر صاحب اور مسز شکسپیر صاحبہ نو دو گیارہ کدم رڑکی بھاگ جائیں۔ اس امر میں سر سید نے اُن کی خاص طور پر مدد کی۔ جیسے کہ ابن الوقت کو کرنا چاہیئے۔ ادھر محمود خاں لٹیرے سے جو بجنور پر قابض ہو چلا تھا۔ اور جس کے خوف سے کوئی شخص اپنے گھر سے باہر ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کچھ ساز باز کی یعنی اس کو سمجھایا۔ کہ دیکھو پہلے سب یورپینوں اور نیم یورپینوں کو یہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لینے دو۔ پھر یہ تمام علاقہ تمہارا ہی ہے۔ اور تم ہی اس لاوارث نگری (بجنور) کے گویا مالک ہو۔ غالباً کوئی برٹش ڈپلومیسی بھی سر سید کی اس مصلحت وقت سے لگا نہیں کھا سکتی۔ وہ انگریزوں کو اس خطرہ سے نکال کر خود بھی بجنور سے چھ سات کوس کے فاصلے پر "بسی کوٹلہ" کیطرف چلدیئے۔ لیکن انکی چرب زبانی کا دھنی نواب محمود خاں جس کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ہے بہت گرویدہ ہو گیا تھا۔ اُس نے انکو آدمی بھیجکر بلوایا۔ اور کہا کہ تم بدستور اپنی عدالتی کارگذاریاں کرتے رہو۔ مگر جب میرے پاس آیا کرو۔ تو مجھے بجائے صدر آمینی کرتے رہو۔ مگر جب میرے پاس آیا کرو۔ تو مجھے بھی ایک نواب تسلیم کر کے ہو اور نذریں چڑھایا کرو۔ غرض نواب محمود خاں کی اجازت سے سر سید اپنی ڈیوٹی بدستور بجا لاتے رہے۔ مگر اسوقت نواب موصوف کو سلطنت کرنیکا خبط سمایا ہوا تھا۔ اس نے سر سید احمد خاں کو

پھر بلایا - اور بار بار بلایا - اور کہا - کہ تو تم آج سے ہمارے وزیر ہو جاؤ - اور ہم یہاں کے بادشاہ بنتے ہیں - لازم ہے - کہ تم ہمارا ساتھ دو ورنہ یاد رکھو ایسی گت بناؤنگا - کہ ساری عمر یاد کرو گے تو مگر نہ معلوم سرسید کس ہڈی کے بنے تھے - فوراً بول اٹھے - کہ جناب نواب صاحب اسوقت آپکا خیال شریف کدھر ہے - یہ قوم انگریز ایک بہت بری بلا ہے جب ایک بار یہاں آگئی - تو ایسی سونے کی چڑیا چھوڑ کر یہ اب کہاں جانے لگی - لہذا آپ خبط حکومت سے باز آئیں - مگر ہنگامہ غدر میں بڑے بڑے نوابوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا - غریب محمود خاں کس گنتی میں تھا - سرسید اور ان کے سب دوستوں کا جانی دشمن ہو گیا - اور سرسید بھی فوراً تاڑ گئے - کہ اب ہماری خیر نہیں ہے - انجام یہ ہوا - کہ دوسرے ہی دن سرسید کے گھر پر دھاوا بولدیا گیا اور انکا سب اسباب اور بھرا بھرایا گھر فوراً اُن سے چھین لیا گیا - اور یہ بے گھر ہو کر ادھر اُدھر ڈانواں ڈول پھرنے لگے ؎

جائیں تو کہاں جائیں کہ رستہ نہیں کوئی
اپنا جسے سمجھے ہیں وہ غیروں سے سوا ہے

لیکن چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ - نواب محمود خاں نے کیا اُودھم مچایا تھا - کہ اسوقت بجنور میں چار ہزار کی جمعیت لیکر دلی سے ایک منیر خاں بھی پہنچ گیا - اس نے ڈپٹی رحمت خاں وغیرہ سبکو ایکدم قتل کر دینے کی دھمکی دی - اور سرسید کو بھی اپنی بارگاہ میں طلب کیا - اگرچہ بلحاظ نزاکت وقت سید کیساتھ منیر خاں کی گفتگو سیاسی اور ملکی ہونی چاہئے تھی - مگر وہاں ایک مضمون ہی دوسرا تھا - یعنی جہاد کا یہ ماجرا دیکھ کر سرسید بہت سٹ پٹائے - مگر چونکہ کچھ عرصہ سرکار کی ملازمت یا غلامی کرتے ہوئے ان کے دل و دماغ سے نوابی اور خود مختاری کی بو صاف اُڑ چکی تھی - جہاد سے صاف انکار کر دیا - اور وہی ابن الوقتی روح ان کے رونگٹے رونگٹے میں سلامت و برقرار رہی - اور پھر کسی طرح منیر خاں بھی بجنور سے ٹل گیا - اور سرسید نے شکر کیا - کہ ایک ایسے کڑے خاں سے کچھ زیادہ کڑیاں جھیلنے کی نوبت نہیں آئی - اب صرف نواب محمود خاں اور اسکی فوج سے مقابلہ کرنا باقی رہ گیا تھا - اسکو ہلدور کے چودہریوں نے اول اول دو ہی چار روز میں شاہ نے چت کیا - پھر سرسید نے یہ ساری داستان کہ منیر خاں کیسے نو کدم دلی کی طرف بھاگا - کسطرح محمود خاں [illegible] شکست کھا گیا - سرکار مدار الامدار کو لفظ بلفظ حرف

بلکہ نکتہ بنکتہ لکھ بھیجی۔ وہاں سے آپکو فوراً تمام ضلع بجنور کا مہتمم و منتظم مقرر کیا گیا۔ مگر کمبخت محمود خاں پھر آکر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ اور اب کے سر سید بال بال بچے۔ انہوں نے پھر اپنی بپتا یہ ساری کی کہانی سرکار کو لکھ بھیجی۔ اور فرار ہو کر چند روز میں میرٹھ بھی پہنچ گئے۔ اُن کا خاص بایوگرافر حالی لکھتا ہے کہ جسوقت سر سید میرٹھ رسید ہوئے تھے۔ ان کی جیب میں صرف چھ ڈبل پیسے۔ اور مال و اسباب سے فقط پھٹا پرانا ایک کرتہ تھا۔ جو ان کے گلے میں تھا۔ غرض سر سید نے جب سرکار کی ایسی خیر خواہی کی تو حکام بھی آخر جو کنے ہوئے۔ ان کا دل فوراً سر سید کی مصیبت پر پسیجا۔ اور اس سے کچھ سلوک کرنا چاہا۔ مسٹر کرافٹ ولسن میرٹھ کے اسپیشل کمشنر تھے آپ سر سید سے اُن کے گھر آکر ملے۔ اور ان کو یہ خبر دی۔ کہ باوجودیکہ بجنور کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے مگر جب سرکار نے بحالتِ مجبوری تمکو وہاں کی حکومت سپرد کی۔ تو ہندوؤں نے تمہارے انتظام کی بیحد تعریف و توصیف کی۔ اور تمہارے ہی تحت میں رہنا چاہا۔ اِسی طرح سرکار کی وہ خاص خاص نمک حلالیاں جو تم سے ظاہر ہوئیں۔ (اور پھر ایک ایسے نازک وقت میں کہ قیامت کی نفسا نفسی کا معاملہ سکو درپیش تھا) اس امر کی مقتضی ہوئیں۔ کہ تمہیں کوئی بڑا سا انعام فوراً دیا جائے۔ یا ایک ایسا نیک سلوک تم سے کیا جائے۔ جو ہمیشہ یادگار رہے۔ لہذا میں سفارش کرتا ہوں۔ کہ تمہاری ایک عمدہ فوٹو کھینچوا لی جائے۔ جو نسلاً بعد نسلاً تمہاری وفاداری سرکار کو یاد دلاتی رہے۔ جو کہ نہ صرف تمہاری ہی عزت افزائی کا سبب ہوگی۔ بلکہ تمہارے قدیم خاندانِ سادات کیلئے بھی ہمیشہ موجبِ فخر و مباہات ہوگی

اسقدر جانفشانیوں اور جان نثاریوں کا یہ اچھا صلہ تجویز کیا؟) سر سید جب مرتے مارتے بجنور سے دلی آئے تھے۔ تو وہاں دیکھا۔ کہ ہو کا عالم ہے تلنگوں کے ڈر سے سب لوگ اس غدار شہر کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ اور اُن کی والدہ اور خالہ اپنا گھر چھوڑ کر ایک اپاہج بڑھیا کے مکان میں سہمی ہوئی بیٹھی ہیں۔ جن کے کھانے کو گھوڑے کا دانہ اور پینے کو پانی تک موجود نہ تھا۔ اپنے سرکار سے سفارش کرا کے ڈاک کی شکرم لی۔ اور اس پر سب کو سوار کرا کے میرٹھ کا رُخ کیا۔ لیکن وہاں پہنچکر ان کی غریب والدہ نے انہیں صدموں سے دم دیدیا۔ ان دنوں میں محمود خاں اور شیر خاں کیطرح ایک صاحب مارے خاں ایک اور احمد اللہ خاں بھی احمد ظفر شاہ سے ہوئے تھے۔ جنہوں نے ضلع بجنور میں سرکار کا خوب مقابلہ اور اس سے مجادلہ کیا تھا۔ لہذا سرکار نے اس قسم کے واقعات چند در چند

دیکھ کر یہ حکم لگا یا تھا کہ مسلمان خواہ کوئی ہو سب کے سب منافق باغی اور باجی ہیں ۔ مگر سر سید نے اس کلیہ کی دلیری سے مخالفت کی (کیونکہ وہ بھی تو سرکار کے نمکخوار اور اس کے خاص وفاداروں میں تھے) اور ضلع بجنور کے باشندے عواقب و تبعات غدر سے محفوظ رہے ۔ اس کے بعد سر سید نے ضلع بجنور کی سرکشی کے حالات خود لکھے ۔ سرکار کے پیش کئے ۔ اور حکام وقت نے بھی انکی تائید کی ۔ تو خدمات غدر کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولیٹکل پنشن ان کے لئے اور ان کی دو نسلوں کے لئے قرار پائی ۔ سر سید کا رسالہ اسباب غدر چھپ چکا ہے ۔ اسمیں گورنمنٹ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں ۔ وہ ایسی دبی قلم سے لکھے ہیں ۔ کہ جو لوگ زمانہ شناس ہیں ۔ اُن کیلئے یہ ایک اچھا ادبی کارنامہ ہے جو ایسے ہی ہنگامی وقتوں کے حالات لکھنے کا بہت اچھا نمونہ ہے ۔

سر سید کی بالغ نظری اور انکی تعلیمی کوششوں کے نتائج

ایام غدر کے بعد جب امن ہوا ۔ تو سر سید مسئلہ تعلیم کیطرف جھکے ۔ اور انہوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا ۔ پھر یہ دیکھکر کہ ہماری دیسی زبانوں میں وہ تعلیم نہیں دی جا سکتی ۔ جو انسان کی عقل کو جلا دے ۔ انکی طبیعت میں اچھے برے کو خود پہچاننے کی تمیز پیدا کرے ۔ یا اس کے اخلاق کی درستی اور اس کے تجربوں میں وسعت دلانے کا موجب ہو ۔ اور جو امور معاد پر غور کرنے ۔ بہشت اور دوزخ کے مسائل کا قائل بنانے کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ وہ دیسی زبان کی تعلیم اور علوم مشرقی کے ویسے ہی دشمن ہوگئے ۔ جیسے کہ نیولا سانپ کا ۔ یا بلی چوہے کی ۔ اور گورنمنٹ سے درخواست کی ۔ کہ ہمارے نوجوانوں کو ایک بہترین مفید ملک و قوم کی تعلیم دلانیکا بندوبست کیا جائے ۔ کیونکہ موجودہ طریق تعلیم سراسر مخرب اخلاق اور لڑکوں کی تربیت پر بہت برا اثر ڈالنے والا ہے ۔ اسپر گورنمنٹ کیطرف سے انکو یہ ٹکا سا جواب دیا گیا ۔ کہ سرکار کو آپ کے لڑکے لڑکیوں کی ذاتی تربیت سے کچھ علاقہ واسطہ نہیں ہے ۔ سرکار تو فقط اسی قدر آپکی اولاد کو لکھا پڑھا

دینے کی اجارہ دار ہے۔ کہ جس سے ایک نئی پود سرکاری دفتروں کی ملازمت یا بابو گری کرنیکے قابل ہو سکے۔ اور جس کیلئے کچھ انگریزی۔ اردو۔ فارسی پڑھ لینا۔ اور انکا حساب و جغرافیہ وغیرہ کے مضامین سے واقف ہونا کافی و وافی ہے۔ باقی کسی فضول قابلیت یا واقفیت سے سرکار والا مدار کو کچھ سروکار نہیں ہے۔ حاشا للہ؟

اس کے بہت عرصہ بعد مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ دیسی زبانوں کی تعلیم پر انگریزی زبان کی تعلیم کو سر سید نے ترجیح دی تھی۔ اور اسکو بہتر خیال کیا تھا۔ لیکن ۳۶ سال گذرنے کے بعد بھی وہی نقص برابر قائم ہے۔ کہ انگریزی لکھے پڑھے نوجوانوں کی حالت اسیطرح روز بروز خراب اور نکمی ہوتی چلی جارہی ہے۔ جیسے کہ اردو خوانوں کی۔ اور ان پر بھی یہ شعر صادق آتا ہے۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

مگر میرا خیال ہے کہ وہ تو صرف ۳۶ سال کا مشاہدہ تھا۔ اگر یہی تعلیم اور اس کے عام ذرائع اور اسکا مقصد یعنی سرکاری ملازمت بالدوام موجود رہے۔ تو دو ہزار سال تک بھی ہمارے نوجوانوں کی حالت رو بہ اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اگر آجکل ہمارا علیگڈھ کالج محمڈن یونیورسٹی بن گیا ہے تو کیا ہوا۔ ع ڈھاک میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں۔

جس حالت میں تعلیم کے متعلق گورنمنٹ نے سر سید کو صاف صاف کہدیا تھا۔ کہ ہمیں اس سے مقصود تمہاری نسل کا بابو بنانا ہے۔ تو نقائص تعلیم کی سرکار سے کیا شکایت تھی وہ جو ترت دے جواب۔ پہلے فقط کالج بنا کر نوجوان مسلمانوں کی مٹی پلید کی جاتی تھی۔ اب یونیورسٹی ہو گئی۔ تو کونسا سرخاب کا پر لگ گیا۔ مانا کہ بی۔ اے علیگ کا دم چھلا۔ طلبا کا دل لبھانیوالا ہے لیکن آخر چار پاۓ بروکتابے چند ایسی تعلیم سے حاصل ہی کیا ہے۔ افسوس ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

سب جانتے ہیں۔ سر سید کا اہم ترین کارنامہ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ وہ انگریزی تعلیم کے مہلک نتائج چھتیس سال اپنی آنکھوں دیکھتے رہے۔

پھر بھی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا کوئی جلسہ انہوں نے ناغہ نہیں ہونے دیا۔ ہزاروں کو گریجویٹ بنایا۔ پس انکا یہ خاص تعلیمی جہاد ہندوستان میں ہمیشہ مستقل طور سے یادگار رہیگا۔ یوں تو حضرت انسان عموماً فرداً فرداً پاگل ہوا کرتے ہیں۔ ساری قوم کبھی دیوانہ نہیں بن جاتی۔ مگر موجودہ بیہودہ تعلیم کی روز افزوں ترقی اور ان کوششوں نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ تمام ہندوستان ہی گویا ایک سرے سے دوسرے سرے تک پاگل ہو گیا ہے۔ اور سب آنکھوں دیکھکر مکھی نگلتے جا رہے ہیں۔ نہ معلوم اس مسئلہ تعلیم کی اصلاح کب ہوگی۔ اور کیونکر ہوگی۔ انجمن ترقی اردو نے ہربرٹ سپنسر صاحب کا رسالہ تعلیم اردو میں ترجمہ کرایا تھا۔ کیا جامیں اسپر ہمارے ملک میں بھی کبھی عملدرآمد کیا جائیگا۔ کہ نہیں۔ یا کہ وہ کتاب سرسید کے سوانح نگار مولانا حالی کے ایک عزیز خواجہ غلام حسین ہی کو کچھ انعام دینے کیلئے ترجمہ کرائی گئی تھی؟

لائل محمڈنز آف انڈیا

سن ستاون کے غدر کے عام اسباب جو کچھ بھی ہوں۔ ان پر ہندوستانیوں۔ اور انگریزوں کی متعدد تصنیفات اسوقت موجود ہیں۔ مگر یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ انتقام غدر کا زلزلہ عام مسلمانوں ہی پر گرا تھا۔ اسلئے سرسید نے ایک رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" (جسکا مفہوم ہے ہندوستان کے نمک حلال اور وفا شعار مسلمان) جاری کیا تھا۔ گو ان باتوں کو اب کون پڑھتا یا پڑھانا چاہتا ہے۔ کہ کس کس نے سرکار سے بغاوت کی تھی۔ اور کس کس نے اسکی نمک حلالی کرنے کے لئے جانوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ لیکن شاباش ہے۔ سرسید کو۔ جس نے من وعن یہ بات ثابت کر دی تھی۔ کہ اپنی سلطنت کو خود اپنے ہاتھ سے کھو کر مسلمان ہی انگریزوں کے پکے وفادار بنے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ جان و مال کی قربانی سرکار دولتمدار کیلئے مسلمانوں ہی نے کی تھی اور اب بھی ہندوؤں کے تینتیس کروڑ فرقوں میں کوئی ایسا فرقہ یا گروہ سرکار کا خیرخواہ اور اسکا حمایتی یا پیچھو نہیں نکلیگا۔ جیسے کہ مسلمانوں کی صرف دو جماعتوں یعنی شیعہ اور سنی میں پایا جاتا ہے۔ رافضی۔ شیعہ۔ اور نیچری مسلمان وغیرہ جیسوں

قسم کے مسلمان سرکار کے نام پر اپنا خون پسینہ ایک کر دینے کو طیار ہیں۔ گویا مسلمان ہمیشہ ہی لائل اور وفا شعار ہیں۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ سرکار کے ہاں سب سے زیادہ غیر قوموں کو حصہ ملا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو بھی چاہئے۔ کہ وہ اپنے حقوق سے کبھی غافل نہ ہوں۔ محض باپ دادا کی وفاداریوں کے بھروسہ پر نہ رہیں۔ اگر سر سید کی پالیسی کانگریس کے خلاف تھی۔ تو اب خود اپنی کانگریس بنالو۔ یا اسی پرانی ہندوانی کانگریس میں مدغم ہو جاؤ۔ مگر برادران وطن کی چالوں سے خبردار رہو۔ وہ اس فن سیاست میں باکمال شاطر ہیں۔ اور تم ابھی مبتدی ہو۔ سرکار کے اسیطرح لائل بنے رہو۔ جیسے کہ گاندھی یا تلک تھے۔ اور اپنا الّو اسیطرح سیدھا کرتے رہو۔ جیسے کہ دہلی کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھکر سوامی شردھانند نے پہلے مسلمانوں سے اخوت اور محبت کا حلف لیا تھا۔ اور پھر ایک سنگھٹن قائم کیا۔ اور شدھی کا پرچار بھی جاری کیا۔ غرض مسلمانوں میں خواہ وہ کسی ملک کے ہوں۔ ڈپلومیسی کی عادت نہیں ہے۔ اور جب تک یہ نہیں ہے۔ خواہ سر سید اور ان کے رسائل لائل محمڈنز کتنے ہی تصنیف کئے جائیں۔ نہ انگریز ان سے خوش ہوں گے۔ نہ ہندو ان کو اپنا دوست اور شریک سمجھینگے۔ افسوس ہے۔ کہ سر سید کی سیاسی پالیسی سے ہمیں اتفاق نہیں۔ اور موجودہ نیشنل اور نیر نیشنل سیاسی لیڈروں سے بھی ہم خلاف ہیں۔ کیونکہ جب تک کیرکٹر مضبوط نہ ہو۔ ہم سے کچھ بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسوقت جو کچھ قوم کیلئے مناسب تھا۔ سر سید نے خوب کیا۔ اب اس کیرکٹر کے آدمی ہی ہم میں نہیں رہے۔ تو پھر سر سید کی پالیسیوں اور انکے نتائج پر بحث ہی فضول ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح

اسکو ضیاء الدین برنی نے مرتب کیا تھا۔ میں خیال کیا کرتا تھا۔ کہ برنی بھی شاید کوئی عربی فارسی لغت ہے۔ اور علاقہ برن ایران یا عرب ہی میں کہیں ہوگا۔ مگر معلوم ہوا۔ کہ یہیں میرٹھ کے ضلع میں یہ برن صاحب (نہ توبہ) موضع برن یا بلند شہر واقع ہے۔ برنی کی تاریخ کو سر سید نے درست کیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کو شائع کیا؟

تفسیر تبیین الکلام

سرسید نے ایک ایسے زمانے میں دنیا میں قدم رکھا تھا۔ جبکہ عیسائیوں سے ہر روز مسلمانوں کی جوتی پیزار ہوتی رہتی تھی۔ اور شب و روز عیسائیوں کی خلاف اسلام تحریروں پر مولویوں کی رگیں پھولتی رہتی تھیں۔ مگر سرسید کو یہ ساری باتیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ انہوں نے اپنے طور پر ایک خاص قسم کا علم الکلام اس نیت سے وضع کیا۔ کہ ادھر عیسائیوں کی تائید مذہبی کی جائے۔ ادھر مسلمانوں کی سابقہ تفاسیر قرآن اور احادیث سے کچھ ایسا مصالحہ بہم پہنچایا جائے۔ کہ نصاریٰ اور اسلام دونوں گلے مل جائیں۔ یا اگر ایسا ممکن نہ ہو۔ تو کم از کم انکی باہمی منافرت اور حسد و عداوت یا انکی آپس کی غلط فہمیاں ضرور دفع دفان ہو جائیں۔ اس لئے تفسیر تبیین الکلام کو تصنیف کرنے کیلئے انکو وہ کام کرنا پڑا۔ جو ان سے پہلے کسی متکلم اسلام یا کسی کج بحث مولوی سے بھی بن نہیں پڑا تھا۔ یعنی عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے تراجم کرانے کو ایک یوریپین ۳۰۰ روپیہ مہینہ دیکر اپنا ملازم رکھا۔ جو فقط دو گھنٹے انکی نوکری ہر روز بجا لاتا تھا۔ پھر ایک یہودی سے انجیلوں کے اصل عبرانی نسخوں کے مطالب حل کئے۔ اور مولوی عنایت رسول چریا کوٹی[1] سے بھی عربی احادیث و تفاسیر وغیرہ کے متعلق مسائل کے سمجھنے میں مدد لی۔ جو کتاب اِن سب سامانوں سے لیا ر اور لیتھو ہو کر چھپی وہ فی نفسہ بہت اچھی تھی۔ مگر اس سے نہ تو عام مولوی ہی مطمئن ہوئے۔ کیونکہ وہ نصاریٰ کو اپنے قریب آنا ناگوار جانتے تھے۔ اور نہ ہندوستان کے نیٹو اور نیم مہذب مسلمانوں کے عقاید سے شائستہ اور بزعم خود اعلیٰ درجہ کے مہذب کرسچین اتفاق کر سکتے تھے۔ سرسید کی یہ خاص کوشش سرسبز نہ ہوئی۔ اور جب یہ بیل منڈھے چڑھتے دکھائی نہ دی۔ تو پھر اس خیال ہی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اگرچہ حالی نے اس تفسیر اور اس طرز کلام کو مایوسی خیز ثابت کیا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں۔ کہ مولانا شبلی نے جو علم الکلام بطرز جدید قائم کیا تھا۔ وہ سرسید کی اسی قسم کی کارگذاریوں کی تقلید تھی۔ مگر سرسید کا وار اپنے علم الکلام میں عیسائیوں کے فاسد

---

[1] یہ وہی مولوی صاحب ہیں جنہوں نے موجودہ سیاسی خیالات شاید سب مولویوں سے پہلے اختیار کئے تھے۔

اعتقادات پر تھا۔ مگر شبلی کا خاص علیگڈھ کے پڑھے لکھے نوجوانوں اور سائنس یا نیچری خیالات پر۔ گویا ایک نے کسی غیر قوم پر اور دوسرے نے اپنی قوم پر حملہ کیا تھا۔ مگر نتائج ان دونوں کے ایک ہی سے ہیں۔ کہ نہ تو عیسائی مسلمانوں سے کبھی خوش ہوئے۔ اور نہ نیچری مسلمان ہی کبھی اسلامی روایات اور مذہبی قیود کے پابند ہوئے۔

مولانا حالی سرسید کے مذہبی اجتہادات کے تعلق سے ہمیں یقین دلاتے ہیں۔ کہ انکا منشا ہرگز کوئی نیا فرقہ قائم کرنا۔ اور اس کا سرگروہ بننا نہیں تھا۔ مگر بار لوگوں نے زبردستی انکو نیچریوں کا پیر مغاں اور انکو پیر نیچر قرار دے رکھا ہے۔ وہی مثل ہوئی مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ مگر ایک نئی اُمت کے پیغمبر شریعت وہ ضرور تھے۔ جو علیگڈھ میں ایجوکیٹ کی گئی۔ اور ترکی ٹوپی کا پہننا جسکا خاص شعار تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام کو یا نیچریت کو ایک ترکی ٹوپی پہننے سے کیا تعلق۔ کیا واسطہ تاہم اب ایک مادر پدر آزاد نئی جنریشن (اُمت) کا تکیہ کلام ہی یہ ہے۔ اور ہمیشہ ہونا ہی چاہیے۔

؎ آزاد صفت باش و کلاہ تتری دار۔

تفاسیر احمدیہ کی خاص نوعیت

سرسید ایک بہت بڑے مذہبی ریفارمر تھے۔ جیسے کہ جرمنی میں "لیوتھر صاحب"۔ اور ہندوستان میں گرو رامانند۔ بھگت کبیر۔ اور بابا نانک وغیرہ ہوگذرے ہیں۔ اس لیئے ان کے یہ چند ایک اصول موضوعہ منتخب ہوکر حوالۂ قلم کیئے جاتے ہیں۔

(۱) شیطان کا کوئی وجود ہرگز نہیں ہے۔ یہ صرف عام جہلا کا واہمہ ہے۔ شیطان تو خود انسان ہی کا نفسِ اَمّارہ ہے۔

(۲) اجماع حجت شرعی نہیں۔ قیاس حجتِ شرعی نہیں۔ تقلید ہرگز واجب نہیں۔ بلکہ ادریعی ہمیں معلوم نہیں۔ کہ کیا کیا کچھ ہے۔ اور کیا کیا کچھ نہیں ہے۔

(۳) قرآن کی کوئی آیت ہرگز منسوخ نہیں ہوئی۔ یہ کس پاجی کا عقیدہ ہے۔

(۴) صحاح ستہ کی ٹھیک بھی جہاں کہیں درایت سے نکل جائے۔ اس غلط مسئلہ پر زمین جنید نہ جنبد

کل محمد ہرگز نہ بنے رہو؟

(۵) طیور منخنقہ جنکو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو ان کا کھانا حلال ہے۔ "گردن مروڑی مرغی" مجموعہ سے ہمارے پنچ اخباروں کا خاص وظیفہ ہے۔ اسکی اصل یہی قول سرسید ہے!

(۶) تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے (مگر آجکل کے خلافتی مسلمان انگریزوں کے عموماً خلاف ہیں۔ اور ان سے ترک موالات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں)

(۷) اناجیل مقدس میں کوئی تغیر و تبدل ہرگز نہیں ہوا ہے۔ صرف ان کے ترجموں میں تحریف لفظی کی گئی ہے (مگر اس زمانے کے کٹر مولوی اس مسئلہ کو کب مانتے ہیں۔ وہ پرانی پرانی انجیلوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔)

(۸) بائبل عہد عتیق و عہد جدید دونوں الہامی اور غلطیوں سے پاک ہیں!

(۹) ہر شخص ان خاص مسائل میں جنکا ذکر قرآن یا حدیث میں نہ ہو۔ آپ اپنا مجتہد ہے (اور نیچری تو ہر امر ہی میں اپنے آپکو مجتہد العصر خیال کرتے ہیں)

(۱۰) بی بی حاجرہ جو حضرت اسمٰعیل کی سگی ماں تھیں۔ وہ کسی کی لونڈی باندی نہیں تھیں بلکہ رقیون بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔

(۱۱) لباس اور وضع قطع میں نصاریٰ کے ساتھ تشبیہ ممنوع یا مکروہ نہیں ہے۔ لہذا ڈاسن کا بوٹ پہننا، ہیٹ کا لگانا۔ کوٹ جاکٹ پتلون زیب بدن کرنا۔ ہرگز ہرگز ناجائز نہیں ہے (مگر مولوی تو ہم جبھی کہلا ئینگے۔ کہ جبہ ہو عمامہ ہو۔ دستار فضیلت ہو۔ ورنہ کوٹ پتلون سے مولویوں کی پہچان اور نیچریوں سے فرق کیسے ہو سکتا ہے)

(۱۲) قرآن کی کسی آیت سے جبر و قدر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ (چلو جبریہ اور قدریہ کی چھانٹی ہو گئی)

(۱۳) مسائل معراج و شق القمر آنحضرت کے خواب کی تعبیریں ہیں یعنی دونوں رویا میں واقع ہوئے لہذا وہ شب معراج کی محفلیں۔ بازاروں کی رونقیں۔ اور براق کا سب ڈھکوسلہ ہی ٹھہرے؟

(۱۴) ملائکہ یا ملائک ایسی ہی کوئی نیچرل قوت ہے یا جیسے کہ برق یا بجلی میں قوت ہے یا جیسے نباتات میں نمو یا پانی میں سیلان کی طاقت جو دکھائی نہیں دیتی۔ گو فرشتے بھی نیچری یا نیچر ہی کی ایک طاقت ہیں؟

(۱۵) قرآن میں آدم۔ ملائکہ اور ابلیس کا جو واقعہ درج ہے۔ وہ صرف ایک ادبی تمثیل ہے۔ اس کو

دانہ گندم۔ دوزخ اور بہشت۔ یا اخراج واندراج وغیرہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔
(۱۶) معجزات دلیل نبوت نہیں ہیں۔ (شاید اسلئے کہ سر سید معجزہ کے قائل نہ تھے)
(۱۷) قرآن شریف میں آنحضرت کا معجزہ کوئی بھی پایا نہیں جاتا۔ (مگر یہ بات صحیح ہے۔ تو پھر ایک نبی اور امتی میں کچھ یوں ہی سا فرق باقی رہ جائیگا)

سر سید کی قدر و قعت اور اُنکی نسبت علماء کی رائیں

جو فلسفی مسایل اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ ان سے ہمارے مولوی ملا کبھی متفق ہوں۔ یہ ایک امر محال تھا۔ چنانچہ سب نے ان کی سخت مخالفت کی۔ اور سب نے بیک کمیت یہ کہدیا۔ کہ سر سید نیچری۔ کافر۔ ملحد۔ دہریہ۔ مرتد۔ منافق اور بیدین ہے۔ اسکی کسی بات کو ہرگز قبول نکرو۔ وہ اگر دن کو دن کہے۔ تو تم اس کو رات سمجھو۔ اور اگر وہ رات کی تاریکی کو اندھیرے سے منسوب کرے تو تم اسکو برق کی روشنی یا گیس لایٹ سے تعبیر کرو۔ وہ اگر جنوب کو بھاگے۔ تو تم شمال کو گویا ؎

ہم اور رقیب دونو یکجا بہم نہ ہونگے
ہم ہونگے وہ نہ ہونگے وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

یہی مخالفت بڑھتے بڑھتے سر سید کے قتل کے ارادے بھی کئے گئے۔ مگر جو شخص ان کے مار ڈالنے کو مقرر ہوا تھا وہ خود ان کے اخلاق کا گشتہ ہو کر اپنے وطن کو مراجعت کر گیا۔ البتہ مکہ مدینہ سے سر سید کیلئے کفر کے فتاوے منگائے جاتے رہے۔ مگر ان نیچریوں کو مکہ مدینہ سے کام ہی کیا!

علیگڈھ گزٹ

یہ اخبار سر سید اور اس کے حواریوں کے اظہار خیالات کا خاص آرگن اور گویا نیچر علیگڈھ کا حقیقی ترجمان تھا۔ اور اب بھی ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔ کہ اگر صرف ۱۸۶۶ء کے مضامین جو سر سید کے

اشہب قلم کی جولانیوں کا نتیجہ ہیں فراہم ہوں تو کئی ضخیم جلدیں امیر حمزہ کی داستان سے بھی زیادہ مطول مرتب ہو جائیں ۔ یہی تو وہ خاص قومی مٹیریل تھا جس سے مسلمانوں کا قومی لٹریچر ۔ قومی فلسفہ ۔ قومی اصلاحات کے دفاتر مرتب ہوئے ۔ اگر حالی نے مسدس لکھا تو انہیں تحریروں کے سر صدقہ ۔ وہ قومی شاعر تھے اور اس میں یہی خاص مواد پھوٹا تھا ۔ اور خوب پھوٹا تھا ۔ گو مولانا حالی نے سرسید ہی کے خیالات سے اپنے رونے دھونے کی شاعری کا مصالحہ جمع کیا تھا مگر ایسی ترکیب سے کہ جس طرح آدھ پنچ سے حضرت اکبر نے اپنے ہنسنے ہنسانے کو مٹیریل جمع کیا تھا بہت خوب یہ دونوں قومی شاعر ہیں ۔ ایک رو رو کے قوم کو سمجھاتا ہے ۔ اور دوسرا ہنس ہنس کے ۔ مگر کم بخت قوم ہی کچھ ایسی ضدی دریں نہ جنبد واقع ہوئی ہے ۔ کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ اور وہی رجعت قہقری کی ہمیشہ دھن رہتی ہے ۔ مولوی نذیر احمد کے وہ روان دوان ظرافت آمیز لیکچر ایسے جیسے کوئی گھوڑا ایک ٹٹ دوڑتا ہو ۔ کی روانی انہیں سے منور ہوئے ۔ بلکہ محمد علی جوہر نے حال میں کچھ ادھم مچانا شروع کیا ۔ اور علیگڈھ کے نیچری بودوں کو ستیا گرہ اور گورنمنٹ سے ترک موالات کر نیکو ایک شور برپا کر کے اس قومی کالج ہی کو سرتا پا منتزلزل کر دینا چاہا ۔ تو نیچر گڈھ کے اسی خاص آرگن علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ہی نے داد مردانگی دی ۔ بقول میر تقی قبلہ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا ۔

یوں تو سرسید کے تمام مضامین قومی تحریک و فلسفہ میں شرابور ہیں ۔ اور بہمہ وجوہ نور اعلیٰ نور ہیں ۔ مگر ۱۸۶۹ء میں آپ کے دل میں یہ امنگ جوش کرنے لگی ۔ کہ اگر مسلمان اور نصاریٰ ایک دوسرے کیسا تھ چولی دامن کا ساتھ رکھیں ۔ تو پھر قومی ترقی گرگوں کے پوبارہ ہیں ۔ چونکہ غدر نے غریب مسلمانوں کو بیحد تباہ کر دیا تھا ۔ بلکہ سرکار ان سے سخت بدظنی کرتی تھی ۔ اور یہ بدظنی برابر دس سال اندر اندر اپنا کام کرتی رہی ۔ سرسید نے سوچا ۔ کہ اگر مسلمان اور عیسائی ایک ساتھ گردن مروڑی مرغ ۔ کٹلس مٹن چاپ کیک بسکٹ ۔ اور چائے کی پیالیاں خوب گرما گرم اڑا کر تو دل مل کے چٹ کیا کریں ۔ تو پھر قوم کا پنپنا کچھ مشکل نہیں ہوگا ۔ ورنہ وہی حالت رہیگی ۔ کہ ؎

ہر بلائے کز آسمان آید
خانۂ مسلماں کجا باشد

اسلئے سرسید نے رسالہ احکام طعام اہل کتاب شایع کیا۔ تاہم اتنی احتیاط ضرور کر لی تھی۔ کہ ایسی مشترک دعوتوں میں شراب اور سور قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ آجکل قوم اس کے برعکس بالکلیہ مشتعلہ ہو رہی ہے۔ گویا گورنمنٹ سے عناد ہے۔ اور یہ مولوی محمد علی و شوکت علی نے اب قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ الاخراج الیہود من الصنادیم الجزیرۃ العرب۔ سرسید کو جب پہلی مرتبہ کرسٹان بنایا گیا۔ تو وہ اسی رسالہ طعام اہل کتاب کی طفیل تھا۔ مگر تعجب ہے کہ گردن مروڑی مرغی کے نوش فرمانے کا فتویٰ لکھا گیا۔ تو اسپر شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ نے بھی دستخط کر دئے۔ اسلئے یہ مسئلہ مستند ہے۔ کہ طیور مختنقہ حلال ہے۔

سفر لنڈن

سرسید نے مسلمانوں کی انگریزوں کیساتھ بھائی چارہ پیدا کرنیکی ہر ایک ممکن تدبیر کی تھی اور بجز مشل انگریزی کوئی پتھر اٹھانا دشوار نہیں سمجھا۔ اسی ارادے کو چھوڑ کر ولایت جا پہنچے۔ وہاں بھی ہر روز نئے نئے فرنگیوں کی دعوتیں اڑائیں۔ مگر ایک دعوت میں تو سرسید کی طبیعت بھی شاید بے قابو ہو گئی۔ اور منہ میں پانی بھر آیا۔ فرماتے ہیں۔ میرے ایک لنڈنی دوست نے (فندماری دوست نہیں) مجھے مدعو کیا۔ اس جلسے میں کئی سو مرد خوبصورت لباس پہنے اور لیڈیاں جوان فندالہ جنہیں بھی شامل تھیں۔ ایک انگریز نے مجھ سے سوال کیا۔ اجی سید صاحب کہئے۔ یہ لنڈن شہر بہشت ہے۔ کہ نہیں۔ اور تمہارے نزدیک حوروں کا ہونا درست ہے۔ یا غلط؟ اس سوال کو سرسید نے کسطرح ٹالا۔ یہ تو نہیں لکھا ہے۔ ہاں اسپر وہ کہتے ہیں کہ بیجا ہے۔ مگر ہماری قسمت میں تو وہی جلنا اور شب و روز کڑھنا لکھوا آئے۔ روتے ہیں۔ لبور تے ہیں چیختے ہیں چلاتے ہیں۔ وہ کونسی بات ہے۔ جو رفع قوم کیلئے نہیں کرتے۔

سید محمود مرحوم و مغفور

سرسید نے انگلستان دیکھا۔ لنڈن کی سیر کی۔ دلائیتوں سے خود اُن کے گھر جا کر نذر کھائے

تو اس سے قوم کیلئے ایک بہت اچھی نظیر قائم ہو گئی - اور اس بارے میں کٹر مسلمانوں کا جو حجاب و تعصب نصاریٰ سے تھا - وہ جاتا رہا - چنانچہ ایک نوجوان سید امیر علی (وہی امیر علی جنہوں نے بعد کو ججی کی - اور لیڈی بھی کی - اور اس لیڈی کے نکاح میں اب یہ سزا بھگت رہے ہیں - کہ تا دمِ واپسیں لنڈن ہی میں رہنا ہوگا - اور اپنے وطن کے دفن کفن تک سے بھی محروم رہینگے) تو کدم ولایت کیطرف بھاگے - اور فوراً بیرسٹری پاس کر لی - اسیطرح سر سید کے ہمراہ ان کے ایک فرزند سید محمود خان بھی تھے - انہوں نے بیرسٹری کا ڈپلوما لیا - مگر لیڈی نہیں کی - شاید باپ کا خوف دامنگیر تھا - یا سر سید کے لنڈن ہونیکی وجہ سے موقع نہیں ملا - مگر فرنگن لیڈی سے بھی زیادہ ایک یورپین آفت وہ اپنے ساتھ لیکر ہندوستان میں آئے تھے یعنی شوقِ شراب و ذوقِ بادۂ ناب - جسنے ان کی قانونی - فلسفی - علمی - ادبی تمام قابلیتوں پر پانی پھیر دیا - بقول شہزادہ سلیم ؏

ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ -

تہذیب الاخلاق

لنڈن سے سر سید نے معاودت کی - تو ان کے دل میں وہ خیالات نہیں تھے - جو ان کے لائق فائق صاحبزادے محمود خاں کے تھے - جنکی توضیح اوپر درج کیجا چکی ہے - غرض سر سید اپنی قوم کیلئے بہت کچھ ولایت سے سیکھ کر ہندوستان میں آئے - بقول محسن الملک وہ لنڈن میں تھیٹر - ناچ - ٹاپ - خوبصورت پارک یا میوزم کی سیر اڑانے نہیں گئے تھے - بلکہ فرنگیوں سے اپنے مذہب کی حمایت میں لڑنے ان سے جنگ و جدال کرنے اور سر ولیم میور کے خرافات کا جواب دینے کیلئے تشریف لیگئے تھے گھر آ کر تہذیب الاخلاق جاری کیا - جس نے علیگڈھ گزٹ سے بھی شاید کسیقدر زیادہ نصیحت کا سبق سب کو پڑھایا - مگر اس پرچے کا وار عموماً مولویت اور مسلمانوں ہی کا مذہبی تعصب و کٹر پن پر پڑتا تھا - جسکی بخوبی اصلاح ہوئی - اور ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا پہلا پرچہ بڑی دھوم دھام سے علیگڈھ سے نکلا - میرا تو خیال ہے - کہ عام مسلمانوں میں جدید ادب اردو کا شوق اور نثر نگاری کا ذوق ایک حد تک اسی پرچے کا نتیجہ ہے - اور جو ادبی اصلاحیں نیچرل شاعری اور جدید ادب

کے نشوونما کے متعلق) مولوی محمد حسین آزاد سے منسوب ہیں۔ وہ بھی تہذیب الاخلاق ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ شاید ۱۸۷۰ء میں جبکہ تہذیب الاخلاق نکلا۔ آزاد کو تو اردو لکھنا بھی اچھی طرح نہیں آتا ہوگا۔ مثلاً ان کا نصیحت کا کرن پھول جو ۱۸۶۴ء کی تصنیف ہے۔ اس قصہ کے شروع شروع ہی میں لکھتے ہیں "مرزا شریف کا کارخانہ لیین دین بہت بڑھ گیا۔ تو دیکھا کہ اب وطن کو جانا نہیں ہو سکتا" یہ کارخانہ لیین دین ابھی حضرت آزاد کی ابتدائی اردو ہے۔ جو بعد کو مصنف آبحیات کے نام سے موصوف ہوئے۔ غرض تہذیب الاخلاق سرسید کا ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ تھا۔ جس نے قوم کی اصلاح میں وہی پارٹ پلے کیا۔ جو علیگڈھ کالج نے مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کے تعلق سے کیا ہے۔ اور کیا اب نہیں کر رہا ہے؟

سرسید فرماتے ہیں۔ کہ تہذیب الاخلاق کے توڑ پر قرآعوذی مولویوں نے متعدد رسالے جاری کئے جنمیں سرسید کی تکفیر کے فتادے متواتر طبع ہوتے رہتے تھے۔ بلکہ سرسید کیساتھ ان کے اعوان و انصار بھی نیچری اور کرسٹان کہلانے لگے تھے۔ اس کے متعلق ایک مزیدار لطیفہ یاد آیا ہے۔

"لطیفہ" نواب محسن الملک سید مہدی علیخان صاحب مرحوم مغفور

نواب صاحب موصوف کے چند مضامین علی التواتر تہذیب الاخلاق میں چھپے۔ اور لوگوں نے دیکھا۔ کہ یہ سلسلہ کسیطرح ختم ہی نہیں ہوتا۔ تو انہوں نے یہ سمجھ لیا۔ کہ وہ بھی سرسید کیساتھ کرسٹان ہو گئے۔ کیونکہ نواب صاحب کا سارا خاندان اثنا عشری تھا۔ اور وہ سرسید کے اغوا سے سُنی ہو گئے تھے۔ ایک سنی مسلمان نے ان کے چچا سے طنزاً کہا۔ کہ اے لو۔ سید مہدی بھی کرسٹان ہو گئے۔ یہ تو رونے کا مقام ہے۔ یہ سنکر مخاطب نے جواب دیا۔ کہ بھائی کچھ اب سے نہیں۔ ہم تو اسی دن سے سید مہدی کو رو چکے ہیں۔ جبکہ اس نے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کیا تھا؟[۵]

غرض رسالہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کے خیال میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ یہ مولانا

---

[۵] یعنی جب سے سنی مسلمان بن گئے۔

حالی کا قول ہے۔ اور بالکل بجا ہے۔ خصوصاً حالی جو محض ایک غزل گو شاعر تھے۔ میرا تو عقیدہ ہے
کہ اسی پرچے نے اُن کے خیالات کو یک لخت تبدیل کر دیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کیلئے ایک قومی
شاعری کی بنیاد ڈالی۔ شبلی اور مولوی نذیر احمد بھی کنج خمول میں چھپے بیٹھے تھے۔ رفتہ رفتہ تہذیب الاخلاق
کے قومی لٹریچر نے ان پر بھی جادو کا کام کیا۔ اور وہ ادب اُردو کے آئندہ درخشاں ستارے اور اسکے
خاص ارکان ثابت ہوئے۔

"ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کی کارستانیاں"

اس دوران میں ایک ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر صاحب نے مسلمانوں پر ہنٹر برسانا شروع کیا۔ ان کو
گورنمنٹ کے خلاف ڈس لائل محمڈن ثابت کرنیکی بلیغ کوشش کی۔ اور وہابیوں کے فنا کیمتعلق
بھی وہ زہر اگلا۔ کہ توبہ ہی بھلی سرسید نے ہنٹر کا جواب ہنٹر سے تو نہیں دیا۔ مگر نہایت
تہذیب و شائستگی سے اس موذی کی تحریروں کا مقابلہ کیا۔ اور سرکار پر ثابت کر دیا۔ کہ ہندوستان
کی تمام رعایا اور اس کے تمام فرقوں میں مسلمان ہی سب سے زیادہ اس کے پکے وفادار اور ممد و
معاون ہیں۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ؟

بنائے مدرسہ علیگڈھ بمقام کوئل

سرسید بنارس میں ملازم تھے۔ جب اس مدرسہ کی تجویز ہوئی۔ وہ وہاں سے کوئل یعنی علیگڈھ میں
تشریف لائے۔ اور مولوی سمیع اللہ خاں بہادر کی مشارکت سے اس قومی تعلیم گاہ کا بنیادی پتھر
رکھا گیا۔ یا جی نہیں۔ بنیادی پتھر نہ کہو مسلمانوں کے لئے ایک کعبہ تعلیم تعمیر ہوا۔ گویا ایک سنگ اسود
ہندوستان میں بھی رکھا گیا۔

گھس جائیگا سر گر تیرا پتھر نہ گھسیگا ؎

اب یوں سمجھو۔ کہ۔ یہ مدرسہ تا قیامت قوم کیلئے قائم رہیگا۔ اور رہنا ہی چاہئے۔

اسٹریچی صاحب

یہ صاحب بہادر یوپی کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ جبکہ وہ خالی زمین جس پر علیگڈھ کالج بنا ہے۔ اور جو ملٹری کی تھی سرسید کو سرکار انگریزی سے عنایت ہوا تھا۔ چونکہ گورنر موصوف نے اپنی سفارش سے یہ زمین دلوادی تھی کالج کا ہال "اسٹریچی ہال" انہی کے اس خاص احسان کا اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن جس کالج پر گورنروں لفٹننٹ گورنروں کا شروع ہی سے اتنا احسان ہو۔ اسکی رسم افتتاح بھی تو بڑے طمطراق سے ہونا چاہئے۔ ایسا ہی ہوا کہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ کی سالگرہ کا دن سب کو پسند آیا۔ اور اہل وفا نے اس کالج کی افتتاحی رسم اسی روز منائی گئی۔ چلو ایک کام دو کاج جیسی مہا کاج سرانجام کو پہنچا۔ اور یہ مدرسہ جاری ہو گیا۔

کالج کے لئے چندہ اور ہر وقت کا دھندہ

اب علیگڈھ کالج تو کھل گیا۔ قوم کے نونہال جوق در جوق اس میں آنے لگے۔ کوئی پنجابی ہے کوئی پشتو بولی۔ کوئی دہلوی۔ کوئی لکھنوی۔ کوئی بجنوری ... کوئی الہ آبادی۔ مگر چندہ کی ایک تھیلی جمع ہو تو یہ بیل منڈھے چڑھے۔ یہ قوم جسے چاہئے تھا۔ کہ سرسید کو لبیک کہتی اسکا یہ حال کہ سرسید کے نام سے نفرت۔ انگریزی تعلیم کی ایک بات سنکر کانوں میں روئی ٹھونس لیتی۔ ایسے نادہند لوگوں سے چندہ کیسے وصول ہو سکے "ایں سخن دریں است"۔

ایک روز نواب امتو جان سے سرسید نے برسبیل تذکرہ کہا۔ کہ اچھا نواب صاحب آپ کے نزدیک اس کالج کیلئے دس لاکھ روپیہ چندہ جمع ہو سکتا ہے۔ کہ نہیں۔ وہ یہ بات سن کر مسکرا دیئے۔ اور کہا۔ کہ سید صاحب کیا دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ان مسلمان بھائیوں سے تم دس لاکھ روپیہ چندہ کی امید رکھتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ دس لاکھ ڈھیلے پیسے بھی ان سے

وصول نہیں ہونے کے۔ تمہارا خیال کدھر ہے۔ مگر حضرت سید مایوس نہیں ہوئے۔ چندہ وصول کرنیکا دھندہ اپنا فرض خیال کیا۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سب کے سامنے اس چندہ کا دستِ سوال پھیلاتے رہے۔ حتیٰ کہ سات لاکھ روپیہ کی پختہ عمارت اس کالج کیلئے صرف چندوں ہی کی بھیک سے تعمیر کردی۔ ؎ آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو۔

"لطیفہ"

ایک دفعہ سرسید نے لاٹری ڈالی۔ اور اس کے ٹکٹ فروخت کئے۔ دو رئیس ادے سرسید کے پاس آئے۔ اور کہا۔ کہ لاٹری تو ایک طرح کی قمار بازی ہے۔ یہ اسلام میں جائز کہاں لکھی ہے۔ آپنے جواب دیا۔ کہ جہاں ہم سینکڑوں گناہ بے لذت اور ناجائز فعل ہر روز کرتے ہیں۔ چلو قوم کیلئے ایک یہ بھی سہی۔ پاس ہی ایک حضرت کھڑے تھے۔ بول اٹھے۔ کہ سرسید اگر لاٹری پر اُتر آئے تو یہ گناہ کس کا ہے۔ دولتمندوں اور رئیسوں کا۔ جو ایسے ضروری کام کے لئے بھی چندہ نہیں دیتے۔ بیچ میں الزام انکو دینا تھا۔ قصور اپنا نکل آیا۔

سرسید نے کئی کئی ڈھنگوں اور ہتھکنڈوں سے کالج کیلئے چندہ اکٹھا کیا تھا۔ پھر ایک ایسی قوم سے۔ کہ دینے کے نام ہی سے واقف نہیں۔ انہوں نے اپنی تصویر کی کاپیاں بیچکر چندہ وصول کیا۔ دوستوں کی کتابیں بیچکر چندہ حاصل کیا۔ خلیفہ سید محمد حسین خاں وزیر پٹیالہ کے ہاں پوتا پیدا ہوا۔ جیراعلی میں کالج کیلئے چندہ کھیلا۔ ایک دوست دور دراز سفر کو جاتے تھے امام ضامن کا روپیہ مانگا۔ کیونکہ یہاں سے یاں [illegible] کا حاجی دعوٰی تھا۔ اس دوست نے چندہ میں ایک اشرفی عنایت کی۔ علیگڑھ کی نمائش میں خود کتابوں کی دوکان لگائی۔ اور اسطرح پڑھے لکھے بھلے مانسوں سے چندہ بٹورا۔ لیکن سب سے زیادہ مسرت آمیز بات سرسید کا اس قومی کالج کیلئے ایک تھیٹر میں شریک ہونا۔ اور اسکے سٹیج پر کھڑے ہوکر ایک سریلی آواز میں حافظ کی یہ غزل گانا تھا ؎

ساقیا برخیز و دردہ جام را ٭ خاک برسر کن غم ایام را ٭

گرچہ بدنامی است نزدیک عاقلاں — ما نمے خواہیم ننگ و نام را
محرم راز دل شیدائے خود — کس نمے بینم ز خاص و عام را
با دلآرامے مرا خاطر خوش است — کز دلم یکبار برد آرام را
قوم ما اے قوم ما از بہر تو — دادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب — عاقبت روزے بیابی کام را

اس کالج کے چندے کے لیے سرسید نے تمام ہندوستان کی خاک چھان ڈالی۔ پنجاب، الٰہ آباد، مدراس اور بنگلور تک چکر لگائے۔ مگر جب اہل پنجاب نے خاص طور پر انکی مدد کی اور خلیفہ محمد حسین اور ڈپٹی برکت علی مرحوم جیسے بزرگوں نے اکیلے پنجاب سے سرسید کی جھولی چندے سے بھر دی تو انہوں نے بھی پنجابیوں کو زندہ دلانِ پنجاب کا خطاب دیکر خوش کر دیا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

سرسید کا چندہ اور سید اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کی ایک قسط

قومی ترقی کی راہ پیاری ہے — بیٹھی پہنے جوڑا بھاری ہے
نو من تیل کی فکر ہے جاری — چندے کی تحصیل ہے جاری ہے۔

قوم پہ غالب کورٹ کے عملے — عملے ٹھہرے پارک کے گملے
پھر یہ چندہ کیونکر دم لے — کتنا کوئی لے پھر بھی کم لے

دیکھنا ہے اک عمر سے بندا — بس یہی ہائیں اور یہی چندا
ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا — لاؤ چندہ۔ لاؤ چندہ۔

گو یہ رباعی سر سید کیطرف منسوب نہیں ہے بلکہ بعض اور چندہ بٹورنے والے مسلمانوں کیطرف اشارہ ہے۔ اسلئے سر سید کی پوزیشن صاف کرنیکو حضرت اکبر فرماتے ہیں ؎

سید کا جو عہد مشن تھا　　اس سکے کا ٹھیک چلن تھا۔
حسب ضرورت طرز سخن تھا　　وقت وہ اور تھا اور یہی سن تھا۔

کمسن لڑکوں سے بھیک منگوانا۔ اور ان کیلئے انہی کے ذریعہ سے چندہ جمع کرنیکو اکبر برا سمجھتے تھے چنانچہ فرمایا ہے۔

گرمیوں میں بچوں کو تھکانا۔　　شہروں شہروں بھیک منگانا۔
اور اس پر یہ بات بنانا۔　　مفلس لڑکوں کا ہوگا ٹھکانا۔

آپ انہیں معیوب نہیں ہے　　ہم کو تو مرغوب نہیں ہے
عمدہ یہ اسلوب نہیں ہے　　ہاں یہ طریقہ خوب نہیں ہے۔

اس سے بگڑتی ہے قومی حالت　　جاتی رہتی ہے شرم کی خصلت
کہتے ہو ہوگی جو یہ جمعیت　　ہوگا اس سے ربط اور الفت

مجھ پہ یہ کرتا تھا اعتراض حریف　　دل میں آیا یہ میرے شعر لطیف
دفتر اعتراض سوختہ ہے۔　　دہن او بہ چندہ دوختہ ہے۔

کچھ بھی انہیں چاہئے نہ چندے کے سوا　　اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا
گلچیں ہے ہر اک نہیں ہے بلبل کوئی　　اس نکتے کو کون سمجھے بندے کے سوا

یہ اشعار بھی مثل سابق بانی سر سید سے کچھ تعلق نہیں رکھتے لیکن سر سید کے ایک حواری نواب محسن الملک نے چندہ کیلئے جب کالج کی دھار میں [illegible] حضرت اکبر کی داد دیتے ہیں
[illegible] چاہو سو کہو　　لیکن دکھا دی اس نے بہبودی اپنی

ان کے عزیز ترین دوست مولوی سید زین العابدین جو شاید سب سے زیادہ ان کے تحفہ مشتق تھے۔ بار بار چندہ دیتے گھبرا اٹھے۔ تو کہا۔ کہ صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے عاجز آگئے۔ سرسید نے معاً کہا۔ ارے میاں اب تو کوئی دن میں ہم مر جائینگے۔ پھر تم سے کون چندہ مانگیگا۔ یہ الفاظ کچھ اسطرح سرسید کے منہ سے نکلے۔ کہ وہ آبدیدہ ہوگئے۔ اور چندہ فوراً ادا کر دیا۔

لطیفہ

سرسید کے بائیوگرافر خاص مولانا حالی ظرافت سے تو خالی تھے۔ تاہم ایک لطیفہ چندے ہی کے متعلق آپ نے لکھا ہے۔ کہ سید محمود دوسری بار تفریحاً انگلستان گئے تو معلوم ہوا۔ کہ کیمبرج یونیورسٹی کا سرمایہ بہت سا فاضل اور بیکار پڑا ہے۔ اور ارادہ ہوا ہے۔ کہ اسمیں سے دس لاکھ روپیہ سے ایک .... منتخب [illegible] ٹرینیٹی کالج کو گرا کر سر نو تعمیر کیا جائے۔ یہ سنکر سید محمود نے ایک انگریز دوست سے ذکر کیا۔ کہ یہ کیا فضول خرچی ہے۔ اگر اس روپیہ کو ہندوستان بھیجا جائے۔ اور وہ علیگڈھ یونیورسٹی بنانے کے کام آئے۔ تو کیا اچھا ہو۔ انگریز دوست نے سید محمود سے پوچھا۔ کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان ہیں۔ جواب دیا گیا۔ کہ چھ سات کروڑ۔ وہ انگریز یہ بات سنکر متعجب ہوا۔ کہ ایک ایسی پست ہمت قوم جو کروڑوں کی تعداد رکھتی ہو۔ اور اپنا ایک مدرسۃ العلوم نہ بنا سکے۔ اسکو زر دینا ہی گناہ ہے۔ اسے تباہ ہونے دو۔ مولانا حالی اپنی سادگی طبیعت سے اس بات کو ایک لطیفہ خیال کرتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں۔ کہ یہ لطیفہ نہیں ہے۔ ہماری قوم کا مرثیہ ہے۔ جو انہیں یاد پڑتے نہیں بلکہ ایک انگریز نے ہمارے حال پر پڑھ دیا ہے۔

دیئے تلے اندھیرا

سرسید کی عزت شہرت اور قابلیت کا اعتراف پشاور پار کے پہاڑوں کی چوٹیوں سے لیکر راس کماری کی نکڑ تک کیا جاتا تھا۔ اور بڑے بڑے گورنر لاٹ گورنر اسکا رعب داب مانتے تھے۔ مگر ان کے دفتر سکریٹری کالج کا ہیڈ کلرک ایک ہندو تھا۔ اس نے دیکھا۔ کہ سید دہلی کے ایک پرانے نزازو کے خاندان سے ہیں۔ طبعاً بھولے بھالے اور انگریزی سے

نابلد ہیں۔ انکو جگہ دینا کیا مشکل ہے ویسے بھی مسلمان حساب میں عموماً کچے اور ڈھونچو پونچو کی جانچ
پڑتال میں ہندوؤں کے سامنے بچے ہیں۔ اس کمبخت کا اینٹ سے حکمت طالبعلموں کے جعلی دستخط کر لئے
اور ہزار روپیہ کالج کے فنڈ سے بذریعہ جعلی چیکوں کے بنگال بنک سے وصول کیا۔ وہ ایسی لوٹ دن دہاڑے
کالج میں مچاتا رہا۔ جب خبر ہوئی۔ تو سوا لاکھ روپیہ سے زیادہ کا غبن ثابت ہوا۔ سرسید نے
یہ سنا۔ تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک کمبخت بہاری تو وہ تھا۔ جسنے دلی میں بم مار کر لارڈ ہارڈنگ
کی ریڑھ کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ اس شام بہاری نے سرسید کی کمر توڑ دی۔ آپکو اتنا صدمہ
پہنچا۔ کہ قریب المرگ ہو گئے۔ لیکن نادان ہیں جو کہتے ہیں۔ کہ کبوتر جیتے ہیں۔ سید ہے۔ قوم پر
مرنے کی تمنا کوئی دن اور وہ بدخصال خائن قید ہوا۔ اور اسی حالت میں کچھ کھا کے مر گیا۔

وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کی ممبری

اُس زمانے میں کسی ہندوستانی کا بڑے سے بڑے لاٹ گورنر کی جابر کونسل میں ممبر ہونا۔ ایک
بہت بڑا ملکی اعزاز تھا۔ یہ بھی سرسید کو نصیب ہوا۔ اور ہونا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ علیگڈھ
کالج کی بنا کے بعد سرکار ان کو اپنا ایک فرزند خاص بنانا چاہتی تھی۔ تاکہ انتظام سلطنت کا سیاسی
چرخہ کبھی مسلمانوں کی عدم نمائندگی کیوجہ سے کسی خطرے میں مبتلا نہ ہوا۔ غرض سرسید کی
دوستی کی بدولت جو سرکار سے پیدا ہوئی۔ سینکڑوں مسلمانوں پر سرکار نے احسان کیا۔ اور
علیگڈھ کالج کو اپنی کوئی خاص قومی تعلیم مسلمان بچوں کو نہیں دلا سکا۔ مگر ہاں شروع شروع
میں جبکہ انگریزی لکھے پڑھے مسلمانوں کی تعداد دفاتر میں بہت کم تھی۔ سرکار نے اس کالج
کے تعلیم یافتہ پتلون اور ترکی ٹوپی پوش نوجوانوں کو کھلے دل سے ملازمتیں دیں۔ اور یہ کلمہ گو
آزاد طبع مسلمان بھی ہزاروں کی تعداد سے ہندوؤں کیطرح کلرکی کرنے لگے۔ اور حکومت
کے حلقہ غلامی میں مقید ہو گئے۔ اور ابھی تک علیگڈھ کے یہ نیچری پودے نیچرل طور پر اکثر
فارغ التحصیل ہوکے یہی خواب دیکھا کرتے ہیں کہ آیا تحصیلداری تحصیلیں یا کلرکی کرکے حضرت
اکبر کے اس مقولہ کو سچا کر دکھائیں ؎

۵۔ کھا ڈبل روٹی ٹکڑ کی کر خوشی سے پھول جا۔

ہائے احباب کیا اپنے یہاں کار نمایاں کر گئے پاس بی اے کو کیا نوکر ہوئے پھر مر گئے

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جس میں کچھ قدرے ہم بھی الجھ گئے "آمدم بر سر مطلب" سرسید نے لاٹ صاحب کی کونسل میں کیا کام کئے تھے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ بچوں کو ٹیکہ لگائے جانے کی بزور تائید کی۔ کیوں نہ ہو۔ قومی کالج کو چیچک رو لڑکوں کی حاجت نہ تھی۔ وہاں انکا گورا چٹا چہرہ ہر قسم کے داغوں سے پاک وصاف ہونا نہایت لازمی تھا۔ لہذا قانون ٹیکہ پاس ہوا۔

۲۔ قانون تقرری قاضیان۔ برٹش حکومت نے جج سب جج اور خفیفہ جج (یعنی) خفیفہ جج وغیرہ مقرر کرکے عدالت کو قاضیوں کی خدمت سے سبکدوش کر دیا تھا اور ان کے سر سے شہر کا اندیشہ ہٹا رکھا تھا۔ بیچارے قاضی بھی لگے بھوکے مرنے۔ سرسید کی سفارش سے بنگال، اڑیسہ اور بہار وغیرہ میں دستاویزوں سے طیار کرنے اور عموماً نکاح خوانی اور طلاق دہانی سے اعزاز بنانے کیلئے بدستور قائم رکھے گئے۔

۳۔ قانون وقف اولاد۔ سرسید نے اس کے پاس کئے جانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر یہ کام ابھی ایک عالم جلیل شبلی نعمانی کا تھا۔ یہ ان سے پورا ہوا۔

۴۔ مسودۂ قانون مزارعان دکن پیش ہوا۔ تو سرسید اپنی رائے انگریزی رومن الفاظ میں لکھ کر لیگئے۔ اور اسکو کونسل میں جوں کا توں پڑھ دیا۔ باوجودیکہ وہ انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ تو ویسا ہی معاملہ ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی کیلئے حالی نے علم جیالوجی کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ اور پھر ایک جگہ اقرار کیا۔ کہ وہ اس علم کا ایک حرف بھی نہیں سمجھتے تھے۔ بقول شخصے۔ آنچہ استاد ازل گفت ہمان میگویم۔

۵۔ البرٹ بل پیش ہوا تو سرسید نے صاف کہدیا۔ کہ ہندوستانیوں کی عدالت اور ان کی مجسٹریٹی میں انگریزوں کے مقدمات کا نہ لایا جانا (جو اس بل کا مقصد تھا) گویا۔ اقدامات گذشتہ کو رکھنا ہے۔ اہل ہند تو یہ ہر انہ سے بھی زیادہ اپنی قوم کیساتھ کچھ رعایت کرنے سے ڈرتے ہیں تاہم یہ کسی ہندوستانی کی مفروضہ تھی ایک گرہ سے کی ٹھوکر سے پھٹ جاتا مسلمان ڈھکوسلوں کو کب

۵۔ کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا۔

ہائے احباب کیا اپنے یہاں کار نمایاں کر گئے
پاس بی اے کو کیا نوکر ہوئے پھر مر گئے

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جس میں کچھ قدرے ہم بھی الجھ گئے۔ آمدیم بر سر مطلب۔ سرسید نے لاٹ صاحب کی کونسل میں کیا کام کئے تھے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ بچوں کو ٹیکہ لگائے جانے کی بزور تائید کی۔ کیوں نہ ہو قومی کالج کو چھاپ رہے لڑکوں کی خاص ضرورت تھی۔ وہاں ان کا گورا چٹا چہرہ ہر قسم کے داغوں سے پاک و صاف ہونا نہایت لازمی تھا۔ لہٰذا قانون ٹیکہ پاس ہوا۔

۲۔ قانون تقرر قاضیاں۔ برٹش حکومت نے جج سب جج اور منصف جج (صدر امین) خفیفہ جج وغیرہ مقرر کرکے عدالت کو قاضیوں کی خدمت سے سبکدوش کر دیا تھا۔ اور ان کے سر سے شہر کا ذریعہ بار اٹھا لیا تھا۔ بیچارے قاضی بھی لٹے ہوئے تھے۔ سرسید کی سفارش سے بنگال۔ اڑیسہ اور بہار وغیرہ میں دستاویزوں کے تیار کرنے اور عموماً نکاح خوانی اور طلاق دہانی کے اقرار نامے لکھانے کیلئے بدستور قائم رکھے گئے۔

۳۔ قانون وقف اولاد۔ سرسید نے اس کے پاس کئے جانے کی بہت کوشش کی۔ مگر یہ کام انکی ایک خاص حواری شبلی نعمانی کا تھا۔ یہ ان سے پورا ہوا۔

۴۔ مسودہ قانون مرافعات دکن پیش ہوا۔ تو سرسید اپنی رائے انگریزی زبان الفاظ میں لکھ کر لے گئے۔ اور اسکو کونسل میں جہاں کانوں سے پڑھ دیا۔ باوجودیکہ وہ انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ تو ویسا ہی معاملہ ہے۔ کہ سائنٹفک سوسائٹی کیلئے حالی نے علم جیالوجی کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ اور پھر ایک جگہ اقرار کیا۔ کہ وہ اس علم کا ایک حرف بھی نہیں سمجھتے تھے۔ بقول شخصے۔ آنچہ استاد ازل گفت ہمان میگویم۔

۵۔ البرٹ بل پیش ہوا تو سرسید نے صاف کہدیا۔ کہ ہندوستانیوں کی عدالت اور ان کی ججی میں انگریزوں کے مقدمات کا نہ لایا جانا (جو اس بل کا مقصد تھا) گویا اقوام گذشتہ کو مٹانا ہے۔ اہل ہند تو یورپ سے بھی زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کچھ رعایت کرنے سے نہیں ٹلتے بلکہ ہم یہ کہتے کہ ہندوستانی کی مفروضہ قومی ایک گروہ کی ٹھوکر سے پھٹ جانا میاں ڈھکوسلوں کو کب

اشنان کرکے پوتر ہو جاتا ہے۔ ایام غدر کے بعد جیسے تھے۔ ویسے ہی ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے تمام خاندان اسی طوفان بے تمیزی میں بہہ نکلے۔ اور ایسے ڈوبے کہ پھر کبھی آچھلے ہی نہیں۔ کیا اب بھی تم کانگریس میں غت ربود ہونا چاہتے ہو۔ لعنت ہے تمہاری اس غت ربودی پر۔

ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کی قومی خدمات نہ صرف ان مسلمانوں کو جو برادران ہنود سے ہمیشہ کشتم کشتہ رہتے۔ اور ان سے للّٰہ لڑتے رہتے ہیں۔ پسند آئیں۔ بلکہ گورنمنٹ نے بھی انکو بنظر استحسان دیکھا۔ اور سرسید کو ۱۸۶۹ء میں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب دیدیا گیا۔ اسی پر سید اکبر نے یہ پھبتی اڑائی تھی۔

فضلِ خدا سے عزت پائی — آج ہوئے ہم سی۔ ایس۔ آئی۔
شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی — بولے ہوئے کہیں یہ عیسائی۔

لطیفہ سی۔ ایس۔ آئی

راجہ جیکشن داس بہادر سے سرسید کی گارھی دوستی تھی۔ انکو بھی سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ تو جو شخص ان کو مبارکباد دینے آتا۔ اس کے منہ سے سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ آئی نکلتا تھا۔ نوکر اس بات کو نہ سمجھ سکے۔ آپسمیں باتیں کرنے لگے۔ دیکھو سید کمبخت تو عیسائی ہوا ہی تھا۔ راجہ صاحب کو کیا ہوا ہے کہ یہ بھی عیسائی ہو گئے؟ خوب۔ یک نہ شد۔ دو شد۔

سرسید کی وفات

یوں تو ہر شخص مرنے ہی کو پیدا ہوا ہے۔ اور یہ جانور سوت دیوی ہی کی بھینٹ چڑھتا ہے۔ مگر بعض لیڈروں کی وفات تمام ملک کیلئے سخت رنج کا باعث ہوتی ہے۔ جیسے کہ سرسید کی افسوس ہے وہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو وفات پا گئے۔ بظاہر احتباس بول کا عارضہ ہوا۔ مگر کئی ایک حادثات خاندانی بھی اس کے محرک ہوئے تھے۔ مثلاً قابل ترین بیٹے کی وفات۔ پھر کالج فنڈ میں سے ایک رقم کثیر کا غبن ہونا وغیرہ وغیرہ۔ مگر مولانا حالی نے آن کے بڑھاپے کا کچھ خیال ہی نہیں

[آ]پ کب تک اگر دن مروڑی مرغیاں کھاتے رہیئے۔ اکیاسی۔ بیاسی برس کی عمر آخر کچھ عمر ہوتی
۔ اب آخیر میں الکبیر مرنا ہی تھا۔ ایکدن سر سید بھی مر لیئے۔ شعرا کا دستور ہے۔ کہ بڑے بڑے
[لوگ]وں کی تاریخ وفات اور مرثیے دل کھول کر لکھا کرتے ہیں۔ سر سید اس سے محروم نہیں
ے۔ مولانا حالی نے فارسی میں انکا مرثیہ لکھا۔ جسکا ایک شعر ہے ؎

خواجہ در فکر صلاح دین و ملت در گذشت ۔۔۔ لیک اہل دین و ملت قدر او نشناختند

[ب]ہترین مرثیہ اردو میں سر سید کا چودھری خوشی محمد صاحب بی۔ اے۔ علیگ نے لکھا تھا۔
[...]ائیں وہ فرماتے ہیں ؎

جوگیوں کا روپ بھر کر قوم کے اسٹیج پر ۔۔۔ ماتمے خواہیم نگنے نام را گائیگا کون
دفن کرتا مسجد کالج میں سر سید کی لاش ۔۔۔ اس خلیل اللہ سے کعبے کو چھڑوائیگا کون
یوں تو لاکھوں آ کینگے اس بزم میں اور جائینگے ۔۔۔ سید احمد خاں کی صورت میں مگر آئیگا کون

[ح]ضرت اکبر کی زبان کون بند کر سکتا تھا۔ آپنے بھی انکی وفات پر دو ایک شعر لکھ ہی تو دئے یعنی ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا ۔۔۔ نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنیوالے میں۔
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر ۔۔۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں

لطائف و ظرائف

[م]ولانا حالی فرماتے ہیں۔ کہ ظرافت اور خوش طبعی سر سید کی جبلت میں داخل تھی۔ مگر اسمیں
[ت]صنع کو مطلق دخل نہیں دیتے تھے۔ تحریر میں تقریر میں بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی ان کو سوجھ
[جات]ی۔ اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہوتی۔ منہ پر کہہ گذرتے تھے۔ ان سے ہرگز ضبط نہ
[ہو س]کتا تھا۔ زیادہ تر ہنسی اور شوخی ان لوگوں کے مقابلہ میں سوجھتی تھی جو ان کی تکفیر یا تذلیل
[ک]رتے تھے۔ اور انکو کافر و مرتد کہکر اپنا دل ٹھنڈا کیا کرتے تھے۔ پادریوں سے بھی ان کا دل دکھتا
تھا۔ اس لئے کبھی کبھی ان سے بھی بالمشافہہ دو چونچ لڑا لیتے تھے۔
[ا]یک دفعہ سر سید فرسٹ کلاس یا شاید سیکنڈ کلاس کے کمرے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ وہاں ایک

پادری صاحب بھی آ گئے۔ انکو کسیطرح معلوم ہو گیا۔ کہ سرسید یہی ہیں۔ اٹھکر سرسید کے پاس آئے۔ اور کہا۔ کہ مجھے مدت سے آپکی زیارت کا شوق تھا۔ اب اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے کہا میں نہیں سمجھا۔ آپ کس کی باتیں مجھ سے کرنی چاہتے ہیں۔ اس نے پھر کہا۔ خدا کی۔ یہ سنکر سرسید نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ کہ میری تو ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لئے میں انکو نہیں جانتا۔ پادری نے متعجب ہوکر یہ کہا۔ کیا آپ خدا کو نہیں جانتے۔ انہوں نے کہا نہیں پر کیا موقوف ہے جس سے ملاقات نہ ہوئی ہو اسکو کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ پھر کسی شخص کا نام لیکر پادری صاحب سے پوچھا کیا آپ اسکو جانتے ہیں۔ اسنے کہا۔ نہیں میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ سرسید نے کہا۔ پھر میں سے ملتی نہ ملا ہوں۔ نہ میں نے اسکو کبھی اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو۔ نہ مجھکو اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو۔ اسکو میں کیونکر جان سکتا ہوں۔ پادری صاحب یہ آخری فقرہ سنکر خاموش ہو گئے۔ اور ایک دوسرے انگریز سے انگریزی میں مخاطب ہوکر کہا۔ کہ یہ (سرسید) تو سخت کافر ہے؟

لطیفہ ایک روز دہلی کے مشنری کالج اور علی گڑھ کالج کا میچ تھا۔ دہلی سے دو پادری اپنے کھلاڑی لڑکوں کو ساتھ لیکر علیگڑھ آئے۔ سرسید نے ان کی دعوت کی۔ مسٹر بک بھی اس میں شریک تھے۔ ایک پادری نے سرسید سے مخاطب ہوکر کہا۔ کہ نہایت اچھی بات ہے آپکے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ سچا مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے اندر نیکی پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایک پادری کے منہ سے یہ کلمہ خواہ کسی نیت سے نکلا ہو۔ سرسید نے خیال کیا۔ کہ یہ شخص پادری ہے۔ اسلام کو ایک سچا مذہب تو یہ کہہ ہی نہیں سکتا۔ بہرحال اسکا منشا عیسائیت کی تائید کر رہا ہے۔ حالانکہ کرسچانٹی سے زیادہ کشت و خون اور کسی مذہب سے نہیں ہوئے۔ پس سرسید نے پادری صاحب کی بات کا جواب یہ دیا۔ کہ جناب پادری صاحب آپ کیا فرماتے ہیں۔ مذہب سے زیادہ بری چیز دنیا میں اور کونسی ہوگی۔ یہی تو سب خرابیوں برائیوں اور جرائم کا مخزن ہے۔ جسقدر خونریزیاں۔ بے رحمیاں ظلم اور قتل مذہب کے سرصدقہ ہوئے۔ وہ ایک طرف اور جو کارستانیاں اور جرائم شیطان نے

ایسے ہیں۔ وہ ایک طرف رکھے جائیں۔ تو بھی مذہب اسلام کا پلہ بھاری رہیگا۔ پادری صاحب یہ
دو ٹوک جواب سنکر اسوقت تو شاید میزبان کی خاطر چپ ہو رہے مگر پھر مسٹر بک کی کوٹھی پر آ کر اپنے
دل کا بخار نکالا۔ اور اس سے کہا۔ کہ میں تو سنتا تھا۔ کہ سرسید بڑا [illegible] (محقق مذہب)
ہے۔ مگر یہ تو پورا ہی نکلا۔ ع چوں دم برداشتم ما
مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے منطق کو پادری صاحب سمجھ ہی نہیں سکے۔

سفارش سے گریز یوں تو سرسید کے دل میں از حد قوم کا درد تھا۔ اور حقیقت میں ساری
قوم کی آنکھیں انہیں کی طرف اٹھتی تھیں۔ مگر وہ ملازمت یا ترقی عہدہ
کیلئے کسی کی سفارش وارش نہیں کیا کرتے تھے۔ ایک صاحب جو اس بات
سے بیخبر تھے۔ ان کے پاس آئے۔ سلام کر کے بیٹھ گئے۔ پھر اٹھے۔ اور منت کیا۔ کہ یا حضرت رات
مجھکو خواب آیا۔ کہ ایک محسن قوم جو بڑے بزرگ ہیں۔ بڑے ٹھسے سے ایک جگہ بیٹھے ہیں۔ اور جو شخص
ان کے پاس آتا ہے۔ وہ اس کی حاجت فوراً روا کر دیتے ہیں۔ میں جب خواب سے بیدار ہوا۔ تو یقین
کیا۔ کہ وہ بزرگ اور محسن قوم آپ ہی ہیں۔ لہذا میری حاجت روا کیجئے۔ یہ سنکر سید نے فوراً کہا۔ کہ حضرت
میں کسی کی سفارش بھی نہیں کیا کرتا۔ آپکو اس معاملے میں ضرور کچھ دھوکا ہوا ہے۔ کیونکہ جس بزرگ کا آپنے
خواب دیکھا ہے۔ وہ میں نہیں تھا کوئی شیطان ہوگا۔

مسجد کی مرمت سہارنپور کی جامع مسجد کی مرمت کیلئے وہاں کے ایک بار سوخ مسلمان نے جو
صدر امین بھی تھا۔ سرسید کے سامنے دست سوال پھیلایا۔ آپنے دو ٹوک جواب دیا
کہ صاحب میں تو خدا کے [illegible] گھروں کی تعمیر میں مشغول ہوں۔ آپ اینٹ پتھر چونہ مصالحہ کے
گھروں کی فکر میں ہیں۔ جانیے میں ایک [illegible] کوڑی بھی تو آپ کو دینے کا نہیں۔ دراصل مسلمانوں
کی تعلیم کے سوا اُس وقت اور کسی مصرف کو غیر ضروری خیال کرتے تھے۔

سرسید کی ملازمت عموماً سرسید کو سرکار کا خوشامدی۔ حکومت پرست اور ایک ابن الوقت خیال کیا
جاتا ہے۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ کیونکہ وہ جب سرکار کے ملازم تھے۔ اور دوسرے
لفظوں میں اس کے غلام منقیاد اور بجرم ملازموں کی فہرست میں داخل تھے۔ تو انکا یہ حال تھا۔ کہ کسی
افسر سے دبتے نہ تھے۔ وہ جب منصف ہوگئے۔ تو رشوت سے بہت دور بھاگتے تھے لہذا جو شخص کوئی جھوٹا مقدمہ

انکی عدالت میں لا کھڑا کرتا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپتا رہتا۔ اور اسکے گواہوں کے چہروں پر بھی رنگ فق ہو جاتا تھا کہ دیکھیں آج ہم پر کیا بلا نازل ہوتی ہے۔ کیا خوشامدی لوگ اسطرح ایمانداری سے سروس کیا کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ایکدفعہ ایک شخص نے جان پاٹن کینس صاحب جج سے سر سید کی چغلی کھائی۔ کہ وہ فلاں مقدمہ میں میرے خلاف فریق ثانی کو خفیہ مدد دیتا ہے۔ اسکو منع کیا جائے۔ جج صاحب موصوف نے جو سر سید کے حاکم بالا تھے۔ انکو ڈرایا دھمکایا۔ اور مدد دینے سے روکا۔ لیکن سر سید نے مطلق پرواہ نہ کی اور صاف منہ پر کہدیا۔ کہ صاحب آپ میرے آفیسر ہیں۔ بواسطہ ملازمت آپ جو کچھ مجھکو کرنے کو کہیں گے۔ اسے سر آنکھوں پر بجا لاؤں گا۔ مگر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ یہاں محتسب را درون خانہ چہ کار۔ یہ جواب سنکر صاحب بہادر اور ان کے چغلباز دوست دونوں چپ ہو گئے۔ کیا ایک خوشامدی ملازم کا چلن کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔

کالج کے چندے کی ہوس

سر سید کو کالج کیلئے چندہ جمع کرنیکی ہر وقت لگی رہتی تھی۔ یعنی بلی کو چھیچھڑوں کا خواب۔ ایک رئیس (سر شیر محمد والئ پالن پور) نے علی گڑھ کی سیر کی۔ گورے چٹے طرحدار ترکی پوش طلبا کو دیکھا کچھ ادھر کچھ ادھر پھرتے پھراتے رہے۔ خوش ہو کر کالج کیلئے چندہ دیا۔ اور سر سید کے نوکروں کو بھی پچاس روپیہ کی بخشش دی۔ (یہی جسکو صاحب بہادر بخشیش کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ خانساموں کا حق ہوتا ہے) سر سید یہ حال دیکھ رہے تھے۔ فوراً اپنے نوکروں سے کہا۔ کہ بھلی بخت سے یہ پچاس کے پچاس اسیوتنت کالج فنڈ میں داخل کراکے رسید لیلو۔ ورنہ جاؤ آج ہی سے بوریا بستر اسمیٹو۔ ان غریبوں نے معاً اس نادری حکم کی تعمیل کی۔ اور چندہ سر سید کو دیدیا۔

سر سید کسطرح کام لیتے تھے

سر سید کو عام طور پر بزدل اور سرکار کا پٹھو فرض کیا گیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عوام ہند اکثر اپنے افسروں کے بنگلوں پر جا جا کر کام کیا کرتے ہیں لیکن سر سید کا حساب کچھ الٹا تھا کہ اپنے حکام بالا سے اپنے کام نکلوایا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ کہ مسٹی صاحب جج ایڈ لیفٹنل ایکدفعہ دلی میں آگئے۔ یہ ان سے ملے۔ اور بزور انکے آثار الصنادید کے ایک حصے کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ بلکہ سر سید نے سر آکلنڈ کالون گورنر یوپی سے بھی ایک انگریزی ترجمے میں مدد لیکر ان کا لکھا چھپا چھوڑا تھا۔

سر سید کی ہمہ گیر طبیعت اور ان کی مصروفیت

مولانا حالی نے سر سید کے تمام کارنامے ایک ضخیم جلد میں جمع کئے ہیں۔ ان سے پایا جاتا ہے۔ کہ سر سید ایک نہایت انتھک آدمی تھا۔ یعنی قوم کا ریفارمر تھا

مرد وہ قوم کا اسپیکر وہ تھا۔ لیکچرار وہ تھا۔ مضمون نگار وہ تھا۔ جرنلسٹ وہ تھا۔ مجتہد عصر وہ تھا۔ شاعر وہ تھا۔ فلاسفر وہ تھا۔ سنعوف وہ تھا۔ مصنف اور مولف وہ تھا۔ علیگڑھ کالج کا واحد انجینیر وہ تھا۔ پالیٹیشن وہ تھا۔ مولوی وہ تھا۔ دنیادار وہ تھا۔ دلی کی پرانی پارٹی کا نمائندہ وہ تھا۔ علیگڑھ کالج کی نئی پود کا لگانے والا وہ تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک زندہ دل حاضر طبیعت آدمی وہ تھا۔ جو قوم کی گئی گذری حالت پر روتا تھا۔ خوب آنسو بہاتا تھا۔ اسی لئے اسکے منہ سے گویا ہر وقت پھول جھڑتے رہتے تھے جو شخص ان کے پاس جاتا ہمیشہ خوش ہو کر آتا تھا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

سرسید سے انگریزوں کی جھڑپ

جو قوم کسی جگہ حکومت کرتی ہے۔ اس کے دماغ کا نشہ بہت کم اترتا ہے۔ بلکہ اترتا ہی نہیں۔ سرسید نے انگریزی راج کی تعریفوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا انگریزوں سے ملنے اور ان سے دوستی رکھنے کیلئے گردن مروڑی مرغی تک جائز سمجھی تھی۔ خود مولوی ہو کر کوٹ پتلون لگائے مارے مارے پھرتے تھے۔ اور ہر وقت انگریزی تعلیم اور انگریزوں کا کلمہ پڑھتے رہتے تھے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں

ایک دفعہ آگرہ میں سرکار کی طرف سے نمائش ہوئی۔ اعلیان سلطنت دور دور سے بلوائے گئے۔ جب دربار لگا۔ تو صدر کی اچھی اچھی جگہوں پر سب انگریز بٹھا دئے گئے۔ اور سرسید کو ان کے رفقا سمیت ایک نیچی لین میں بیٹھنے کا حکم ہوا۔ یہ ذلت آپنے گوارا نہ کی جس پر مسٹر پالک کلکٹر ضلع سے ان کی جھڑپ ہو گئی۔ کئی اور انگریزوں نے مسٹر پالک ہی کی حمایت کی۔ اور قومیت کے جوش میں بھر کر سرسید سے کہا۔ کہ تمہیں لوگ ہو جنہوں نے سن ستاون کا غدر بپا کیا تھا۔ اب چاہتے ہو کہ ہمارے ساتھ دربار میں کلہ بہ کلہ بیٹھو۔ اور ہماری لیڈیوں پر تانک جھانک لگاؤ۔ سرسید نے بات ٹوک کر کہا کہ اگر یہ غدر ہوا۔ تو تمہاری ہی ناعاقبت اندیشیوں اور تمہارے ایسے ہی صاحبوں کی اکڑفوں اور تحقیر کی وجہ سے ہوا تھا۔ اور میں دیکھتا ہوں۔ کہ وہ غرور اب تک تم میں باقی ہے غرض سرسید کی باتوں پر وہ آپے سے باہر انگریز کب کان دھرنے لگے تھے۔ ان سے بگڑ گئے۔ ادھر یہ بھی ہٹ کے پورے تھے۔ دربار سے اٹھ کر فوراً دلی کا ٹکٹ لیا۔ اور یہاں بے اجازت گھر چلے آئے۔ پھر کئی روز تک اسی جوابدہی کی مصیبت میں بھی مبتلا رہے۔ مسٹر کپلنگ نے کیا خوب کہا ہے کہ مشرق مشرق اور مغرب ہمیشہ مغرب ہی رہیگا۔

کیا۔ ہمکو برا بھلا کہنے والے اور کوسنے والے اب نہیں رہے ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا
ہے۔ کہ جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے ہیں۔ اور جب وہ چھیڑنے والے نہیں ہوتے۔ تو کہتی ہے
کیا آج بازار کے سب لونڈے مر گئے۔ (یہ فقرہ سرسید نے بعض پنچ اخباروں کے حق میں لکھا تھا
جو بہت زیادہ منہ کو آتے تھے)

پھر ایک اور جگہ لکھا ہے۔ کہ سرسید نے کسی دوست سے ذکر کیا۔ کہ سہارنپور میں ہمارے حال
پر ... ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا۔ کہ ہے تو کرستان۔ مگر ہماری کچھ بھلائی ہو گی۔ تو اسی کو کرستان
ہو گی۔ یہ اسی طرح کا واقعہ ہے۔ کہ کسی ایرانی سے پوچھا گیا۔ کہ صائب کا کلام کیسا ہے۔ اس
نے جواب دیا۔ کہ او قرمساق بسیار خوب گفتہ است۔

مسئلہ تعدد ازدواج

عیسائی لوگ مسلمانوں پر اکثر لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ کہ وہ ہماری طرح صرف
ایک میم صاحبہ پر گذارہ نہیں کرتے۔ اکثر ایک دو تین چار بی بیاں ایک
ساتھ گھر میں لے آتے ہیں۔ مگر عیسائیوں کی انجیل میں حضرت داؤد کی
سو بی بیاں لکھی ہیں۔ اور تخت سلیمان پر حضرت سلیمان کیساتھ کتنی پریاں ہوا میں اڑا کرتی تھیں۔ انکا
تو حد و شمار ہی نہیں ہے۔ ادھر حضرت عیسیٰ ایک بی بی کے نام سے بیزار تھے۔ غرض یہ افراط
و تفریط پیغمبر اسلام نے دور کی۔ اور کہا۔ کہ پچاس ساٹھ نہیں۔ اور نہ مارے عیسائیوں کی طرح دس
... صرف چار تک بی بیاں کر لو۔ مگر وہ بھی دیکھ بھال کر۔ کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اسلام میں اس مسئلہ کا حل
اس طرح سے کیا گیا ہے۔ مگر سرسید کی ستم ظریفی دیکھو۔ کہ فرماتے ہیں۔ جو تعدد ازدواج
... زمانے میں رائج ہے۔ اسکی یہ صورت ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی۔ دو دو تین تین
اور چار چار جوروئیں کرنے لگے۔ ایک بازار کی عورت کو دل پر چڑھا لیا۔ اور نکاح کر مارا۔ جہاں بڑے
... بزرگ مولوی ہوئے۔ فوراً اللہ میاں کے ساجھی بنے۔ اس مریدنی کو لے ڈالا۔ سو وہاں وعظ
... لگے۔ اور سنت نکاح ثانی کو جائز بتا۔ قرآن پڑھاتے پڑھاتے خطبۃ النکاح کا سبق پڑھانے لگے
اسی طرح ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ جو جاہلیت میں تھا۔ اسلام میں پیدا
... عورتوں کو کھنگالنا شروع کر دیا ہے۔ ان سب باتوں کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ
سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے۔

مولویانہ لطیفہ

جس زمانے میں سرسید ولایت میں تھے۔ ان کے پاس اخبار شعلۂ طور کا وہ پرچہ پہنچا جس میں لفنسٹن کے ترجمے کے حوالے سے سرسید پر مولوی امداد علی نے کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ اور لکھا تھا۔ کہ جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو۔ وہ کیسا جہنمی ہے۔ سرسید نے اس کے جواب میں لکھا۔ کہ دیکھو دشمنی انسان کو ایسا اندھا کر دیتی ہے۔ مولوی صاحب اس اخبار شعلۂ طور میں تاریخ مذکور کے مضمون کو آپ نقل کر کے فرماتے ہیں۔ کہ جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے حالانکہ خود بھی اسی عبارت کو لکھ چکے ہیں۔ اچھا تو پھر مجھ میں اور ان میں فرق ہے صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے اردو سے۔ اسی طرح کا ایک لطیفہ مشہور چلا آتا ہے۔ کہ امام مالک سے کسی نے پوچھا۔ کہ جو قرآن کو مخلوق کہے اسکی کیا سزا ہے۔ امام صاحب نے اسپر سائل کے قتل کئے جانیکا حکم صادر کیا۔ اسنے اعتراض کیا۔ کہ میں نے تو ایک کا قول نقل کیا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا۔ کہ ہم نے تو تیرے ہی منہ سے سنا ہے۔

مولوی سعد اللہ سے لطیفہ

مولوی سعد اللہ صاحب نواب واجد علیشاہ کے عہد میں ایک مفتی تھے ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی ایک مسجد کو گرا کر وہاں مندر بنانا چاہا تو اہل دربار کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا تھا۔ مگر ایک مولوی امیر علی راضی نہیں ہوتا تھا۔ اور بہت مخل ہوتا تھا۔ اسلئے مفتی سعد اللہ نے فتویٰ چلا کر اس غریب مولوی کو پھانسی پر چڑھوا دیا۔ عہد انگلشیہ میں سرسید کے مذہبی عقاید کی دھوم ہوئی۔ تو مفتی صاحب نے ان پر بھی قتل کئے جانیکا فتویٰ دیا۔ یہ سنکر سرسید کہنے لگے پہلے تو ہم حیران تھے۔ کہ یہ نئے مفتی صاحب کون پیدا ہوئے ہیں۔ مگر آخر خوب معلوم ہوا۔ یہ وہی مسلمانوں کے سچے دوست پرانے مفتی صاحب ہیں۔ جنہوں نے لکھنؤ میں کیسے نیک کنا(؟) آل رسول کو ناحق قتل کروایا تھا۔ اور اب ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ مگر آل رسول کا بیگناہ قتل کروانا تو مفتی سعد اللہ صاحب کا ایک مذہبی پیشہ ہے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

سر سید پر مکہ مدینہ سے فتوائے کفر

انہی دنوں میں ایک مولوی صاحب مسمی نبی بخش سر سید کی جان کے لاگو پیدا ہوئے
ان کی عداوت میں مکہ مدینہ تک حج کرنے کے بہانے سے گئے۔ اور مذاہب اربعہ کے چاروں
مفتیوں کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ کہ کیا فرماتے ہیں حامیان دین و فقہائے شرع متین
اس امر کے۔ کہ جو شخص ابلیس خبیث کے ظاہری وجود سے انکار کرتا ہو۔ اور کہتا ہو۔ کہ اس
سے مراد وہ قوت بہیمیہ ہے جو نفس انسان میں موجود ہے۔ اور سجدہ ملائکہ کا واسطے بابا آدم کے ایک امر حقیقی
نہیں بلکہ اس سے محض قویٰ کا مطیع ہونا مراد ہے۔ اور اسیطرح وہ شخص بہکایا گیا۔ یہ کہتا ہے۔
کہ افلاک یعنی یہ آٹھوں آسمان کوئی چیز نہیں ہیں۔ ان سے فضائے بسیط یا سبع سیارات
مراد ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ لونڈی غلام بنانا اب حرام ہو گیا ہے۔ اور لوگوں کو یہ بہکاتا
ہے۔ کہ معراج آنحضرت کو خواب میں ہوئی تھی۔ نہ کہ ساتھ جسم مبارک ان کے جسم کے
ساتھ اور انکار کرتا ہے۔ معجزہ شق القمر کے بھی۔ اور کہتا ہے۔ کہ گلا گھونٹی ہوئی مرغی حلال ہے
ایسے شخص کے باب میں کیا احکام شرعی ہے۔

استفسار پر مکہ معظمہ کے چاروں اماموں نے سر سید کے متعلق متفق اللفظ کہا۔ کہ وہ شخص ملحد
اور مضل ہے۔ بلکہ یہ شخص ابلیس لعین کا خلیفہ ہے۔ جو کہ دین و ایمان مسلمانوں کا اغوا کرتا ہے۔
اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ خدا اسکو سمجھے۔ واجب ہے اولوالامر
پر اس سے انتقام لینا۔ اسکو تنبیہ کرنی۔ پھر اگر باز آجائے تو بہتر ورنہ ضرب خفیف سے اسکی
تادیب کرنی چاہئے۔ بلکہ ان چاروں میں سے ایک مفتی صاحب تو یوں بول اٹھے۔ کہ اسکو قتل
کر دینا ہی اولیٰ تر ہے۔ دین کی حفاظت کیلئے۔

اسی طرح کے فتووں سے سر سید کو قتل کی دھمکیاں دی جاتی رہیں۔ مگر سر سید کسی طرح
اپنے مستقل ارادوں سے نہیں ہٹے۔ بلکہ الٹا مولوی امداد علی صاحب ہی نے مدرسہ کی امداد
کو سر سید سے استدعا کی۔ انہوں نے جواب دیا۔ اگر تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کر دو اور
باز آجاؤ۔ تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ یہ سنکر سید صاحب نے کہا۔ کہ ہمارے محب فاضل منشی چراغ علی

اشتائے سفر ہی ہیں اگر وہ بھی یہی کہیں۔ کہ ہم سے ہو جاؤ۔ تو ہم تمہارے شریک ہوں گے۔ تو پھر بتاؤ میں کیا کرونگا
وہی مثل ہوگی۔ کہ گوری کا جوبن بیلیوں سے ہی اٹھ گیا۔ امیر افغان کے عقوبت خانوں کا ایک مرتبہ
پر مسلمانوں کو سر سید نے ہمیشہ ملکر کام کرنے کی ہدایت کی۔ اور کہا۔ کہ کمبختو آپس میں تعصب کرنا
چھوڑ دو۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں۔ دولت میں کم ہیں۔ ثروت میں کم ہیں۔ عہدوں
میں کم ہیں۔ اور پھر اگر ان میں شیعہ سنی۔ مقلد غیر مقلد۔ ناجی۔ وہابی اور بدعتی کا تفرقہ پڑے۔ تو بجز اس
کے سب کے سب برباد اور غارت ہوں۔ اور کیا نتیجہ ہو گا۔

جس وقت سر سید کو آئے دن خفیہ خطوں میں قتل کی دھمکیاں ملتی تھیں۔ ایک شخص نے یہ بھی آپ
کو لکھا۔ کہ شیر علی افغان جس نے لارڈ میو کو تہ تیغ کیا تھا۔ اس نے حماقت کی تھی اگر وہ مجھکو مار دیتا
تو سیدھا بہشت میں جاتا۔ لہٰذا سر سید نے ایک ایسے ہی ارادہ کے ناکام ہونے پر فرمایا۔ کہ افسوس
آپ نے اس دینی بھائی مسلمان کو میرے قتل سے باز رکھا۔ یہ تو ہمارے بزرگوں کی میراث ہے۔ کہ
ایک مسلمان بھائی ہمیشہ مسلمان بھائی ہی کے ہاتھ سے قتل ہوا کرتا ہے۔

مضحک اقوال و کلماتِ سر سید

تہذیب الاخلاق میں سر سید نے ایک دفعہ لکھا۔ کہ حضرات ہماری تو
یہی مثل ہو گئی ہے۔ کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ از برادران دین
از بیگانگاں نفور۔ ایک گوشے میں پڑا ہوں۔ نزدیک و دور یگانہ و بیگانہ
سے لعن طعن سنتا ہوں۔ جسطرح غیر مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ برادران وطن بھی ماشاء اللہ اسی
متنفر ہیں۔ قصور یہ۔ کہ اپنی دانست میں مسلمان بھائیونکا بھلا چاہتا ہوں۔ ان کی عام رائے
کی مخالفت سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ جو بات ان کے بھلے کی ہو وہ کہتا ہوں۔ یہی ہی کمبخت خصلت
ہے جس نے مجھکو اس حال پہنچا دیا ہے۔

پھر ایک اور جگہ فرمایا ہے۔ کہ جب کبھی برائی نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے۔ تو اس نے منہ کی
کھائی ہے۔ پس اگر میرا کاروبار سچا ہے۔ اور میری نیت نیک ہے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں
بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ اور مجھے ضرور کامیابی ہوگی۔ سر سید سے کسی نے تعلیم نسواں کیطرف متوجہ
ہونے کو کہا۔ آپ نے جواب دیا۔ کہ کسی ملک میں بھی عورتوں کی تعلیم مردوں سے پہلے نہیں ہوئی
لہٰذا۔ پہلے مردوں کو تو اگریجویٹ ہو جانے دو۔ پھر عورتوں کو بھی گریجویٹ بنا لینا۔

ایک مقام پر بہشت کا کچھ ذکر ہو رہا تھا۔ سرسید نے کہا۔ کہ قرآن مجید میں جو بے مثل چیز ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ عالم اور جاہل کو اللہ میاں نے برابر خوش کر دیا ہے۔ جیسے بہشت کی نسبت ایک بڑے عالم کا خیال یہ ہے کہ۔ وہ ایسی جگہ نہیں ہے۔ جہاں سچ مچ کی حوریں اور خوبصورت غلمان ہونگے یا نہریں بہ رہی ہونگی۔ اور میوے عجیب و غریب درختوں پر لگے ہوئے ہونگے۔ بلکہ وہ محض ایک دائمی خوشی اور راحت کی جگہ ہوگی۔ جس کو ان نفسیات سے کچھ تعلق و واسطہ ہی نہیں ہوگا۔ گویا ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت ساری
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مگر ایک کوڑ مغز ملا یا شہوت پرست زاہد خیال کرتا ہے۔ کہ بہشت میں ان گنت حوریں ملینگی شرابیں تو ہم وہاں پئیں گے۔ میوے کھائینگے۔ دودھ اور شہد کی نہروں میں نہائینگے۔ اور نیز جو دل چاہیگا۔ مزے اڑائینگے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔ اور اس دنیا کی زندگی کے بعد ہر شخص معاد کا منتظر رہتا ہے۔ جو دین کی اصل بنیاد ہے۔

سرسید کی فصاحت و بلاغت

سرسید جس مضمون پر قلم اٹھاتے تھے۔ اسکو ایسا نبھاتے تھے۔ کہ ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ مثلاً تہذیب الاخلاق کے ایک آرٹیکل میں مسلمانوں کے کھانیکا طریقہ اسطرح بیان کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے کھانا کھانیکا بھی وہی طریقہ ہے۔ جو ہندوؤں کا۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں مسلمان دسترخوان بچھا کر کھانا کھاتے ہیں۔ جیسے ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی قابوں۔ رکابیوں۔ غوریوں۔ طشتریوں اور پیالیوں میں ہر قسم کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے اور اچار مربے کی پیالیاں۔ سیتلا کے پوجاپے کیطرح ایکساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں۔ اور ایک ہی دسترخوان پر کوئی فیرنی کلمہ شہادت کی انگلی سے اور کوئی (دست بخیر) چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے۔ کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ لگا کر زبان آبی سے اپنا ہاتھ ملا ہوا پنجہ مبارک پونچھکر اس روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے۔ کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ لگا کر سڑپا بھرا۔ اور یہ کہہ کر۔ واللہ مرچ بہت تیز ہے۔ اوہ۔ اوہ کرنا

جلدی کر دیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ غلیظ کھانا، چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے کچھ بڑے کچھ چھوٹے ٹکڑے۔ اور سالن میں کی نکلی ہوئی گٹھلیاں سب ان کے آگے رکھی ہوئی ہیں مہمان پہلے مانسوں میں سے جو شخص پہلے کھانا کھا چکا ہے سو وہ اب ہاتھ دھو رہا ہے۔ اور کھنکار کھنکار کر گلا صاف کر رہا ہے تاکہ سب کے سب سن پاویں۔ اور پھر وہ بیسن سے خوب مل کر اپنے دانت رگڑتا ہے۔ اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر اسکو صاف کرنا شروع کر دیتا ہے حالانکہ اور سب مسلمان بے تکلف پاس ہی کھانا کھا رہے ہیں۔ نہ انکو ان منہ ہاتھ دھونیوالوں کا خیال ہوتا ہے۔ اور نہ انکو جو منہ ہاتھ دھو رہے ہیں یہ احتیاط ہے۔ کہ ہم کھانا کھانیوالوں کے قریب ایسی ناشائستہ حرکتیں کرتے ہیں بلکہ دسترخوان پر کھانا کھانیوالوں کو بھی ان لوگوں کی آواز سنکر کراہت نہیں آتی۔ اور نہ ان کے منہ سے زرد زرد ہلدی ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھوک تھوک کر چلمچی یا تاش میں تھوکنے دینے اور تاشے کیطرح اس کے پانی پر تیرنے پھرنے کی پرواہ ہوتی ہے۔ نعوذ باللہ منہا!

نامہذب آدمیوں کی تکرار
اور سرسید کا اسلوب بیان

اس کا بیان سرسید نے یوں دکھایا ہے کہ جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں۔ تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا جبڑا کھلتا ہے۔ اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور حلق سے آواز نکلنا شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں۔ اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتی ہے۔ اور عجیب آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اسکی ٹانگ اسکی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منہ میں۔ اور اسکا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اسکو کاٹا اور اس نے اسکو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا وہ دم دبا کر بھاگ نکلا۔

غرض نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار شروع ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کرکے

آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت ہوتی ہے۔ ایک شخص کوئی بات کرتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے۔ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ پھر وہ بولتا ہے۔ تم کیا جانو۔ بیدال کے بودم! دونوں کی نگاہ جھٹ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں کچھ ڈراؤنی سی ہونے لگتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک منہ سے اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی جلدی چلنے لگتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ۔ ناک۔ بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عفیف عفیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا۔ ہاتھ پھیلا۔ اسکی گردن اسکے ہاتھ میں اور اسکی ڈاڑھی اسکی مٹھی میں۔ لپا ڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا۔ تو غرّاتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا۔ اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنیوالا نہ ہوا۔ تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سہلاتے اپنی راہ لی۔ جس قدر تہذیب ترقی کرتی ہے۔ اس قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے کہیں آنکھیں بدلنے۔ ناک چڑھانے یا جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے مگر ان سب باتوں میں کتوں کی سی مجلس کا اثر ضرور پایا جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو لازم ہے۔ کہ اپنے دوستوں سے کتوں کیطرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

مسکرات سے پرہیز } سرسید نے شراب اور ہر قسم کے مسکرات سے تمام عمر پرہیز کیا تھا۔ لیکن ان کے ایک بیٹے سید محمود نے قریباً تمام عمر شراب نوشی کی ایک دفعہ سرسید سخت بیمار ہوئے۔ تو ڈاکٹر نے ان کی کمزوری جسم دور کرنے کو کوئی ہلکی سی شراب بطور ٹانک تجویز کی۔ مگر انہوں نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔ اور مومن کا یہ شعر پڑھا ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں ہم خاک مسلماں ہونگے۔

سیّد الاخبار } سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں تھے۔ جن کا کچھ حال اوپر قلمبند ہو چکا ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو حیاتِ جاوید صفحات ۲۹۷-۳۰۹) کہ سید احمد خاں بالعموم سید کہلاتے تھے۔ اور پچیس برس کے سال کی ہو گی۔ جبکہ ان کے نام کی رعایت سے ان کے بڑے بھائی پکارا لیا تھا۔ اب ہر جگہ

جاری کیا تھا۔ چونکہ سر سید کی ولادت ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ سید الاخبار ۱۸۳۷ء یا ۱۸۴۲ء
میں شایع ہوا ہوگا۔ یا زیادہ سے زیادہ ۱۸۳۶ء سے کچھ پیشتر اس کا پہلا پرچہ نکل چکا ہوگا۔ اب
تذکرۂ آبحیات۔ (صفحہ ۲۳) میں مولوی محمد حسین آزاد مرحوم ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ ان کے
والد مولوی محمد باقر نے اردو زبان کا پہلا اخبار ۱۸۳۶ء میں جاری کیا تھا۔ لیکن اس بات کا
فیصلہ۔ کہ حالی کا قول صحیح ہے۔ یا آزاد کا (اس امر کی نسبت کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار
کس نے دلی میں نکالا تھا) ہم ان مصنفین کی پاک روحوں کے صدقے یہاں نظر انداز کرتے ہیں
غالباً آنیوالی دنیا میں وہ جب ہم سے ملیں گے۔ تو اس امر کے صحیح فیصلے سے ہم کو ضرور مطلع کر دینگے
تاہم میری دانست میں حالی صاحب حق بجانب ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

لطیفہ سر سید عموماً فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس میں ریلوے کا سفر کیا کرتے تھے۔ اور
ایک نفیس غذا کھاتے۔ عمدہ لباس پہنتے۔ اور اچھے بنگلے میں رہا کرتے تھے۔ کیونکہ
وہ اس مسئلہ کے معتقد تھے۔ کہ اسلام ہمیں خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے متمتع ہونے
کی ہدایت کرتا ہے۔ نہ کہ رہبانیت کی۔ (جیسے کہ گاندھی تیسرے درجہ کی ریل گاڑی میں سفر کرتے
ہیں۔ یا کہ دیانند سرسوتی لنگوٹی پہنے بیٹھے رہا کرتے تھے) غرض سر سید حسب معمول ریل کے
اعلیٰ کمرے میں بیٹھے تھے۔ بعض جنٹلمینوں میں سر سید کی نسبت گفتگو ہونے لگی۔ ایک
صاحب تو دیر تک سر سید کے الحاد۔ بیدینی اور ان کی اجتہادی کوششوں کی لغویت سب پر
واضح کرتے رہے۔ اور سر سید چپکے چپکے یہ باتیں سنتے رہے۔ مگر وہ صاحب جب ریل سے اترنے
لگے۔ تو سر سید سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ کہ جناب کا اسم مبارک۔ آپ نے جواب دیا۔ کہ وہی
ننگ قوم جس کی شان میں آپ نے اتنا کچھ ابھی کہا ہے۔ یعنی سر سید۔ یہ سنکر وہ صاحب اسقدر
شرمندہ ہوئے۔ کہ گویا گھڑوں پانی پڑ گیا ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

لطیفہ سر سید جب ۱۸۹۸ء میں وفات پا گئے۔ تو اس زمانے میں مجھکو بھی علیگڈھ کالج
کی ایف۔ اے کلاس میں داخل ہونیکا اتفاق ہوا۔ یہ وہ وقت تھا۔ کہ مسٹر ماریسن صاحب
[illegible] ہی پڑہایا کرتے تھے کچھ وقت اس کالج میں گذرا ہوگا۔ کہ ایک

معقول سرکاری ملازمت ملنے کیوجہ سے علیگڈھ کالج کو چھوڑنا پڑا۔ میں جب تک وہاں رہا۔ طلباء میں سرسید کی نسبت یا ان کے مذہبی اور ذاتی خیالات کے متعلق اور خصوصاً ان کے نیچری اعتقادات کی بابت دیر تک بحثیں ہوا کرتی تھیں چنانچہ ایک دن ایک لڑکے نے یہ لطیفہ کہا۔ کہ جہاں یہ کالج اب بنا ہے۔ یہاں پہلے بالکل جنگل تھا۔ اور ایک چھوٹی سی پہاڑی واقع تھی۔ جب سرسید نے یہ جگہ سرکار سے خرید لی۔ تو بہت عرصہ تک اسمیں سانپ نکلتے رہے۔ سرسید نے لڑکوں کو فی سانپ دو چار آنے انعام مقرر کرکے سانپ مروانے شروع کئے۔ لیکن سرسید کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھاکر لڑکے یہ شرارت کیا کرتے تھے۔ کہ ایک سانپ کو مار کر پہلے ایک لڑکا سرسید سے انعام لے لیتا تھا پھر دوسرا اور شاید تیسرا لڑکا اسی سانپ کا سر اور دم یا بدن کا کوئی اور حصہ قطع کرکے اور اسکی ظاہری حالت کو تبدیل کرکے اس سانپ کو سرسید کے سامنے لیجاتا تھا۔ اور انعام پاتا تھا۔ گویا ایک ہی سانپ مار کر لڑکے دو دو تین تین مرتبہ اسکی اجرت حاصل کرلیتے تھے۔ اس قسم کے لطائف سرسید کے متعلق اس زمانے میں بہت عام تھے۔ مگر اب وہ باتیں ہی خواب و خیال ہوگئیں؟

مسئلہ خلافت ایک اثنا عشری سرسید کے پاس پہنچے۔ پہلے مذہب تشیع کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ جسکو سرسید چپکے سنتے رہے۔ متکلم نے خیال کیا کہ یہاں کچھ پانی مرتا ہے۔ مخاطب سے دریافت کیا کہ حضرت جس وقت صحابہ میں خلافت کا جھگڑا اٹھا تھا۔ اگر آپ وہاں ہوتے تو کس کی خلافت کی تائید کرتے۔ سرسید نے معاً کہا۔ کہ مجھے کسی کی خلافت سے کیا مطلب۔ میں اگر وہاں ہوتا۔ تو اپنی ہی خلافت کا ڈہلہ بجاتا۔ اور سو بسوے کامیاب ہوتا۔ یہ سن کر وہ اثنا عشری صاحب فوراً وہاں سے چلے

اتفاق ہندو و مسلم مسلمانوں اور ہندوؤں کے آپس میں باتفاق رہنے کے متعلق سرسید کا قول ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے میرے دوستو! بارہا کہا ہے۔ اور پھر کہتا ہوں۔ کہ ہندوستان ایک دلہن کی ما
جسکی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس
تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائیگی۔ اور اگر ایکدوسرے کو بربا

..ا اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو۔ اب تم کو اختیار ہے۔ کہ اپنے وطن کی ..ں کو چاہے بھینگا بناؤ۔ یا کانڑا؟

..سید کا ..ادر مضمون

مولینا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں۔ کہ سرسید کے ہزاروں چٹکلے ان کی پبلک اور پرائیویٹ تحریروں میں ایسے ملتے ہیں۔ کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ لطائف وظرائف مرتب ہو سکتا ہے گویا سرسید بچپن ..ڑھاپے تک شوخ طبعی اور مزاح و مذاق کے خوگر رہے۔ اگرچہ ان کا تہذیب الاخلاق ..اعلیٰ درجہ کا اصلاحی اور ادبی پرچہ تھا مگر جب تیسری مرتبہ بند ہو ہو کر جاری ہوا۔ تو اس کی سرسید نے اسطرح اٹھائی تھی کہ گو ہمارا دل کب ہی ٹوٹا ہوا ہو۔ مگر امید ہے۔ کہ اب کا ..یب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا نہ ہو گا۔ تو برا بھی نہ ہو گا۔ اور اگر وہ مکاتب دلچسپ بھی رسالہ ..یب الاخلاق میں چھپنے لگیں۔ جو ہم میں اور نواب محسن الملک میں بعض مذہبی مسائل کی نسبت ..ے ہیں۔ اور جن سے قصہ آدم یاد آجائیگا۔ اور کبھی سید احمد کو حکم ملیگا۔ کہ مہدی علی ..کرو۔ اور کبھی مہدی علی کو حکم ہو گا۔ کہ سید احمد کو سجدہ کرو۔ تب تو تہذیب الاخلاق نہایت ..یب ہو جائیگا۔ اور خدا نہ کرے۔ کہ ان دونوں میں سے کوئی یہ کہے۔ کہ خلقتنی من نار و ..ہ من طین ؂

..ائیں اچھی ہو .. خط اچھا ہوا

حافظ عبدالرحمان صاحب ۲۸ برس سرسید کے رفیق رہے۔ وہ سرکاری ملازم تھے۔ مگر قلت تنخواہ کیوجہ سے سرسید کیساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ ..ان سے اکثر ہنسی چہل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حافظ جی اپنی ترقی ..سرسید سے کہا کرتے تھے۔ مگر چونکہ اس کی گنجائش نہ تھی۔ وہ باتوں ہی باتوں میں ٹالدیا ..تے۔ ایک دفعہ بہت اصرار کیا۔ تو کہا تمہارا خط اچھا نہیں ہے۔ اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ..رت آدمی ہو۔ اور بدصورت آدمی کبھی خوشنویس نہیں ہوتا۔ اسپر حافظ جی نے کہا۔ پھر آپکا ..اچھا نہیں۔ سرسید نے جواب میں کہا۔ کہ میرے گلے کی رسولی نے میری صورت بگاڑ دی .. ..ہوں۔ اور میرا خط بھی کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ کچھ دنوں بعد ا ہی .. ..اگر تم بادشاہ ہو جاؤ۔ تو مجھے کیا عہدہ دوگے۔

حافظ جی نے سرسید کا سلوک اپنے ساتھ یاد کرکے جواب دیا - کہ میں آپکی بڑی خاطر کروں - دونوں وقت آپکو کھانا کھلاؤں - سوتے وقت اپنے پلنگ کے برابر آپکا پلنگ بچھواؤں - اور چنپی کروں پاؤں چاپا کروں - سرسید نے کہا - کہ خیر یہ باتیں جانیدو - صاف بتاؤ - کہ مجھکو عہدہ کیا ملیگا - حافظ جی ذرا رونی صورت بنا کر کہا - کہ حضرت میں مجبور ہوں چونکہ آپکا خط اچھا نہیں ہے - اس لئے کوئی عہدہ آپکو نہیں دے سکوں گا - مولانا حالی فرماتے ہیں - کہ یہ گرم فقرہ سنکر سرسید اور ہم سب پھڑک گئے - اور بہت دیر تک ہنستے رہے -

راقم اوراق جب ان سب باتوں کو ان بزرگوں کی تصانیف میں لکھا ہوا دیکھتا ہے - تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں - آہ ہمارے یہ واجب التعظیم بزرگ کیسے زندہ دل اور شوخ طبع تھے - ادھر آجکل کے قوم کے نوجوانوں کی سوسائٹی میں اوّل تو بے تکلفی ہی مفقود ہے - جس نہ انگریزی نہ فارسی نہ عربی نہ کسی زبان پر کماحقہ دسترس حاصل نہیں ہے - یہ اگر لطیفہ گوئی کریں تو کونسی لیاقت بروئے کار لائیں لہٰذا ان نوجوانوں کی مردہ دلی اور عام افسردگی پر سخت افسوس ہے کہ رہ جانا پڑتا ہے - اور مولانا حالی کا یہ شعر زبان پر خود آ جاتا ہے ؎

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

یوں تو سرسید کی کوئی بات لطائف وظرائف سے کبھی خالی نہیں ہوتی تھی - جیسے کہ اوپر پڑھ چکا ہے - مگر ان کا سب سے مشہور لطیفہ زبان عربی کے ایک خاص محاورہ اول لفظ "انشاء اللہ" سے متعلق ہے جسکو بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے - اسمیں وہ تمام شرعی حیلے جو فقہ کے فتاووں میں یار لوگوں کو گناہ سے بچانے یا گناہ کے ارتکاب میں دلیر کرنے کیلئے لکھے گئے ہیں - ان کی سرسید نے پیٹ بھر کے مذمت کی ہے پہلے اس لطیفہ کو اخبار وکیل کیطرف سے کتابی صورت میں چھاپا گیا تھا - اب ہر جگہ طبع ہوتا ہے

فی الحقیقت یہ بہت ہی سبق آموز لطیفہ ہے۔

ضمیمہ اوّل
لطیفہ انشاء اللہ

کافر۔ کافر! کیوں حضرت۔ کافر کیوں!

تم نے کیا کہا! میں نے کہا۔ اَنَا مُؤمِنٌ انشاء اللہ؟

کافر کافر۔ یوں کہو "اَنَا مُؤمِنٌ حَقًّا" اس جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے۔ ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے

پھر حضرت کس جگہ پر کہتے ہیں۔

قسم سے بچنے وعدہ پورا نہ کرنے۔ بیگناہ کو دھوکا دینے۔ جھوٹ بولنے۔ اور جھوٹا نہ ہونے میں۔

حضرت۔ پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے۔ کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلہ پر ہے۔

ہاں۔ جو پرہیزگار مولوی۔ عالم۔ شرع پر چلنے والے ہیں گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی پر خیال رکھتے ہیں۔

حضرت۔ میں تو نہیں سمجھا؟

فقہ پڑھی ہو۔ اصولِ فقہ جانا ہو۔ عالموں کی صحبت اٹھائی ہو۔ تو جانو۔ جاہل کندۂ ناتراش۔ نہ پڑھے نہ لکھے۔ جانو تو کیا جانو؟ اور نام بھی فاضل

حضرت آپ ہی سمجھا دیجئے!

ارے میاں۔ اِن کے معنی تو اگر۔ شاء کے معنی چاہا۔ اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی۔ مگر وہ فاعل واقع ہوا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ کہ ہوتے ہیں۔ اب سب کو ملاؤ تو یہ معنی ہوئے "اگر چاہا اللہ نے" اب دو مسئلے فقہ کے اور سمجھ لو۔ اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو۔ اور بسبب نہ پورا ہونے شرط کے ادا نہ کیا جائے۔ تو پھر گناہ لازم نہیں آتا۔ "اذا فات الشرط فات المشروط" ایک مسئلہ ہوا دوسرا مسئلہ یہ ہے۔ کہ خالق جمیع افعال عباد کا خدا ہے۔ پس جب ان دونوں مسئلوں کو ملا کر انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو پھر انشاء اللہ کہنے کے بعد کچھ گناہ لازم نہیں آتا۔

حضرت میں مسئلے تو خوب سمجھ گیا۔ مگر اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا۔ کہ گناہ کیونکر نہیں آتا۔

بابا دو لفظوں کے الٹ پھیر سے الٹ جاتا ہے۔

۔۔ مثنوی شریف میں بھی ایک حکایت لفظ انشاء اللہ کے متعلق قابل دید ہے۔

جاہل۔ اور کیا نہیں ہماری جیب میں ایک گھڑی ہے۔ ہمارے دوست کو اسکی ضرورت ہے۔ جب اس نے ہم سے مانگی۔ ہم نے کہا۔ کہ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں۔ اس نے کہا قسم تو کھاؤ۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں کوئی گھڑی نہیں۔ ہمارے گھر میں ایک اشرفی رکھی ہے۔ ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی۔ ہم نے کہا۔ کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔ اس نے کہا قسم تو کھاؤ۔ ہمنے کہا۔ کہ خدا کی قسم ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔ کیوں اسچ بات ہے۔ کہ نہیں۔ بات ہی بات میں گناہ الٹ گیا۔ خیر یہ تو باتیں ہی باتیں ہوئیں روپئے پیسے سود بٹے کے معاملہ میں بھی لفظوں ہی کے الٹ پھیر سے گناہ الٹ جاتا ہے۔ تولہ بھر سونا ہم سے سولہ روپیہ کی بنسبت کا قرض لو۔ سود سے بچنے کو کہہ لو۔ بیس تولہ چاندی لینگے۔ سولہ تولہ چاندی میں وہی تولہ بھر سونا آیا۔ اور چار تولہ چاندی سود میں بچ رہی۔ اور سود نہ ہوا۔ کھوٹا سونا جسمیں ذرا سا تانبے کا میل ہو۔ قرض دو۔ اور اسی وزن کے برابر کھرا سونا لے لو۔ مال تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا۔ اور سود نہ ہوا۔ مکان گروی رکھو۔ راہن سے کہلوا لو۔ کہ سکونت میں نے دیکی۔ کرایہ کا فائدہ ہوا۔ اور سود نہ ہوا۔ گاؤں گروی لو۔ مثلاً ہزار روپیہ سال دینے کے اقرار پر پٹا لکھوا لو۔ اور گاؤں پر قبضہ کر لو۔ کل منافع تحصیل کرو۔ ایک سو بیس روپیہ سال سود کے پٹے کے نام سے لیجئے کہ نہیں۔ اور سود نہ ہوا؟

حضرت! کیا یوں ہوتا ہے۔

خدا کی قسم سب کرتے ہیں۔ جتنے مقدس۔ خدا پرست۔ دہابی۔ نیم وہابی۔ مقلد حنفی۔ زمیندار۔ تعلقدار ہیں سب کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مولویوں نے فتوے دیدئے ہیں۔ کیا آپ سمجھے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے گناہ پلٹ گیا۔ کہ نہیں۔ اسیطرح ہمارے پاس کوئی زکوٰۃ کا روپیہ لا دے۔ اور ہم منتطیع ہوں۔ ابھی گھر میں جا کر بیوی سے کہہ آئیں۔ کہ ہم نے اپنا کل مال تمکو ہبہ کیا۔ اب ہم مفلس ہو گئے۔ کہ نہیں اسبات میں کیا ہرج ہیں۔ اور زکوٰۃ کا روپیہ لے لیں۔ باتیں ہی تو ہیں۔ ان باریکیوں کے سمجھنے کیلئے علم درکار ہے۔

بھلا حضرت یہ تو ہوا۔ انشاء اللہ والی بات رہ گئی۔ اُس کو بھی کسی مثال سے سمجھا دو۔

ارے میاں۔ یوں سمجھو کہ ہمنے تمہارا دل خوش کرنے کو تم سے کہدیا۔ کہ ہم کل تمہارے ہاں آوینگے انشاء اللہ لیکن ہمارا ارادہ آنے ولنے کا کچھ نہ تھا۔ یونہی کہدیا تھا۔ جب نہ گئے۔ تو معلوم ہؤا۔ کہ خدا نے نہیں چاہا۔ الحمدللہ اس وعدہ کو مشروط کیا تھا۔ "اذا فات الشرط فات المشروط"۔ بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا۔ کبھی تم عدالت میں گواہی دینے بھی گئے ہو۔

ہاں صاحب۔ ایک دفعہ گیا تھا۔ میں نے تو جو سچ تھا۔ وہ کہدیا تھا۔ مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا میں کیا کرتا۔ سو ہاں ایک کالی مخمل کی گول چپٹ دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے قسم دی کہ سچ کہنا۔ میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا۔ اور سچ سچ کہدیا۔

ہاں فقہ نہ جاننے سے عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے یہی تو نتیجہ ہوتا ہے۔ ارے میاں جب اس مولوی جج نے قسم دلائی تھی۔ کہ سچ بولنا۔ تو نے کہا ہوتا۔ کہ خدا کی قسم سچ بولونگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ جج نام کا مولوی تھا۔ اور فقہ نہ جانتا تھا۔ تو تو پکار ہی کر انشاء اللہ کہدیا ہوتا۔ اور اگر وہ مولوی تھا اور ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں آن پڑی تھی۔ تو پکار کر کہدیا ہوتا۔ کہ خدا کی قسم سچ بولونگا اور جھٹ پٹ دل میں کہہ لیا ہوتا۔ انشاء اللہ۔ مگر یہ خیال دل میں رکھا ہوتا۔ کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے۔ ورنہ انشاء اللہ کا جوڑ ٹوٹ جاتا۔ پھر جو چاہتے۔ وہ کہدیتے۔ ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا

حضرت یہ باتیں سب آپ نے خوب بتائیں۔ مگر میں تو حیرت میں ہو گیا۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ اور کسی سے بھی تحقیق کرونگا میرا دل دھڑ پکڑ کر رہا ہے۔

ہاں جس مولوی سے چاہنا پوچھنا۔ یہی بتا دیگا۔ کہو۔ میں ابھی ہدایہ۔ شرح وقایہ۔ در مختار بحر الرائق۔ نہر الفائق۔ اور بڑے بڑے فتاووں سے ہر ایک جزئے کی روایت نکال دوں اور تم نے وہ فتاوے بھی دیکھا ہے۔ جو ان تلاسود خاندانی مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے میں اسوقت اس کا نام بھول گیا ہوں۔ پھر بتا دونگا۔ اس میں ہر ایک مسئلہ کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں۔ ایک میں جایز حلال اور دوسرے میں ناجائز حرام لکھ رکھا ہے۔ پھر جونسی روایت کے مطابق چاہا فتوے لے لیا بہت ہؤا۔ یہ دو نہ یہ فتوے کے نام سے ہیں۔ ا

کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ بات کی بات میں گناہ پلٹ جاتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں جو کمبخت متقدمین کا فلسفہ ملاحدہ نکلے ہیں۔ وہ تو مذہب اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیا مشکل پڑی ہے۔ تھوڑی دور چلے تھے۔ کہ ایک پیر مرد متبرک صورت سفید ریش سے ملے۔ جانا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں۔ پکار کر کہنے لگے۔ کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ انہوں نے کہا۔ کہ بھائی نہ میں مولوی ہوں اور نہ مولوی کی دم۔ مجھ سے اور مذہبی مسئلوں کے پوچھنے سے کیا واسطہ؟ کسی مولوی صاحب سے جا کر پوچھو۔ اسی شہر میں بہت سے مولوی ہیں۔ یہاں سے دس بارہ کوس پر نامی نامی قصبے ہیں۔ وہاں مولویوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں۔ وہاں جا کر پوچھو!

نہیں حضرت! میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپکا نام بھی تو مشہور ہے۔

ارے میاں! شیطان کا نام تو مجھ سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ ابھی ویسی شہرت تو مجھکو ہوئی بھی نہیں۔ میں نیچری مشہور ہوں۔ مولوی ملا نہیں ہوں۔ مجھ سے مت پوچھو۔

حضرت! اگر مولویوں ملاؤں سے دل کی تسکین ہوتی۔ تو آپ تک کیوں آتے۔ جب دل ہی کو تشفی نہ ہو۔ تو مولوی ملاؤں کو کیا کریں۔ پھر آپ نیچری ہوں یا نیچری سب سے پوچھے تو دل مانتا نہیں۔ خدا کیواسطے بتا ہی دو؟

اچھا صاحب! پوچھو۔ کیا پوچھتے ہو۔ مگر میں کسی فتاوے وتاوے کو نہیں جانتا۔ خدا کی کتاب اور خدا کے فتاوے کو جو سب کی آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ جانتا ہوں۔ جو کہونگا اسی سے کہونگا۔ بہت اچھا۔ آپ اسی سے فرمایئے گا۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ کو جانتے ہیں۔

خوب جانتا ہوں۔ ہماری دلی کے رہنے والے تھے۔ بڑے شاعر تھے۔ شوخ مزاج میں ظرافت تھی۔ اُن کے یہ اشعار مجھے یاد ہیں۔ پہلے مصرع میں شاید کچھ لفظ ادل بدل ہو گئے ہیں ؎

مولوی کہتے ہیں ہمکو تو نے کیوں رسوا کیا — کیا گنہ کیا جرم کیا تقصیر ہم نے کیا کیا
واسطہ باعث سبب موجب جہت کچھ بات بھی — راز وہ کہہ [illegible] لیا تھا میں نے جو افشا کیا
کیا کہا کس سے کہا کس نے سنا کب کس گھڑی — کس جگہ اسوقت کس دم آپکا پیر پا کیا

حضرت! میں آپ سے انشاء اللہ خاں شاعر کا حال نہیں پوچھتا۔ انشاء اللہ کے لفظ کی نسبت

حکم شرع کا پوچھتا ہوں۔ کہ کس مراد اور کس مطلب سے اور کس مقام پر اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ کہو۔ ذرا مجھکو خدائی افتاد سے نیچر دیکھ لینے دو۔ اس میں تو یہ لکھا ہے۔ کہ تم کو کسی کام کی نسبت یہ نہ کہنا چاہیے۔ کہ میں کل کرونگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے۔ کہ اگر خدا چاہے۔ تو میں کل کرونگا۔ خدا بسبب علۃ العلل ہونے کے ہر کام کو خواہ انسان کرے یا حیوان۔ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسلیئے انسان کو بھی لازم ہے۔ کہ ہر چیز کو خدا سے متعلق کرے۔ پس جس بات پر انشاء اللہ کا لفظ کہا جاتا ہے۔ تو انشاء اللہ کے لفظ سے اس بات پر تعلیق ہوتی ہے۔ اور وعدہ کو استحکام ہوتا ہے۔ سننے والیکو کامل یقین ہوجاتا ہے۔ کہ وعدہ کرنیوالے نے خدا پر اس وعدہ کی تعلیق کی ہے۔ تو ضرور اس کو پورا کریگا۔ اگر تم نے کسی سے وعدہ کیا۔ کہ میں کل تمہارے گھر آؤنگا۔ اور اس کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا۔ اور نہیں گئے۔ تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوا۔ اور اگر اس کے ساتھ انشاء اللہ بھی کہا۔ اور پھر نہ گئے۔ تو تین گناہ ہوئے۔ ایک وعدہ خلافی کا۔ دوسرا اس بات کا۔ کہ جس سے وعدہ کیا تھا۔ اسکو وعدہ پورا کرنے کا زیادہ یقین دلایا۔ اور وعدہ پورا نہ کیا۔ تیسرا اس بات کا۔ کہ خدا کو ضامن دیا۔ اور اس کے نام کی عزت کا بھی کچھ ادب نہ کیا۔ اگر کسی بات پر قسم کھا کر انشاء اللہ کہا ہو۔ تو قسم توڑنے پر گناہ سے نہیں بچتے۔ بلکہ دوگنا گناہ ہوتا ہے۔ قسم توڑنے کا خدا کیساتھ تعلیق کر کر اسکا ادب نہ کرنے کا۔ جب قسم کھائی۔ کہ سچ کہونگا اور ظاہر میں یا دل میں انشاء اللہ کہہ لیا۔ اور پھر جھوٹ بولے۔ تو تین گناہ ہوئے۔ جھوٹ بولنے کا۔ قسم توڑنے کا۔ خدا پر تعلیق کر کے اس کا ادب نہ کرنیکا۔ جس بات کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ جب مصمم اور نہایت مضبوطی اور سچی نیت سے اس کو پورا کرنیکا ارادہ ہوتا ہے۔ اسوقت اس کیساتھ انشاء اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تم نے ایک مولوی سے کہا۔ کہ میں تمکو انشاء اللہ دس روپیہ دونگا۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے۔ ضرور بیشک تمکو دس روپیہ دونگا؟

حضرت! اپنے وعدوں کی نسبت تو مولوی بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ یہ وعدہ نفلی نہیں ہے۔ بلکہ بحکم نصوص صریحہ مثل زکوٰۃ اور نذر معین کے واجب ہوجاتا ہے۔ مگر اور جگہ کہتے ہیں۔ کہ نہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے۔ اور نہ قسم توڑنے کا اور انشاء اللہ کو ایک ایسا سپر بتاتے ہیں۔ جو ہر ایک حرب سے بچا لیتی ہے۔ حضرت! خدا مدد سے یا چھوڑ سے ان مولویوں نے جو اسلام بنا رکھا ہے۔ اگر وہی اسلام ہے۔ تو نیچری اسلام اس سے بہتر ہی اچھا جو سچائی کو اسلام بتاتے ہیں؟

(نوٹ از مصنف حیاتِ جاوید)

(بحوالہ صفحہ ۱۸ سطر ۳ و ۱۵)

ل یہاں تک تو مولوی صاحب اور اس جاہل مخاطب کی گفتگو تھی۔ اس کے بعد گویا آرٹیکل لکھنے والا لکھتا ہے کہ اس جاہل کا مقابلہ راہ بین نیچریوں کے کسی سرگروہ سے ہو گیا پھر ان دونوں کے سوال جواب ہیں ۲ خدا کے فتاوے سے مراد فطرتِ انسانی ہے جس میں حسن و قبح اشیاء کا علم ودیعت کیا گیا ہے۔ اور جس کی طرف مخبر صادق نے اس حدیث میں اشارہ کیا ہے۔ کہ اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَلَوْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْن اور جو لوگ اس فتاوے کے موافق عمل کرتے ہیں۔ وہ مفتیوں کے فتووں سے مستغنی ہیں چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے۔ کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے پاس ایک موضع گروی تھا۔ بہت مدت کے بعد مالک نے اس کو چھڑانا چاہا۔ ہر چند کہ رہن نامہ میں تمام منافع موضع مرہونہ کا مرتہن کو معاف و مباح کر دیا گیا تھا۔ اور فک رہن کے وقت مالک بخوشی کل زر رہن ادا کرنا چاہتا تھا۔ اور مفتیوں نے بھی اباحت کا فتویٰ دیدیا تھا مگر اس مرحوم مغفور نے یہی حدیث پڑھی۔ کہ اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَلَوْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْن۔ اور جسقدر محاصل اس موضع سے وصول ہوا تھا۔ سب زر رہن میں سے مجرا دیکر باقی روپیہ راہن سے لے لیا؟

"ضمیمہ دوم"

سرسید کی فارسی نظم کا نمونہ

جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ انکی دلی محبت کا اظہار ہوتا ہے ؎

خدا دارم دلِ بریاں ز عشقِ مصطفےٰ دارم + ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم + ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم۔

مگر سرسید کا ایک اردو شعر کتاب ہذا میں اوپر درج ہو چکا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں

غرض سرسید مولوی تھے اور ان کی شاعری بھی مولویانہ تھی۔

ضمیمہ پنجم

میجر جنرل جی۔ ایف آئی گریہم صاحب کی حیات سر سید

میجر موصوف نے جبکہ وہ کپتان کے عہدہ پر فائز تھے۔ اور سر سید کے گاڑھے دوست تھے۔ ایک انگریزی بیوگرافی دی لائف اینڈ ورکس آف سر سید احمد خاں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ تالیف کی۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔ کہ سر سید کا دادا دلی میں اکبر ثانی کا وزیر تھا۔ بادشاہ جب تخت پر بیٹھا کرتا۔ تو یہ اُس کے سامنے جریب ٹیک کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ پاس ہی اس کے جنرل اخترونی صاحب بھی جریب ٹیک کر بادشاہ کے حضور میں کھڑا رہتا تھا۔ سر سید کے دادا کا پورا نام اور خطاب مختصراً یہ تھا۔ نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین خان بہادر ملقب بہ مصلح جنگ۔ اس کا پوتا سر سید احمد خاں جب چھ سال کا ہوا۔ تو ایک دن جنرل صاحب موصوف ان کے گھر آئے۔ مگر یہ ایک فرنگی صاحب کی شکل دیکھ کر جھجک گیا۔ لڑکا تو تھا ہی۔ واپس لوٹنے لگا۔ لیکن جنرل صاحب نے اسکو پکڑ کر اپنے زانو پر بٹھا لیا۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اب سر سید کا خوف بالکل جاتا رہا۔ اور اس نے صاحب بہادر سے سوال کیا۔ کہ آپ کی ٹوپی میں پر کس واسطے لگائے گئے ہیں۔ کیونکہ فوجی افسروں کی ٹوپیوں میں کبھی کبھی پر ہوا کرتے ہیں۔ پھر یہ دریافت کیا۔ کہ آپ کے کوٹ میں اتنے سونے کے بٹن کیوں لگائے گئے ہیں۔ مگر جنرل صاحب نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ سر سید بھی چپ ہو گیا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ سر سید بچپن ہی سے فرنگیوں کا ادا شناس تھا۔ بقول اکبر ؎

تم انگریزی داں ہو وہ انگریز داں تھا

یہ امر تعجب ہے۔ کہ سر سید کی لائیف کو ۱۸۸۵ء میں شایع کر کے پہلے پہل گرہیم نے اُسکو جارلیس ایلیٹ کی نذر کیا۔ پھر اسی کتاب کو جبکہ وہ میجر ہوئے سنہ ۱۹۰۹ء میں بطبع ثانی چھپوایا۔ تو مسز رائل ہائی نس ڈیوک آف کناٹ کے۔ جی ۔ سی ۔ بی ۔ کے جی اور بی سی وغیرہ وغیرہ کے نام سے منسوب کیا۔ معلوم نہیں۔ اسمیں کونسی پولیٹکل مصلحت تھی۔ کہ ایک ہی کتاب کو دو مختلف مربیوں کے ناموں سے معنون کیا گیا۔ سر سید کی اس انگریزی سوانح عمری کو ملکہ معظمہ وکٹوریہ۔ لارڈ کرزن۔ لارڈ کچنر۔ لارڈ رپن وغیرہ بڑے بڑے آدمیوں نے بغور مطالعہ کیا۔ اور انگلستان و ہندوستان کے تمام اخباروں نے اس پبلک کو ملکر تنقید یں لکھیں اور اُسے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا گیا۔ مگر اس ملک کے اکثر متعصب مولوی سر سید اور اس کے مذہبی کارناموں کو ہمیشہ بنظر حقارت دیکھتے رہے۔ اور اسکو اپنے فتووں میں عموماً جلی کٹی سناتے رہے جسکا ایک نمونہ صفحات آئندہ میں پیش کیا جاویگا؟

ضمیمہ ششم حیات سر سید

اور مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی

مسٹر گریہم صاحب کے علاوہ اور خواجہ الطاف حسین حالی سے استثنائے اس نامور ادیب نے سر سید کے حالات مختصراً لکھے ہیں۔ سو وہ مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی ہیں۔ مگر انہوں نے سر سید کی صرف مذہبی خدمات کا خاکہ کھینچا ہے۔ جو چھوٹی تقطیع کے ۲۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور اسکا نام سر سید کی دینی برکتیں ہیں۔ یہ دراصل ایک لیکچر ہے۔ جو مولانا موصوف نے ایک مجمع کثیر کے روبرو حیدرآباد دکن میں دیا تھا۔ حیات جاوید ہی سے استفادہ کر کے لکھا گیا ہے اور چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اس میں نیچر اور نیچریت کے متعلق یہ نوٹ لکھا ہے۔ کہ مسلمانوں نے نہ صرف سر سید کے پیروؤں بلکہ ان کے حواریوں اور ان کی تعریف کرنیوالوں کا نام بھی نیچری رکھدیا ہے۔ حالانکہ انہیں لوگوں میں جو بالعموم نیچری اور انکے معتقد بتائے

جانتے ہیں۔ ایسے چار مسلمان بھی بمشکل مل سکینگے جو سب ہی مسائل میں سرسید کے ہمخیال ہوں۔ چنانچہ نواب محسن الملک جو ان کی زندگی ہی میں ان کے خلیفہ اول مانے جاتے تھے۔ اور پھر ان کے جانشین بھی قرار پائے۔ وہی سب مسائل میں سرسید کے ہمخیال نہیں تھے۔ تا بہ دیگراں چہ رسد۔ پھر کچھ آگے شرر صاحب فرماتے ہیں۔ اگر سید صاحب کے ہم آوازوں کا نام نیچری ہے۔ تو وہ بیشک نیچری ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں آجکل پائے جاتے ہیں چنانچہ حالی سُنی ہی نیچری نہیں۔ بلکہ سنیوں۔ شیعوں۔ وہابیوں۔ بدعتیوں۔ اسماعیلیوں۔ اور آغاخانیوں سب فرقوں میں نیچری موجود اور الحمدللہ کہ یہ سب روشن خیال ہیں[1]۔

سرسید کی سوانح عمری سید ظہور احمد صاحب وحشی شاہجہانپوری نے اُنہیں سے بھی مختصر جتنی کہ شرر نے لکھی ہے۔ مرتب کی تھی۔ اس میں کوئی بات حیات جاوید کے مضامین سے علاوہ قلمبند نہیں ہوئی۔ چنانچہ وحشی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ سرکار انگریزی نے سرسید کی دو سَو روپیہ ماہوار پنشن و نسلوں کیلئے مقرر کی۔ تو یہ بھی چاہا۔ کہ چاندپور کا علاقہ جو ایک باغی مسلمان رئیس کے قبضے میں رہ چکا تھا۔ اسکو سرسید کے نام پر واگزار کر دیا جاوے۔ اور بعض انصاف پسند انگریزوں نے اسپر بہت اصرار کیا۔ مگر سرسید نے جو پہلی مرتبہ بات نہ مانی تو ہمیشہ انکار ہی کرتے رہے۔ اور عذر یہ کیا۔ کہ میں اپنے ہموطنوں میں بدنام ہونا نہیں چاہتا۔ کہ اپنی خدمات کے صلے میں سرسید نے فلاں رئیس کا علاقہ بتوسط سرکار غصب کر لیا۔ مگر اسوقت ان کی طبیعت سخت ڈانواں ڈول تھی۔ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر مصر میں اقامت گزین ہونا چاہتے تھے۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ صدر الصدور مقرر ہو کر مراد آباد چلے گئے۔ اور ان کے خیالات پھر کچھ ٹھکانے ہوئے۔

[1] اجی حضرت شرر صاحب۔ یہ روشن خیالی کی بھی خوب کہی۔ آپ کا قول سر آنکھوں پر۔ مگر اس روشن خیالی نے تو مسلمانوں کی تنگ نظری اور کفر کے فتووں کے تقاضا سے مجھے یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی؟

ضمیمہ

کتاب مستطاب امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق

اس طول طویل عنوان سے جناب مولوی سید امداد علی صاحب بہادر مرحوم و مغفور ڈپٹی کلکٹر کانپور نے ایک کتاب سرسید کے برخلاف شایع کی تھی۔ جس کی ایک بلیغ تاریخ کسی شاعر کے قلم سے یوں لکھی گئی تھی ؎

بلیغ ایں چنیں گفت تاریخ ہجری۔
سر ملحدان زمانہ شکستہ۔

یعنی سنہ ۱۲۸۹ ہجری مطابق سنہ ۱۸۷۲ء۔

ان دنوں میں سرسید مرحوم بنارس کی عدالت خفیفہ کے جج تھے۔ اور مدرسۃ العلوم علیگڈھ ابھی زیر تجویز تھا۔ مگر اس کی شہرت بہت دور دور پھیل چکی تھی۔ وہ پرانے فیشن کے علما جو تہذیب الاخلاق کے مذہبی اجتہاد کو مجسم کفر و الحاد خیال کیا کرتے تھے۔ لاٹھیاں سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کی امداد لیکر مولوی امداد علی نے مفصلہ ذیل تحریر بہ سرسید کے مجوزہ مدرسۃ العلوم اور ان کی عام کارگذاریوں کے متعلق طبع کرائیں جس پر ان کے بیسیوں ہم خیال علما نے بھی اپنی مہریں فوراً ثبت کر دیں تھیں۔

خلاصہ مفاد کہ جناب سی۔ ایس۔ آئی۔ سید احمد خاں صاحب بہادر بالقابہ نے مخالفین تجویز مدرسۃ العلوم کو سات قسموں پر تقسیم فرمایا ہے جن میں سے (۱) کسی کو خبیث النفس اور بد باطن بتایا ہے۔ (۲) کسی کو اپنا دوست سمجھ کر یہ خیال کیا ہے کہ وہ آپ کی ترقی درجات اور عزت و عظمت کا بالطبع حاسد ہے۔ (۳) کسی کو وہابی اور وہ بھی متعصب وہابی بلکہ یہودی قرار دیا ہے۔ (۴) کسی کو عمدہ درجے کا خود غرض اور خود پرست کہکر بدنام کیا ہے (۵) کسی کی

نسبت یہ لکھا ہے۔ کہ وہ ایک تھرڈ پونجیہ اخبار نویس ہے۔ (۶) کسی کو پرچہ تہذیب کا ایک ایک بدتہذیب یا بے تمیز دشمن فرض کیا ہے۔ اور (۷) کسی کو محض ایک احمق۔ نادان مسلمان تاکر اپنا مخالف اور حریف سمجھا ہے۔ سوائے مسلمان بھائیو۔ ہم کو سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں بہادر سے کوئی رنجش یا شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر طرح معذور ہے۔ ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ عجب نہیں ہے۔ کہ سید احمد خاں کو بسبب افراط فکر کے در بارہ تجویز مدرستہ العلوم اور بسبب اختیار مختون ثاقبہ کے علوم جدیدہ میں اور بسبب روزانہ استعمال اغذیہ تیسارہ دماغ و مولد سودا ایسے زایا از قدر طبعی کے مانند بعض طیور منخنقہ اور لقیتا موقوذہ کے حاضری یعنی اور چھوٹے بڑے کھانوں ہیں اور بسبب اکثر پہننے لباس گرم کے مانند لال کرتی پتلون دار کے۔ کہ جنکی پہلے انکو عادت نہ تھی۔ وہ مرض پیدا ہو گیا ہو۔ کہ جس کے اوصاف میں اطبا ر لکھتے ہیں۔ کہ وہ باعث تغیر ظنون و افکار ہے۔ اور موجب فساد و نفاق۔ تو یہ مرض سخت موذی ہے۔ جو بیمار رکھتا ہے۔ آدمی کو افکار سلبیہ و ظنون سالبہ سے اور صاحب اس مرض کا ہمیشہ بدگمان رہتا ہے۔ اپنے سچے دوستوں سے اور اپنے اطبائے معالجین سے بوجہ نادانی و جہالت کے کہتا ہے۔ کہ وہ میری ہلاکت کے درپے ہیں۔ بیچارے سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔ جبکہ آخر میں یہ مرض بڑے بڑے فلاسفر امصار مثل افلاطون اور ابو نصر فارابی کو بھی لاحق ہو گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ جو مدرسہ اس سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں نے تجویز کیا ہے۔ ہرگاہ وہ تجویز کوئی نئی نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے پیشتر کانپور۔ دیوبند۔ سہارنپور۔ اور دہلی وغیرہ میں بھی اسلامی مدارس مقرر ہو چکے ہیں۔ الا ماشاء اللہ یہ بانی مبانی والا سید خیال کرتا ہے۔ کہ سارے کمالات یا قومی ترقیات جو زمانہ کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ وہ نتیجہ ہوگا۔ میرے خیالات کی موافقت کا اور جسقدر عیوب و نقائص فی الطبع دنیا میں موجود ہو گئے ہیں۔ وہ سبب اثر میرے معاملات کی مخالفت کا۔ یعنی ہمارے اس مہربان سید سید احمد خاں سی۔ ایس۔ آئی نے حال قاضی فیض علی صاحب کا جو قاضی تھے فرید آباد کے۔ شاید نہ سنا ہوگا۔ کہ باوجود اس کے کہ انکو شعر کے موزوں کرنیکا کچھ شعور و سلیقہ و وقوف نہیں تھا۔ مگر اس طرح کوشش

مالیخولیا ساتھ فرمایا ہی۔ منوری، سعدی اور خاقانی سے دعویٰ ہمسری کا رکھتے تھے۔ اور آپ جناب قاضی صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ اگر میں چاہوں تو ان شاء اللہ طرفۃ العین میں تمام اہل قبور کو زندہ کر ڈالوں۔ بلکہ میری چوکھٹ کی ادنیٰ خاکبوسی سے لاکھوں اقطاب اور اوتاد پیدا ہوتے ہیں۔ اور میری معمولی سی توجہ کی بدولت تمام حاجتمند فوراً فائض بہ مطالب ہو جاتے ہیں۔ پس وجہ مخصوص ہونے جناب سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں کیسا تھ ان ظنون کا اب میں کچھ بیان نہیں کر سکتا۔ عیاں راچہ بیاں۔

تولہ سید احمد خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی کو سب جانتے ہیں۔ کہ آپ بذریعہ تحریر اپنے آپ کو وہابی ظاہر کر چکے ہیں پس وہابی منقسم ہے۔ آن دو اقسام پر۔ ایک تو نجدی۔ دوسرے ہندوستان کے وہ کٹر وہابی جو تیس سات کو ڈھکوسلا۔ اور اصول فقہ کو نرا شکنجہ جانتے ہیں اول قسم کے وہابیوں یعنی نجدیوں کا سلطان روم سے لڑنا سب پر روشن و منکشف ہے۔ اور دوسری قسم کے وہابیوں کا شیوہ ہے جھوٹ بولنا۔ قدیم خیال کے علماء سے ہمیشہ فساد کرنا کیا یہ سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں بھی اپنے آپ کو ایک ایسا ہی وہابی خیال کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسکو یہ تجدید مذہب مبارک ہو۔

ایّامِ غدر

ہمدردی کا لفظ زبان سے کہنا۔ اور منہ سے بک ڈالنا ایسے وقت میں۔ کہ جو وقت امتحان کا نہیں ہے۔ اب سید احمد خاں بہادر کو آسان ہے۔ مگر وہ وقت ہمدردیوں کے امتحان کا غدر کا وقت تھا۔ کیا یہ بھی کوئی ہمدردی ہے۔ کہ بجنور سے لٹھے۔ راجہ پرتاپ سنگھ کے ہاں جا ٹھہرے۔ وہاں سے اٹھے۔ تو پھر اوں ضلع مراد آباد میں جا کر آرام فرمایا۔ دلی آپکا وطن تھا۔ دیکھا۔ کہ وہ باغیوں اور مفسدوں کا گھر ہے اور دلی والوں کو شکست پر شکست نصیب ہو چکی ہے۔ تو آپ جھٹ میرٹھ میں تشریف فرما ہو گئے۔ آپ کو

دعوی تو بڑی بڑی ہمدردیوں کا ہے مگر افسوس کہ کسی مقام پر انکے مقابلے میں کبھی گئے ہے وقت تک کوئی لاٹھی اپنی پشت مبارک پر نہ کھائی - زخم تلوار یا بندوق کی گولی تو جہنم کی دوسری بات ہے -

پس جس خیر خواہ سرکار کی نسبت یہ سی ایس - آئی سید احمد خاں یہ ظن رکھتا ہے کہ وہ ہمدردی کو کفر خیال کرتا ہے - اس تحریر کا محاکمہ میں حکام وقت اور جملہ مسلمان اہل ہنود پر چھوڑتا ہوں - کہ آیا جو شخص سینہ سپر ہو کر بنظر نمک حلالی اپنے آقا کے سینہ پر گولی باغیوں کی کھاوے - اور ہزارہا روپیہ کا مال ان سے چھڑاوے - اور وہ گولی چھپ جانے بعد دا سطر مدتے صاحب بہادر نکالیں - کہ جسکا ثبوت مسٹر لو صاحب داماد جناب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر او ہنٹ صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ متعلقہ او پہنچنے جارہی - اور اس گولی کا نشان تصدیق ایک نمونہ ہمدردی اور نمک حلالی کا ملکہ منظمہ کے فیض بہادر کے سینہ پر موجود ہو - تو انصاف فرمایا جائے - کہ کیا وہ شخص ہمدردی کو کفر سمجھنے والا ہو سکتا ہے - یا کہ جو اس کو ایسا لفظ کہے - اور طعن دے - بیشک ایسا ہی شخص نام دنیا کا جھوٹا - مفسد حاسد - اور خبیث النفس ہے -

مولوی امداد علی صاحب نے اس عبارت کے بعد دو ایک چٹھیاں بھی جو سرکار سے انکی ہمدردی و خیر خواہی سرکار سے موصول ہوئی ہیں - نقل کی ہیں - اور پھر علمائے ہند کی طرف یوں رجوع کیا ہے -

استفتائے علمائے بنارس

چونکہ سر سید مدرستہ العلوم علیگڈھ کے تجویز کرنیکے ایام میں بنارس میں تھے - سب سے پہلے وہیں

سلہ یعنی مولوی سید امداد علی ڈپٹی کلکٹر کانپور جنہوں نے غدر میں سرکار کی بڑی خیر خواہی کی تھی - اور اسمیں سینے پر گولی کھا کر زخمی ہوئے تھے -

سلہ یہ ترکیب عبارت ایک قسم کا گلابی اُردو ہے جسمیں معانی کا خبط ہونا ضروری امر ہے -

ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ اور پھر اسکی تقلید کانپور۔ دہلی۔ رامپور۔ لکھنؤ۔ امروہہ۔ بھوپال وغیرہ
کے علماء نے کی۔ علمائے بنارس نے یہ استفتا جاری کیا۔ کیا فرماتے ہیں علمائے شرع شریف
کہ ان دنوں میں بعض مسلمانوں نے واسطے تعلیم علوم دین اور علوم دنیاوی مسلمانوں کے
ایک مدرسہ قائم کرنا تجویز کیا ہے۔ اور جو جو علوم اس میں پڑھائے جائینگے۔ اور جسطرح کہ مدرسین
کو تنخواہ اور طالب علموں کو وظیفہ ملیگا۔ اسکی تجویز انہوں نے چھاپی ہے۔ جو بجلسہ سوال ہذا کے ساتھ
مرسل ہے۔ کیا ایسا چندہ دینا۔ کہ جس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے۔ کہ یہ فلاں مدرسہ کیلئے
جمع ہوا ہے۔ اور یہ صرف فلاں فلاں علم کے پڑھانے یا نہ پڑھانے کیلئے دیا جائیگا۔ شرعاً
جائز ہے۔ اسیطرح جو علوم اس خیالی یعنی زیر تجویز مدرسہ میں پڑھائے جانے مندرج ہیں
ان میں سے کون سے ہیں۔ جنکے لئے عام مسلمانوں کو چندہ دینا جائز ہے۔ کونسے ویسے ہیں
جن کے لئے یہ چندہ ناجائز ہے! بینوا توجروا۔

پھر اسی قسم کے استفتا کانپور۔ دہلی۔ امروہہ اور بھوپال وغیرہ سے بھی یکے بعد دیگرے
نکلنے لگے۔ اور بیچارے سر سید احمد خان کو اپنی جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ان کے مدرسہ
مجوزہ کو ایک خیالی مدرسہ بتایا جاتا تھا۔ اور ابھی یہ بنا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ کہ ہندوستان
بھر کے مولویوں نے اسکی سخت مخالفت کی۔ گویا سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ کوئی کہتا تھا۔

۱- چندہ لینے والا جس حالت میں بہت سے مسائل میں ساتھ مسلمانوں کے مخالف ہے۔
تفاسیر میں۔ اور سمجھتا ہے۔ وہ باطل و کذب ان احادیث کو۔ کہ نہیں ہیں بزعم اس کے مطابق
نیچر کے اور رد جانتا ہے۔ بڑا ڈھکوسلا۔ قیاسات فقہی کو۔ اور جو ہفوات کہتا پھرتا ہے۔ کہ تمام
تفاسیر قرآن بھری پڑی ہیں ساتھ لایعنی قصوں بیہودیوں کے اور قیاسات مختلف غلط
خیال اجماع سے ناجنود ہیں۔ تو کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ کہ ایسا شخص علوم دینی کو اپنے طور پر
مسلمان لڑکوں کو تعلیم نہ کروائیگا۔ اور اس سے دنیا بھر میں کفر و الحاد نہ پھیلیگا۔

۲- کوئی مخالف مولوی یہ کہتا تھا۔ کہ جس وقت اس میں مدرسہ مجوزہ خیالی سر سید میں ہر طالب علم
انگریزی جوتا از قسم بوٹ پہنیگا۔ سیاہ الپاکا کا چغہ لٹکائیگا۔ لال لال پھندنے کی ترکی ٹوپی
اوڑھیگا۔ میز کرسی پر ڈٹ کر چھری کانٹا ہاتھ میں لیکر طعام [illegible] کھائیگا۔

کھڑے ہوکر پیشاب کریگا۔ اور اس زمانے کی تہذیب سے آراستہ و پیراستہ ہوکر پورا جنٹلمین بنیگا۔ تو کیا کوئی مولوی یہ امر گوارا کریگا۔ کہ ایک ایسے خیالی مدرسے کا وہ مولوی بنے

(۳) - ایک اور مولوی صاحب سب سے الگ یہ ہانک لگا رہے تھے۔ کہ اس خیالی مدرسۃ العلوم کا دم بنگ مجھے ایسا نظر آتا ہے۔ کہ ایک جاہل اور لامذہب صدر الصدور جو علم کی باتیں نہیں جانتا۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ ڈیڑھ اینٹ کی جُدی مسجد قائم کی جائے۔ اور ایک ایسا مدرسہ تیار کیا جائے۔ کہ جس کے طالب علم عموماً علوم مذہب سے اور مشکل امور مذہب کی واقفیت سے کورے رہیں۔ تاکہ ہم اندھوں میں کانے راجہ کہلا سکیں۔ اور ہمارا کوئی مدِ مقابل ہی نہ پیدا ہو سکے۔

۴ - ایک قاضی صاحب جنکی پیشانی پر نماز کا گٹا نمایاں تھا۔ کہنے لگے کہ ہمارے چھوٹے چھوٹے مدارس اسلامیہ مانند مدرسہ خورجہ۔ امروہہ۔ اور سہسوان وغیرہ اور چھوٹے چھوٹے اسکولوں مانند اسکول مرادآباد و فرخ آباد۔ اور علیگڈھ میں جسقدر علوم مذہبی و غیر مذہبی کے حاصل ہونے کی امید ہے۔ اسقدر بھی سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں کے خیالی مدرسے سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس وہمی مدرسہ کی موجودہ ہنی تعلیم کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ نہ ہوگا۔ کہ اس کے ہونہار برخوردار یعنی طالب علم ایک کتاب انگریزی کی پرانی بغل میں دابے۔ خیراتی فنڈوں میں ٹکٹ مانگتے پھرینگے۔ یا تصویر ممبر اعلیٰ کمیٹی مدرسہ کی اپنے گلے میں ڈالے۔ ایک کتّے کے پلّے کو گود میں لئے۔ اور منہ اسکا چومتے جاتے۔ عام مسلمانوں کی پھٹکار دھتکار سنتے سناتے موضع علیگڈھ کی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرینگے اور یہ سیکھی سکھائی بات طوطے کیطرح ہر جگہ رٹتے چلے جائیں گے۔ کہ مدرسۃ العلوم کی تعلیم گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے بہتر ہے۔ لہٰذا اے مسلمانوں اگر تم کچھ دوگے یا نہ دوگے۔ تو سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں ضرور تمہاری آنکھ سینگے۔ اور تم کو بھوت بن کے جمٹ جائینگے۔

۵ - ایک اور مولوی نے یہ دیوانے کی سی بڑ لگائی۔ کہ اس مدرسۃ العلوم مجوزہ علیگڈھ میں کسی کو علوم مذہبی و دنیوی میں کچھ لیاقت حاصل کرنے کی ہرگز امید نہ رکھنی چاہئے

طالب علم اس مدرسہ کے عموماً اپنا وقت ضایع کیا کرینگے - اور مانند میانجیوں کے مکتبوں کے اس کے لڑکے تمام عمر میں صرف اس قابل ہو سکینگے - کہ ایک عبارت کا غلط سلط خانہ ساز ترجمہ یاد رکھیں - اور پھر اس کو جب چاہیں - فر فر سنا دیں - یا ان ڈھابیوں کی مانند کہ عمر بھر کے گانے بجانے میں دو ایک سوہیلے خواجہ صاحب کی اور وہ بھی پھٹی کھرکھری آواز سے بے سُر بے تال ریانا پرگا بجا لیتے ہیں - غرض طالب علم اس مدرسہ کے دو چار جعوسلے مسئلے سید احمد خاں کی کسی تفسیر کے اور دو ایک ملی رانہ باتیں پرچہ تہذیب الاخلاق کی یاد کر لینا سکینگے - کیونکہ اس مدرسہ میں وہ علوم قدیمہ جن کو سی - ایس - آئی سید احمد خاں آجکل کے زمانے میں غیر مفید سمجھتے ہیں - ہرگز پڑھائے نہیں جائینگے -

۶ - سید امداد علی نے ان سب خیالات کو جو گویا مختلف مولویوں کے تھے - اپنی تصنیف میں ظاہر کیا - اور یہ بھی لکھدیا - کہ سر سید احمد خاں جو تمام مقاصد تعلیم کا گورنمنٹ سے حاصل ہونا - غیر ممکن خیال کرتے ہیں - اور موجودہ اسلامی مدارس کی ضد میں اپنا ایک مدرسہ خاص نکالا چاہتے ہیں - ایک ذاتی مطلب اس سے انکا یہ بھی ہے - کہ ہر طرح گورنمنٹ کی اور سرکار کی مخالفت کی جائے - یعنی طلباء اس مجوزہ مدرسہ کے کالے اپلیکے کا جبہ - لال لال ٹوپی - انگریزی جوتی - اور موزہ پہنگے - اور میز کرسی پر چھری کانٹے سمیت کھانا کھا کے گورنمنٹ کی ہمسری کرینگے - اور ان کو اس پر فوقیت حاصل ہوسکیگی - لہذا میرے عزیز دوست سی - ایس - آئی - سید احمد خاں خوب یاد رکھیں - حکام ان کی اس روش پر ضرور خفا ہو جائینگے - اور وہ اپنی ضد پر پیچھے بہت پچھتائینگے ؎

از کدو بوئے شراب آید بدشواری بروں -

از سر بیمغز نتواں بردحب جاہ را -

غرض سید امداد علی نے سید احمد خاں کو بہت آڑے ہاتھوں لیا - اور گالیاں سنانے تک بھی فرق نہیں کیا - چنانچہ کتاب مذکور میں یہ بھی لکھتا ہے - کہ سید احمد خاں صاحب کا اسلام گویا بی تمیز کا وضو ہے - جو کسی حدث (واقع) سے نہیں جاتا - اور کوئی ناقض و مفسد ہرگز اسکو توڑ نہیں سکتا -

۷ - مولوی سید امداد العلی صاحب آگے فرماتے ہیں - کہ پرچہ تہذیب الاخلاق نمبر ۳ مورخہ صفر سنہ ۱۲۹۰ ہجری میں لکھا ہے - کہ دوسری تجویز یہ ہے - کہ ہر طالب علم کو مدرسہ میں موزہ یعنی جراب اور جوتا انگریزی پہنکر آنا ہوگا - اور کالے اپکے کا کوٹ یا چغہ - لال لال ترکی ٹوپی (جسکا رواج روم - عرب و شام میں اور اب وہ ٹوپی خاص ترکوں یعنی مسلمانوں کا لباس سمجھی جاتی ہے) پہنتی ہوگی - اب مسلمانوں کا ان امور پر اعتراض یہ ہے - کہ کوئی لباس مثل کفار یا غیر اقوام کے پہننا - جیسے - کہ بوٹ انگریزی یا جراب ساختہ لندن وغیرہ گویا مسلمانوں کو ان کے ساتھ مشابہت رکھنے کی ترغیب دلانا ہے - حالانکہ یہ شرعاً ممنوع ہے - اور وہ لباس جو ترک وغیرہ مسلمان پہنتے ہیں - مثلاً ٹوپی ترکی لال لال وہ یہاں کے غریب مسلمانوں کی استطاعت سے باہر ہے - اور ویسے بھی ہندوستان میں سرخ رنگ کا لباس اہل اسلام کو پہننا ناجائز ہے - اسی طرح مسلمانوں کو میز کرسی اور چھری کانٹے سے کھانا (جیسے کہ اخبار مذکور میں ہدایت کی گئی ہے) تشابہ نصاریٰ سے ہے - اور یہ بھی ٹھیٹھ مسلمانوں کے نزدیک خلاف شرع شریف ہی - نعوذ باللہ -

ذِکر سُود لینے دینے کا -

تہذیب الاخلاق کے اسی پرچہ میں سید احمد خاں نے ارشاد فرمایا ہے - کہ عام مسلمان جانتے ہیں - کہ مولانا شاہ عبد العزیز نے پرامیسری نوٹ کے منافع لینے کے جواز پر فتویٰ دیا ہے - پس گورنمنٹ جو سود اس بہانے سے ہم کو دے وہ مباح ہے - اس کے متعلق عام مسلمانوں سے دریافت کیا گیا - تو کسی نے سید احمد خاں کے قول کی تصدیق نہیں کی - لیکن ہاں وہ لوگ کہ جن کے پاس یہ نوٹ موجود ہیں - اور وہ سود کو شیر مادر سمجھتے ہیں - ان کو کسی مولوی سے (خواہ وہ شاہ عبد العزیز ہی کیوں نہ ہوں) فتویٰ لینے ہی کی ضرورت کیا ہے - سید احمد خاں اتنی دور کیوں جاتے ہیں - اور شرع شریف کو ایسے فتووں کی تکلیف کس واسطے دیتے ہیں - جبکہ دہلی - علیگڈھ - امروہہ - شاہجہانپور

مراد آباد وغیرہ سینکڑوں جگہوں کے مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں سے بیدھڑک سود
لیتے دیتے ہیں - اور اسمیں مطلق کچھ عار نہیں خیال کرتے -

تصویر کشی

یہ اسلام میں حرام ہے - لیکن یہ سی - ایس - آئی سید احمد خاں لکھتا
ہے - اور اس نمبر کے پرچہ تہذیب میں کہ میں تصویریں طیار کرا کے
یہاں لیجاؤں گا - چنانچہ حامیان مدرسہ کی تصویریں نہایت عمدہ
اور خوبصورت ہونگی - اور جو اس کے مخالف ہیں - ان کی نہایت ہیبت ناک اور کریہ ہونگی
مسلمانوں ذرا خدا لگتی کہنا - کہ کیا تصویر کا بنایا جانا - یا ان کا گھروں میں رکھنا کبھی اسلام
میں جائز رکھا گیا ہے - حدیث ہے - کہ جس گھر میں تصویر ہوتی ہے - وہاں فرشتے قدم
رکھتے ہوئے جھجکتے ہیں بلکہ اس گھر میں داخل ہی نہیں ہوتے - فرمایا اللہ تعالیٰ نے - کہ
نزدیک اللہ تعالیٰ کے سخت تر عذاب ان کے لئے ہے - جو تصویریں بہت خوبصورت
خوبصورت اپنے گھروں میں لٹکاتے ہیں - غرض سید احمد خاں کو کہاں تک سمجھایا
جائے - وہ اپنی دھن کا بہت پکا ہے - بید مدرسہ کے قائم کرنیکی ہٹ سے کبھی
باز نہیں آنے کا - اور علمائے بنارس - دہلی - کانپور - لکھنؤ - امروہہ اور رامپور - مراد آباد
بھی برابر اسے سمجھاتے رہینگے لیکن وہ کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم -
یہ بھی یاد رہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنی ماں باپ کی بولی چھوڑ کر گٹ پٹ کرنے لگیگا - اور جاکٹ پتلون کوٹ یا بوٹ سمیت
سمیت ہو لیگا - میز کرسی پر بیٹھکر چھری کانٹے سے کھانا کھائیگا - یا ایک آدھ پیگ گلیاس بھی اپنی ساتھ لیکر بھرے گا تو وہ
اس سے کچھ اچھا یورپین ہرگز نہیں ہو جائیگا خلوص وہاں شیخ ہو سید ہو مغل ہو پٹھان یا کوئی جو ہر احمار ہو
اور کسی کمیٹی کے ممبر بن جانے یا ایک آدھ اہل ... کے نام نکو یاد کر لینے سے کوئی جاہل کندہ ناتراش
عالم نہیں بن سکتا ہے - ع ہزار نکتۂ باریکتر ز مو اینجاست ۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند ۔ اسیطرح یہ سی ایس
آئی سید احمد خاں جو مسلمانوں کی انگریزی تعلیم پر بہت زور دیتا ہے - وہ بھی سب بربنا عاشقاں بشاخ آہو کیسی مثال ہے - دیکھیے کہ
ہزاروں انگریزی خواندہ نوجوان نوکریوں کیلئے دفتروں میں مارے مارے پھر رہے ہیں - اور انکو کوئی نوکری ہاتھ نہیں آتی - حالانکہ
صدہا انگریزی نہ جاننے والے بے علم نادان علوم سی (مدرسہ سید احمد خاں اپنے مدرسہ میں تعلیم کیا پاتے ہیں) ابھی مکمل اور باوقار میں
اور بڑے مزے سے روٹی کما کھاتے ہیں سچ ہے ع اگر بہ ہر سر موئیت ہنر دو صد باشد ۔ ہنر بکار نیاید چو بخت بد باشد ۔

خواہ الننز اماً اور اس قاعدہ کے پیرو کو انگریزی محاورہ میں نیچرل اسٹ کہتے ہیں یعنی پیروی کرنیوالا نیچر کا پس نیچرل اسٹ
نے اگرچہ فی زماننا یورپ میں اسقدر زور پکڑا ہے کہ تقریباً ستر لاکھ کے عدد کو پہنچا۔ از انجملہ چھیاسی ہزار انگلینڈ
میں اور چالیس ہزار لنڈن میں ہیں لیکن بحمد اللہ تعالیٰ عقلائے مسیحیہ خود انہیں بالطور احسن تحریراً بالمکاتبۃ و تقریراً بالمشافہۃ
بخوبی گوشمالی فرما رہے ہیں۔ اور انکو آٹے دال کا بھاؤ بتا رہے ہیں مسٹر آڈ وڈ صاحب کی کتاب ایڈیو انسٹرکٹڈ اور مارٹن صاحب
کی کتاب اینالس آف لو اسکرپچر بغیر جامیں دیکھو کسطرح بقلم کھلا نیچریوں کی مذہب دریکاری لہ زیالا کفی او عیاری وغیرہ من
قبائح مال انکے مذکور و مسطور ہیں۔ پھر اسپر بھی اگر کوئی نیا نیچری بنتر ہے تو ہوا اور یہ طمع ترقی جاہ چاہتا ہے کہ اس نئی نئی بلا کو
ہندوستان میں پھیلائیگا تو ہمارے علمائے محمدیہ نے جسطرح فلاسفہ اور اہل اعتزال اور ان کے گو جنگ جدال ارباب خیال کی
دھجیاں اڑائیں۔ اور انکو عدم کی راہیں دکھائیں۔ اس سے زیادہ اس نیچر کا سنیچر اتار دینگے۔ اور نیز لو ظامن نار کے براہین کو
اپر ملا دینگے۔ ذرا انکو ولایتی نیچر پرست نیچر پرستوں کو فرمائیں کہ قبل قبول نیچریت کے تو پہلا دھرم کھو چکے تھے۔ اور آپ
کے سارے کرم ہو چکے تھے۔ لنڈن میں جاکر جاکٹ پتلون پہن آئے خمر خنزیر تو در کنار گلا گھونٹی مرغی کے کھانے
میں شرمائے منہیات اور محرمات کی نسبت بتانی ہے۔ بنات اور امہات کی بابت اختیار باقی ہے۔ اب آپ بمعنی نحوست
کے ...... خطاب پائے۔ پھر کیا باقی رہا تھا جو پھر پہلے بطریقہ کی جانب للچائے۔ کیا جی چاہتا ہے۔ کہ لاٹ پادری بنجائے
اور خیابیم صاحبہ کو لیڈی کہلائیے سے کلاہ خسروی و تاج شاہی بہر کل کہ رسد حاشا و کلا یہاں بقول بعض نیچریوں کے
کہ ہر قوت جسمانی کے ہر اقتضا کو پورا کرنا چاہیے تاکہ کسی قوی کے حرمانی لازم نہ آئے شاید بمقتضائے قوت شہوت
بانی پت کرنال کا خیال آیا ہوتا۔ اس جانب کو ٹوٹئے کچھ دنوں وہاں کا مزہ لوٹیے۔ تو برائے خدا ذرا پس و پیش کو کار
فرمائیگا پیش و پس کو یکساں نہ بنائیگا۔ مرگ عاشق بگو رخوش تر است + کس نیاید روز پس تو پیش و پست۔ غرض جب
حال نیچر اور نیچریوں کا بخوبی واضح ہوا۔ کہ یہ لوگ ہوا و ہوس نفسانی کے بار بردار ہیں۔ اور وساوس شیطانی میں
گرفتار تو اب ان کا قول ماننا یہ قول ہستا یا باطل ہے۔ اور حلیہ دیانت سے عاطل ہر گز ان کے انکار سے
کوئی امر شرعی مثبت مثل وجود آسمان و ملائکہ و شیطان و عموم طوفان و بعثت حضرت نوحؑ اور ثبوت معراج
صاحب البراق و التاج اور صحت کتب تفاسیر معتبرہ و احادیث صحیحہ و اصول فقہ و قیاسات حنفیہ
مجتہدین و صحت کتب سیر متقدمین و متاخرین و امثال ہذا مما لا تحصلے باطل نہیں ہو سکتا۔ اسواسطے
کہ یہ امور تقلید و عقلیہ ان امور اور ان کے مضامات پر بجائے خود قائم ہیں +

ضمیمہ نمبر

مکتوباتِ سرسید

حیاتِ جاوید (مرتبہ مولانا حالی) چھپکر شائع ہوئی۔ تو شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر مخزن نے اس پر تنقید کرتے ہوئے یہ ریمارک لکھا تھا۔ کہ سرسید کی ایسی ضخیم سوانح عمری میں اگر ان کے پرائیویٹ خطوط بھی شامل کر لئے جاتے۔ تو یہ بیوگریفی (سوانح عمری) گویا ہر طرح مکمل ہو جاتی۔ لیکن اپریل ۱۹۱۱ء کے رسالہ معارف سے جو مولانا حالی کے لٹریری اسسٹنٹ مولوی وحید الدین سلیم کی ادارت میں پانی پت سے نکلتا تھا۔ یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" مرتب کرنے سے پہلے سرسید کے بیسیوں خطوط جمع کر لئے تھے۔ پھر ان کے اقتباسات جہاں جہاں مناسب تھا۔ سوانح موصوفہ میں درج کر دئے تھے۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ سرسید کی جو سوانح عمری میجر جنرل جی۔ ایف۔ آئی۔ گریہم صاحب نے لکھی تھی۔ اسمیں بھی سرسید کے چند خطوط انگریزی میں ترجمہ ہو کر درج ہوئے ہیں بہر حال سرسید کے یہ خطوط جن سے۔ کہ کاتب اور مکتوب الیہ کے دلی تعلقات کے علاوہ سرسید کے ذاتی خصائل اور ان کی مصائب کا جو انہوں نے قوم کیلئے برداشت کی تھیں۔ کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے ہدیۂ ناظرین بطور ضمیمہ یہاں نقل کرتا ہوں۔ تاکہ میری اس ناچیز تالیف موسومہ بہ مضحکات میں اگر اور کوئی خوبی نہیں ہے تو کم از کم سرسید کے مندرجہ مکتوبات ہی اس کمی کو پورا کر سکیں جو حیاتِ جاوید میں محسوس کی گئی تھی۔ یا کہ جہاں آزاد۔ حالی۔ شبلی۔ مولوی نذیر احمد خاں۔ داغ۔ امیر مینائی وغیرہ ارکان ادب اردو کے خطوط آجکل بہت ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کئے گئے ہیں۔ اور ان کو

کتابوں کی صورت میں طبع کیا گیا ہے۔ سرسید کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی ضرور موجب دلچسپی ثابت ہوگا۔ یہ خطوط ۱۸۶۹ء میں لکھے گئے تھے جبکہ سرسید لندن تشریف لے گئے تھے۔ ان کا مکتوب الیہ ایک ہی ہے یعنی نواب محسن الملک بہادر مرحوم و مغفور۔

مکتوبات سرسید بنام نواب محسن الملک بہادر

(۱)

جناب مخدومی مکرمی سلامت۔

بعد سلام مسنون التماس آنکہ جس رنج و محبت سے آپ نے مجھکو اور میں نے آپکو رخصت کیا۔ ہمارا آپکا دل جانتا ہے۔ اب خدا سے دعا ہے۔ کہ انشاء اللہ تعالیٰ بالخیر و عافیت پھر ہم سب سے ملینگے۔ میرا مفصل حال اخبار سوسائٹی سے معلوم ہوگا۔ میں بفضل الہی قریب عدن پہنچا ہوں۔ چند گھنٹہ قبل عدن کے پہنچنے کے ڈاک ہند لے لی جاتی ہے۔ اس سبب سے یہ خط ڈاک میں ڈال دیا۔ چند گھنٹہ بعد عدن پہنچیگی انشاء اللہ تعالیٰ مجھکو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے۔ کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے۔ اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کر دینے سائنٹفک سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ بس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کیطرف زیادہ متوجہ ہوں۔ اور اسکو سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرماویں۔ مرزاپور کے لوگوں نے اگر چندہ نہیں دیا۔ تو ان کو ممبر بنائیے بہر حال سوسائٹی کے معاملہ میں حد سے زیادہ خیال و کوشش فرماویں۔ بخدمت حافظ جی صاحب سلام۔ زیادہ بجز یاد شما یاد شما یاد شما چہ نویسم والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (۱۶۔ اپریل ۱۸۶۹ء)

(مقام قریب عدن)

(۱۴)

جناب مخدوم و مکرم محب من سلامت

بعد سلام مسنون التماس اینکہ آپکا عنایت نامہ مورخہ بلا تاریخ پہنچا جس قدر
مجھکو خوشی آپکے عنایت نامہ پہنچنے سے ہوئی ہے بیان نہیں ہو سکتا ہے مقولہ
کہ الخط نصف الملاقات غلط ہے بلکہ پوری ملاقات کا لطف ہوتا ہے سفارت [illegible]
کی قدر معلوم ہوتی ہے میں برابر اپنے حالات لکھکر بھیجتا رہتا ہوں اخبار میں چھپتے ہیں
بعد معاودت انشاء اللہ تعالے نظر ثانی کرکر رسالہ سفر مرتب کرکر چھاپا جائیگا [illegible]
نہایت مفصل حالات لکھتا ہوں ۔ اور جو جو مراتب آپنے لکھے ہیں وہ آخر کو [illegible]
لکھونگا ۔ بعد آنے کے معلوم ہوا ۔ کہ سفر چنداں دقت نہیں ہے نہایت آرام [illegible]
ہے ۔ اور کوئی چیز مذہبی ایسی نہیں ہے ۔ کہ مسلمان اسکو اپنی خاطر خواہ نکر سکے یہاں
تک کہ ایک شخص جو مشرک کو نجس حقیقی جانتا ہے ۔ وہ بھی اپنے مذہب کے موافق
رہ سکتا ہے ۔ مگر کسی قدر اہتمام و تردد سے [illegible]
کوئی بات مشکل نہیں ہے ۔ بعضے امور [illegible] اور بعض [illegible] انتظام [illegible]
میں چاہتا ہوں ۔ کہ حالات سفر جو اخباروں میں چھپتے ہیں ۔ آپ انکو بغور [illegible]
کرواتے جاویں ۔ اور جس امر کی [illegible] زیادہ تفصیل کی حاجت ہو مجھکو لکھ [illegible]
فرمالیں ۔ اور اسکو [illegible] اشارہ کردیں [illegible] کی تصحیح سے کتاب [illegible]
اور سب چیزوں کو حاوی بھی ہو ۔ اور میرے آنے تک [illegible] رہیگی ۔ اور [illegible]
چھپنا شروع ہوگا ۔ بعض بعض عمدہ مکانات کے نقشے [illegible] ۔ اور وہ بھی کتاب میں
چھپوائے جائینگے ۔ بہرحال بعد نظر ثانی [illegible] تمام چیزوں کو ہوگی ۔ [illegible]
واسطے امتحان سول سروس کے بمبئی سے اور آئے ہیں ۔ افسوس ہے کہ [illegible]
پیچھے رہے جاتے ہیں ۔ چار بنگالی اب کی دفعہ سول سروس میں پاس ہوئے ہیں
محمود مدرسہ قانونی میں داخل ہوگیا ہے ۔ مجھ سے اور سید [illegible] روز

ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ بلکہ اسقدر ملاقات کے موقع اور جگہ ہے۔ کہ شاید میں اُن
سب سے نہ مل سکوں گا۔ جس اخلاق سے یہاں کے امرا اور ارکین ملتے ہیں۔
اُسکا بیان بیان سے باہر ہے۔ کچھ میرے ہی ساتھ یہ اخلاق نہیں ہے۔ بلکہ
حقیقت میں وہ لوگ بااخلاق اور سادہ مزاج اور بے غرور ہیں۔ میں ہر دم اپنے
ملک کی بھلائی کے خیال میں ہوں۔ اور عنقریب کچھ کچھ انشاء اللہ تعالیٰ مشتہر کرنا شروع
کرتا ہوں۔ وزیر ہند میرے آنے کے دو تین دن بعد باہر چلے گئے ہیں۔ اول اُن
سے ملاقات خاص ہو لے تب کچھ تحریک بہتری ہندوستان شروع ہوگی۔ قبل اس
کے ایک عریضہ معہ اشتہار کتاب کے روانہ بخدمت عالی کیا ہے۔ ملاحظہ سے گذرا ہوگا
اور امید ہے۔ کہ زر مطلوبہ روانہ فرمایا ہوگا۔ مجھکو نہایت افسوس ہے۔ کہ بعض احباب نالائق
مثل مولوی زین العابدین کے میرا ارادہ درباب تحریر جواب کتاب میور صاحب جو نسبت
آنحضرت صلعم کے لکھی ہے۔ سست کردیا۔ اور بروقت روانگی سامان اور چندہ کچھ نہیں
دیا۔ یہاں اس کے جواب کا اسقدر سامان ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا خصوصاً وہ
عالم انگریز جس نے وہ کتاب لکھی ہے جسکا پہلے میں نے ذکر کیا۔ ایسا عمدہ شخص اسکے
جواب کے لائق ہے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا۔ ہوش
جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کا شہر ہے۔ مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے
اور نقل کی سب کی اجازت ہو گئی۔ ابھی کتبخانہ برٹش موزیم نہیں دیکھا۔
سنا ہے۔ کہ وہ اس سے بھی بہت بڑا ہے۔ بہر حال میں کچھ نہ کچھ نسبت جواب کتاب ولیم میور
صاحب کے کچھ کرونگا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ آپ ہمیشہ عنایت نامہ بھیجتے رہیں۔ اس کے
پہنچنے سے جسقدر خوشی اور روحانی فرحت ہوتی ہے۔ بیان نہیں ہو سکتی۔ حافظ جی صاحب
کی خدمت میں میرا بہت بہت سلام پہنچے۔ میرے ہمراہی سب بخیریت ہیں۔ آپکو تسلیم
عرض کرتے ہیں۔ محمود کہتا ہے۔ کہ میرا اسلام مت لکھو۔ میں خود جدا عریضہ لکھونگا۔ دو
عدد [illegible] مرسل خدمت ہیں۔ میں خود حاضر نہیں ہو سکا۔ اس لئے میری تصویریں آپکی قدمبوسی
کو پہنچتی ہیں۔ والسلام (خاکسار سید احمد) (۲۴ جون ۱۸۶۹ء) (بروز جمعہ مقام لندن)

جناب مخدوم و مکرم معظم سلامت۔

بعد سلام مسنون الاسلام عرض یہ ہے۔ کہ سب سے اوّل آپکو یہ خوشخبری سناتا ہوں۔ کہ حضور ملکہ معظمہ نے مجھکو بخطاب کمپینین آف دی سٹار آف انڈیا معزز و ممتاز فرمایا۔ اور تمغائے سٹار آف انڈیا مرحمت ہوگا۔ اب میں احباب کی دعا سے سید احمد خان بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ ہوگیا۔ مجھکو یقین ہے۔ کہ اس امر سے آپ سب سے زیادہ خوش ہونگے۔ اسلئے کہ باقی احباب کو ذرا عقل کم ہے۔ یہاں کے تمام معزز انگریز دوستوں نے اسقدر مبارک باد دی ہے۔ اور ایسا معزز خیال کیا ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے لارڈ لارنس گورنر جنرل بہادر نے میرے لیے جلسہ منعقد کیا ہے۔ اور بڑے بڑے رؤسا و امیران کو ملاقات کیلئے بلایا ہے۔ ۲۳ تاریخ وہ جلسہ ہوگا۔ تحریر یہ ہے کہ شخص جس کی کتاب کا اشتہار میں نے پہلے روانہ کیا ہے۔ وہ ایک اور کتاب لکھنی چاہتا ہے جس میں وہ ان اعتراضوں کا بالتخصیص جواب لکھیگا۔ جو معراج اور شق صدر کی نسبت لوگوں نے کئے ہیں۔ اس تحریر میں وہ مجھ سے بھی مدد چاہتا ہے۔ اس لئے آپ کی خدمت میں التماس ہے۔ کہ بمجرد پہنچنے عریضہ ہذا کے کتب مفصلہ ذیل میں سے مقامات مندرجہ ذیل بہت خوش خط نقل کروا کر بھیجدیجئے۔ خداکیواسطے اپنے ہاتھ سے لکھیگا۔ یقین ہے۔ کہ حافظ جی صاحب یہ تکلیف گوارا کریں گے۔ اگر کوئی لفظ غریب ہو۔ ضبط اعراب بھی اُسکا فرما دیجئے۔ اور مشکل لفظ کا حل یا ترجمہ تاکہ یہاں لغت میں دیکھنے کی حاجت نہ پڑے۔

۱۔ نمبر۔ صحاح ستہ اور موطا امام مالک میں سے کل حدیثیں متعلق شق صدر اور معراج نقل فرما دیجئے۔ بالکل پوری نقل ہو۔ معہ کامل سند یعنی اسماء راویوں کے کچھ اختصار یا خلاصہ نہ کیا جائے۔

۲۔ نمبر۔ تفسیر کبیر میں سے آیات مفصلہ ذیل کی بجنسہ تفسیر۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ۔ اِلٰی اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔

۲۔ نمبر سورۂ نجم۔ از اول الی آیت لقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ ۵

۳۔ نمبر تفسیر آیۃ وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الخ

۴۔ نمبر علاوہ اس کے اگر کوئی بات آپ مناسب سمجھیں۔ تو ارقام فرماویں۔ ان دونوں مسئلوں کے جواب میں جو کچھ اصلی یعنی مصنف کتاب انگریزی کی رائے ہے سو ہمارے فائدے سے خالی نہیں ہے۔ فرض کرو۔ کہ کوئی بات وہ ایسی لکھے۔ جو عام مذہب کے برخلاف ہو۔ ہمارا کیا۔ وہ ایک انگریز نے کہی ہے۔ مگر بقدر کہ وہ تشریف تائید اور صحت ان واقعات کی و صداقت اور تصحیح بیان کرنا پیغمبر صادق صلعم کا انگریزی روش پر بیان کریگا ہمارے نہایت مفید ہوگا۔ اور مسلمانان انگریزی خوان کو بہت فائدہ پہنچیگا۔ ان کے کانوں میں کچھ اچھے اچھے خیال ہمارے مذہب کی جانب سے جاویں گے۔ اب تو انگریزی میں بکثرت برائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ سوا سلام۔ (خاکسار سید احمد)

(مقام لندن) (۱۲ جون ۱۸۶۹ء)

از برخورداران شفیع۔ و مرزا خداداد بیگ سلام پہنچا ہو۔

بخاری میں شرح صدر دو جگہ ہے۔ کتاب المعراج میں اور کتاب الصلوٰۃ میں دونوں جگہ سے نقل بھیجئے گا۔ کتاب المعراج کے اخیر میں ایک حدیث ہے جس میں یہ لفظ ہیں۔ [illegible] رضی اللہ عنہم۔ اس حدیث کو بھی نقل بھیجئے گا۔ فقط

(۴)

جناب مخدوم و مکرم من

آپکا عنایت نامہ مورخہ ۸ تاریخ پایا

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

جس قدر کہ مسرت آپکے خط سے ہوئی ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اتنی قدر خوشی کی ہوتی جس محبت سے لکھا تھا وہ اثر اس خط میں موجود تھا۔ اور آنکھ سے پڑھ کر دل میں پہنچتا تھا۔ جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے۔ ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محبت ہوا۔ کہ گویا سمجھتا تھا۔ کہ وہ شعر میں نے

آپ کے حق میں لکھے ہیں۔ اور اس کیفیت سے وحدت وجود کے مسئلہ کا عقدہ حل ہوتا تھا ؎

میان احمد و مہدی نہ ہیچ ہست حجاب۔
تو خود حجاب خودی احمد از میاں برخیز۔

پھر بے تصنع آپ سے کہتا ہوں۔ کہ آپ کے خط شکستہ رقم نے اور بھی زیادہ لطف دیا۔ دو تین دفعہ پڑھنا پڑا۔ ایک دفعہ کے پڑھنے میں جو لفظ رہ گیا تھا۔ دوسری دفعہ میں نکلا۔ اور بہت زیادہ مزہ دیا۔ اسی وقت میرے دل میں مرزا مرحوم کا یہ شعر گذرا ؎

ز لکنت میطپد نبض رگ لعل گہر بارش۔
فریب انتظار جلوہ خویش است گفتارش

پہلے خط میں جو بھیج چکا ہوں سیکرٹری آف انڈیا کی خوشخبری سنا چکا ہوں۔ میں انڈیا آفس میں صاحب سکرٹری برہند کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب اسباب بغاوت معہ تمام و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اُسے دیکھ کر مجھ کو بہت دل خوش ہوا۔ جو پھر انکی اس کی بدولت قرار پائیں آپکا بیان بیجا ہے اگر یہ ہمدرد ناقدردانی و وحشت کش اور اپنے خیرخواہ کے دشمن ہیں۔ مگر میں خوش ہوں کہ میرے ہم وطنوں کی بھلائی ہوئی۔ اب میں ایک اور کتاب انتظام گورنمنٹ انڈیا پر لکھ رہا ہوں۔ انڈیا کونسل کے بعض ممبروں نے فرمایا۔ کہ ہم ایک دن فرصت کا مقرر کر کے ہندوستان کے باب میں گفتگو کریں گے۔ کچھ تھوڑی سی گفتگو نسبت انتظام کے ہوئی نہایت مفید تسہیل ہوتی۔ اگر وہ کتاب میری چھپی۔ اور مجھ میں اس کے چھاپنے اور انگریزی عبارت کی اصلاح کا جو خرچ ہوگا۔ اس کے خرچ کا مقدور ہوا۔ تو آپ دیکھ لیں گے کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ اور اس کتاب سے کس قدر فائدہ ہوگا۔ اور بہت صاف صاف لکھ رہا ہوں۔ بغیر چھاپہ ہونے کے اس کی شہرت اور تمام لوگوں تک پہنچنا اور ہر جگہ اس پر بحث و گفتگو نہیں ہو سکتی۔ اور بغیر اس کے کچھ فائدہ نہیں۔ آپ کے نزدیک جو باتیں قابل گفتگو زبانی کے ہوں۔ یا قابل اندراج کتاب ان کو بہت جلد ارقام فرمائیے۔ جس دن کہ ہاتھ میں آئے گا کل کیفیت اخبار نذر پیش کرنے

دعوت میں مجھے بلایا۔ اس رات وہاں مسٹر پالک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی
انہوں نے اپنا پتہ لکھدیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا۔ وہ گھر پر نہ تھے ملاقات نہیں
ہوئی۔ آپکو معلوم ہے۔ کہ کرایہ کی بگی میں کیا خرچ پڑتا ہے۔ دس روپیہ روز میں
نے کہا۔ مرے۔ اسلئے دوبارہ نہیں گیا۔ پھر کسی دن جاؤنگا۔ اس وقت میرے پاس
تیئس چٹھیاں ملاقات کی اور دس بارہ ٹکٹ رکھے ہیں۔ اور یہ سب امرا اور
لارڈ اور سر ہیں۔ صرف خرچ سواری کے ڈر کے مارے کہیں نہیں گیا۔ ورنہ خیال
کرسکتا ہوں۔ کہ کیونکر سب سے ملونگا۔ جو لوگ کہ میرے گھر پر آجاتے ہیں۔ لاچار
ان کے ہاں یا جس کے پاس نہایت ضروری جانا چاہیئے۔ سو مَیں جاتا ہوں۔ سو اب
تک سوائے ایک دفعہ کے دوسری دفعہ کی نوبت نہیں پہنچی۔ ایک آدمی ڈیڑھ سو روپیہ
مہینے میں یہاں بخوبی باآرام گذر کرسکتا ہے۔ الّا جبکہ آنا جانا چاہیئے۔ اور لوگوں سے
ملے اور عزت کے ساتھ جانا آنا چاہیے۔ تو صرف سواری کا خرچ چار سو روپیہ
ماہواری پڑیگا۔ کبھی ایک گھوڑا اور کبھی دو گھوڑے کی بگی نصیب ہوگی۔ بعضے
ایسے موقع ہوتے ہیں۔ کہ وہاں ضرور دو گھوڑوں پر جانا چاہیئے۔ شب گذشتہ
کو صرف محمود کی ایک انگریز نے دعوت کی تھی۔ دو گھنٹے وہاں لگے۔ اور ایسی ہی ٹٹر یل
گاڑی بگیہ میں گئے تھے۔ جیسے بنارس میں دو دو تین تین آنے کرایہ کے یکے ہوتے
ہیں۔ سات شلنگ یعنی ۳ روپیہ خرچ ہوئے۔ اب موافق یہاں کی رسم کے دوسرے
یا تیسرے دن صاحب خانہ سے ضرور ملنے جانا چاہیئے۔ اسیقدر پھر خرچ ہوگا۔
صرف ایک دوست کے ہاں بلا تکلف جانے میں سات روپیہ خرچ ہوئے۔ پس
مجھکو خرچ کی بڑی فکر ہے۔ اور نہایت اندیشہ ہے۔ کہ کیا ہوگا۔ اسلئے حد سے
زیادہ تنگی سے خرچ کرتا ہوں۔ تصویریں تمام بادشاہوں کی اور سلطان روم کے
جلسہ کی سب ہیں۔ نہایت عمدہ کتاب جسمیں قرینہ قرینہ سے سب تصویریں تمام بادشاہ
روئے زمین کی حسب خواہش لگی ہوں۔ اور کتاب البم فرمائشی حسب خاطر خواہ تیار
ہو۔ تو سو ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوگا۔ میں نے تو قسم کھائی ہے۔ اگر آپ کو شوق

ہو۔ تو از راہ عنایت ہو بندہ سب طرح طیار کر کے بھیجدیگا۔ حماقت سے اس غرنگی کی کتاب چھپالی ہے۔ صرف ۵۰ روپیہ تو خود چندہ میں دیئے۔ اور لوگوں کے پاس سے روپیہ نہ آیا۔ تو کئی سو روپیہ کا دھبہ لگیگا۔ کیونکہ جن احباب کو لکھا ہے۔ ان میں بعضے ایسے بھی ہیں جنسے اس کی تعمیل کی توقع نہیں ہے۔ اور وہ کتاب قریب نصف کے چھپ چکی ہے۔ دو ہفتہ میں تمام ہو جاوے گی۔ اور چھاپہ خانہ کا بل میرے نام پر پہنچیگا۔ مولوی امداد العلی کا نہایت شکر گذار ہوا۔ کہ بخیر یاد کیا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمام اہل ہند اور خصوص مسلمان بخیر یاد کریں۔ بلکہ اپنا غلام سمجھیں۔ التزام تقلید غیر کو شرک فی صفۃ النبوۃ کہنے سے توبہ کرتا ہوں۔ توبہ توبہ توبہ مگر دل سے نہیں سے "زیں توبہ ناصواب توبہ" محمود سے میں نے کہا۔ کہ تمہاری طرف سے کچھ لکھدوں۔ اس نے کہا۔ کہ آپ کچھ نہ لکھئے۔ میں خود خط لکھونگا۔ جناب مولوی معین الدین صاحب کا سلام پہنچنے سے مجھے ستار آف انڈیا کی خوشی سے کچھ کم خوشی نہیں ہوئی۔ میرا بہت بہت سلام مسنون عجز و نیاز مشمول دست بستہ عرض کر دیجیے گا۔ والسلام۔

(خاکسار محبت گزین شما سید احمد) (مقام لندن) (۸ اجون ۱۸۶۹ء)

دیکھو نالائق زین العابدین نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ پرچہ چاہیے کہ اس نالائق پاس بھیجدینا۔ بخدمت حافظ جی صاحب سلام۔ جو تکلیف کہ پہلے خط میں دی ہے۔ وہ معاف فرمادیں گے۔

(۵)

قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش۔
اصطلاح عشق بسیار است و من دیوانہ ام۔

اے میرے مخدوم میرے محبّ میرے محبوب میرے۔ اب تو صاف لکھدوں ہو سو ہو۔ منہ ۱۲) سلامت۔
آپکا عنایت نامہ پایا۔ اور عجیب کیفیت میں مبتلا کیا۔ کبھی اپنے آپ کو دیوانہ

سمجھتا ہوں کبھی مجھکو دیوانہ جانتا ہوں جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ کبھی اسپر بزور یقین
لاتا ہوں۔ پھر شک میں پڑجاتا ہوں۔ اگر آپ لندن میں آ دیں۔ تو مجھکو اور بالخصوص
محمود کو جو خوشی ہو۔ اسکا اندازہ غیر ممکن ہے۔ مگر میں تو ان سب باتوں کو اب تک
واہیات سمجھتا ہوں۔ آپکا عنایت نامہ پہنچنے کے بعد میں مسٹر پالک صاحب کے
گھر گیا۔ اتفاق سے وہ نہیں ملے۔ اور آج ڈاک ہندوستان کی روانہ ہونیوالی تھی
اس لئے یہ خط لکھنا ضرور پڑا۔ ورنہ ایک ہفتہ اور تاخیر ہوتی۔ دس ہزار روپیہ قرض
ملنا نہایت مشکل ہے۔ میں نہایت تکلیف ابھی اٹھا چکا ہوں۔ باوجودیکہ جائداد
رہن کی۔ اور پانچہزار روپیہ کا سود بحساب ۱۲ فیصدی اور پانچہزار کا سود بحساب ۸
فیصدی دیتا ہوں۔ جس نے قرضہ دینے کا آپ سے اقرار کیا۔ واہیات اقرار ہے
اسکا وعدہ وفا کرنا میری دانست میں ناممکن ہے۔ پس جبکہ جڑ ایسی بودی ہے
تو اسپر عمارت بنانے کا خیال محض لغو اور بیفائدہ ہے۔ فقط۔
گورنمنٹ قرضہ لینے کو منع نہیں کرتی۔ اور نہ اجازت لینے کی ضرورت ہے
کیونکہ اسمیں مشکل پڑ جاوے گی۔ درخواست رخصت میں صرف اسقدر لکھنا
بس الفاظ سے کافی ہوگا۔ کہ بعد آجانے منظوری رخصت اور طیار ہوجانے کے
سفر ولایت کو میں فلاں شخص سے اسقدر روپیہ قرض لونگا۔ کیونکہ بعد حصول
رخصت اور پرمٹ چھوڑنے کام کے اس ضلع سے قرض لینا خلاف قانون
نہیں سمجھا۔ یہ صورت اس وقت ہے جبکہ وہ شخص قرض دہندہ تمہارے علاقہ کا نہ
ہو۔ ورنہ اسکی کچھ ضرورت نہیں۔ یہاں تک میں خط لکھ چکا تھا۔ کہ جناب لا
ارنس صاحب گورنر جنرل و ویسرائے ہندوستان میرے ملنے کو تشریف لائے
جو وہ تشریف لیگئے۔ تو پھر خط لکھنا شروع کیا۔ ہر سال لڑکے اسکالرشپ پاتے
ہیں۔ اپنے چچازاد بھائی پر تاکید کردو کہ پڑھنے پر محنت کریں۔ اور بنارس کالج
بھیجدو۔ آخر سال میں انٹرنس کا امتحان ہوگا۔ اس میں پاس ہو جاویں تو
اسکالرشپ ملنے کو امتحان کی ضرورت نہیں۔ مگر سر ولیم میور صاحب کی رائے

جو باتیں آپ نے لکھی ہیں بجز دس ہزار روپیہ قرض لینے کے اور کوئی مشکل نہیں ہے۔
اگر حقیقت میں تم چاہو تو بخوبی آسکتے ہو۔ اور کچھ بہت روپیہ درکار نہیں ہے دو ہزار
روپیہ خرچ آمد و رفت اور دو سو روپیہ ماہواری خرچ قیام اینجا نہایت کافی ہے۔
پانچ ہزار روپیہ میں ایک برس۔ بخوبی بسر کر سکتے ہو۔ اور اگر رہو۔ تو اس عرصہ میں
نہایت قابل انگریزی میں ہو جاؤ گے۔ میں نے یہاں انگریزی میں شوق نہیں کیا
اور نہ ارادہ۔ مواعظ احمدیہ فی اسرار ملتہ محمدیہ لکھ رہا ہوں۔ انگریزی میں ترجمہ ہو رہا ہے
خدا پورا کرے۔ اس کے مضمون دیکھ کر تعجب تو آپ بھی کریں گے۔ لیکن اور بہت سے
کافر مسلمان کافر بتائیں گے ؎

نہ کافرم نہ مسلماں نہ دل بدست نہ دینم
خدائے بر دل من دارد آگہی کہ چنینم۔

افسوس کہ کوئی یہاں مددگار نہیں۔ میں نے یہاں بڑی غل مچائی ہے۔ کہ ہندوستانی
افسروں کو جو ولایت آنا چاہیں۔ رخصت بلا وضع تنخواہ ملنی چاہئے۔ اکثر ممبران انڈیا
کونسل کان بھی میری فریاد پر رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی درخواست پیش کی
ہے۔ نقل اس کی آپ کے ملاحظہ کو بھیجتا ہوں۔ اگر یہ ہو گیا۔ تو بلاشبہ آپکو رخصت
بہ تنخواہ پر مل سکے گی۔ اسوقت ڈاک کا وقت تنگ ہوتا ہے۔ آئندہ ڈاک میں اور
حال لکھوں گا۔ والسلام۔
(خاکسار سید احمد) (از لندن) (جولائی ۱۸۶۹ء روز جمعہ)

(۶)

مخدوم و مکرم بندہ سلامت۔
بعد سلام مسنون التماس یہ ہے کہ جس کتاب کے چھاپہ ہونے کا اشتہار
آپ نے بھیجا تھا۔ وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اس کے نسخے آپکے پاس
انشاءاللہ پہنچیں گے۔ آپ دیکھیں گے۔ کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا صحیح اختیار
کیا ہے۔ گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں۔ مسلمہ نہیں

ہے ۔ انگریز ہے جب آپ اسکی کتاب دیکھیں گے ۔ تو جانیں گے ۔ کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے ۔ اب ایک اور بات بھی ضروری ہے جو لکھتا ہوں ۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں ۔ اور کوئی برائی نہیں ہے ۔ جو مسلمانوں کیطرف منسوب نہ کی ہو ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں ۔ جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے ۔ اور جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے ۔ اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں ۔ اس لیے اس قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو ۔ نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے ۔ دو بہت بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں ۔ جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے ۔ ایک واقعہ اندلس کا ہے ۔ جسمیں سات سو برس تک مسلمانوں کی انگریزوں پر یعنی عیسائیوں پر حکومت رہی ۔ اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اس قوم کی کی ۔ نہایت ہی عجیب اور قابل فخر ہے ۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے ۔ یعنی آٹھ لڑائیاں ۔ جو مسلمانوں اور تمام عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں ۔ میں نے اس عالم صاحب سے کہا ہے ۔ کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھدیں ۔ اور ان کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو ۔ اور جسکا قصور اس میں ان کی منصفانہ رائے میں ہو ۔ سب لکھیں ۔ اور جو کہ وہ عالم صاحب نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے ۔ اور جرمن "لیٹن" ۔ فرنچ " گریک " زبانیں جانتا ہے ۔ اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھکر رائے قائم کرتا ہے ۔ صرف انگریزی کتابوں پر اسکو بھروسا نہیں ہے ۔ اسلئے امید ہے ۔ کہ جیسی بلا تعصب اس نے یہ کتاب لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھیگا ۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور طیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً خرچ ہوگا ۔ فی کتاب چار سو روپیہ پس میں چاہتا ہوں ۔ کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کر کے میرے پاس بھیجدیں ۔ چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہئے ۔ اور صرف احباب مخلصین سے چندہ ہو ۔ مثلاً میر ظہور حسین ۔ زین العابدین مرزا رحمت اللہ

اور اور احباب سے ملاقات کریں۔ اور زبانی بات چیت کریں۔ اور جو جسکی توفیق ہو۔
اُس سے لیکر جمع کریں۔ نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے۔ کہ میں احباب کا نام
لکھتا ہوں۔ اور اسمیں مولوی سمیع اللہ خاں کا نام نہیں لکھتا۔ اور جو کہ اب وہ اپنے
تئیں اتقا میں جنید و شبلی و ابی حنیفہ سے مقدم اور اور لوگوں کو یا فاسق گنہگار یا کافر
مرتد سمجھتے ہیں۔ اور دانائی اور دور اندیشی میں بھی اپنے برابر کسی کو نہیں جانتے۔ اور ایک
حقارت کی نگاہ سے ہر ایک کو دیکھتے ہیں۔ اس لیئے میں نہیں چاہتا۔ کہ آپ ان سے
کچھ تذکرہ اسکا کریں۔ اور حقیقت میں وہ شریک نہیں ہونے کے۔ اور کچھ دب گئے۔ آئندہ
آپکو اختیار ہے۔ ایک عجیب بات سنیئے۔ کہ جو کتاب چھپ چکی ہے۔ اس میں مصنف
نے لکھا ہے۔ کہ جو الزام جلا دینے کتب خانۂ مصر کا نسبت حضرت عمرؓ کی لکھا ہی
غلط ہے۔ اور یونانی اور رومی تاریخوں سے ثابت کیا ہے۔ کہ وہ کتب خانہ جولیس
سیزر کے وقت میں جلا بموقوف شیخی پسند بعض ناواقف مسلمان مورخوں نے اسی واقعہ
کو مسلمانوں نے جب فتح مصر کی اس کے ساتھ لگا دیا۔ اس امر کا ایسا مستحکم ثبوت
دیا ہے۔ کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا۔ جسمیں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ موعظ
احمدیہ کا ایک وعظ طیار ہو گیا۔ انگریزی میں چھاپہ شروع ہو گا۔ اُردو کتاب کے چھاپہ
میں یہاں بہت لاگت لگتی ہے۔ بعد چھاپہ چند نسخے آپ کے پاس بھیجونگا۔ (نادانم کہ
مخدومم چہ میگوید) خدایا مخدومم مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند باک نیست زیرا کہ این معاملہ
مرا بانست نہ با مخدوم من مہدی لیکن محبت من از و محبت او از من گم مگرداں۔ او خدا
داند کہ راز ہائے پوشیدہ درون سینہا تو میدانی کہ من با تو و باوے بحقِ اسلام دادۂ تو
چہ میکنم و چہ اعتقاد دارم۔ پس اگر مرا محبوب مہدی لا مذہب یا کافر گوید یا سمیع اللہ
و امداد العلی مرتد داند مرا چہ باک۔ تو بر من مہرباں باش۔

ع۔ دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست

والسلام

(خاکسار سید احمد) (۲۲ جولائی ۱۸۶۹ء) (مقام لندن)

(۷)

جناب مخدوم و مکرم من سلامت۔

بعد سلام مسنون عجز و نیاز مشحون عرض یہ ہے۔ کہ آپکا عنایت نامہ مورخہ ۱۸ر جون پہنچا۔ عجب اتفاق ہے کہ میرا نیاز نامہ مورخہ ۴ر جون آپ کے پاس پہنچا۔ اور جو عریضہ مع اشتہار اس سے پہلے روانہ کیا۔ وہ نہیں پہنچا۔ غالباً پہلا عریضہ شوخفن کی راہ گیا۔ جو نہایت بھیر کا رستہ ہے۔ مگر امید ہے۔ بعد اس کے پہنچ گیا ہوگا۔ ایک انگریز نے جسکا نام مسٹر جان ڈیون پورٹ ہے۔ حمایت مذہب اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا حال لکھا ہے۔ اور جس قدر اتہام اور الزام انگریزوں نے آنحضرت صلعم پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں۔ اسکا جواب دیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی۔ اسکا چھاپہ ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا۔ میں نے کل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی ہے اور احباب سے [illegible] روپیہ اسکی لاگت ادا کرنے کو طلب کیئے۔ اور بعوض اسکے بارہ بارہ کتابیں دی جاوینگی۔ اسی بابت [illegible] روپیہ آپ سے بھی طلب کیے تھے۔ پس اگر وہ خط نہ پہنچا ہو۔ تو اب فی الفور [illegible] روپیہ بھیجدو۔ وہ کتاب طیار ہو گئی چھپ چکی۔ آئندہ میل میں روانہ کرونگا۔ تصویر مسٹر ڈیون پورٹ کی بھیجتا ہوں۔ نہایت تعظیم و ادب اور محبت رکھنے کے لایق آدمی ہے۔ فقط جن لفظوں میں آپ نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا۔ اور جن سے آپ کو افسوس ہوا۔ اسکا عذر کرتا ہوں۔ اور معافی چاہتا ہوں۔ ہاتھ جوڑکر مہندوستانی نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں افسوس کہ مجھے ایسے لفظ لکھنے نہ آئے تھے جن سے آپکو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجئے۔ جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا۔ تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا۔ کہ تم ناپسند کروگے۔ بھائی کیا تم یہ بات پسند کر سکتے ہو کہ میں [illegible] کروں۔ اور اسکو اسلئے چھپاؤں کہ [illegible] تم کو اپنے خدا سے [illegible] ہے۔ جب [illegible] کے ہاتھوں سے اپنے [illegible] ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا جو کلام [illegible]

دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے۔ جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے۔ ایسا
پیچھے چمٹتا ہے۔ کہ نہ جہاز میں چھوڑے۔ نہ زمین پر چھوڑے۔ نہ رات الگ ہو۔ نہ دن کو
الگ ہو۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور
درست اعتقاد سے ایسا دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی۔ تو پھر بھائی مہدی علی
سے کیا ڈر کرتا۔ میں اسکو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں۔ نہ روایت فتاوہ سے بہرحال میں
اس میں گفتگو نہیں کرتا۔ شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ سے
نہایت سچے دل سے التجا کرتا ہوں۔ کہ بعض آقاؤں کے نہایت بدخصلت اور بدکردار
غلام ہوتے ہیں۔ وہ آقا اپنے غلام پر ناراض تو ہوتے ہیں۔ مگر اس غلام کو غلام سمجھے جاتے
ہیں۔ اسیطرح گو آپ میری حرکاتِ ناشائستہ سے ناراض ہوں۔ مگر مجھکو اپنا غلام سمجھتے
رہیں۔ "برمن منگر بکرم خویش نگر"۔ یہ الفاظ میں نے نہیں لکھے۔ میرے دل نے لکھے
ہیں۔ والسلام فقط۔

والی مصر کیساتھ بعض علماء مصر بھی تھے۔ سب انگریزوں کیساتھ غیر ذبح کئے ہوئے جانور
چٹ کرتے تھے ۱۲

میں دو دفعہ پالک صاحب کے پاس گیا۔ اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چار پانچ
روز ہوئے۔ کہ وہ ازراہ عنایت میرے مکان پر مجھسے ملنے آئے۔ بہت عنایت سے
ملے۔ اور بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ میں نے عرضی پیش کی۔ اور بہت کچھ کہا۔ اور جو
امداد کا وعدہ انہوں نے کیا تھا۔ وہ یاد دلایا۔ انہوں نے بہت غور سے سنا۔ اور غور
وفکر کرتے رہے۔ اور کہا۔ کہ ہمارے پاس بھی ان کی انگریزی چٹھی آئی ہے۔ میں نے
صاحب کلکٹر مرزاپور کے نام چٹھی لکھنے کو کہا۔ بعد تمام گفتگو کے یہ جواب دیا۔ کہ ہم
لکھیں گے۔ اور مہدی علی کو بھی خود لکھیں گے۔ اب وہ مفصل میں چلے گئے ہیں۔ دو
مہینے تک واپس آوینگے۔ اور وعدہ کر گئے ہیں۔ کہ بعد آنے کے تم سے بہت دفعہ
ملونگا۔ اور بہت بات چیت کرونگا۔ پس انہوں نے اس عرصہ میں کچھ نہ کیا۔ تو جب وہ
واپس آوینگے۔ پھر ذکر کرونگا۔ میں آپ کے لئے تصویرات جمع کر رہا ہوں۔ اور نہایت

سلیقے سے عمدہ البم میں لگاؤنگا۔ اور مکانات کی تصاویر بھی لیتا جاتا ہوں۔ آپ اسقدر عذرات معذرانہ درباب ادائے قیمت کیوں لکھتے ہیں۔ میں نے خود تم سے قیمت طلب کی ہے۔ میں تم کو اپنے بھائی کے برابر سمجھتا ہوں۔ تم سے روپیہ لینے یا منگانے میں بروقت ضرورت یا بحالتِ لاچاری کچھ شرم نہیں ہے۔ بلاشبہ مجھکو خرچ کی نہایت تنگی ہے۔ ان تصویروں میں جو خرچ ہوگا۔ تم کو دینا ہوگا۔ بلکہ سو ڈیڑھ سو روپیہ اس کام کیلئے پیشگی بھیجدو۔ تو اور بھی بہتر ہوگا۔ مگر میں نے جمع کرنی شروع کردی ہیں۔ فقط

کتب خانہ انڈیا آفس کی کوئی چھپی ہوئی فہرست نہیں ہے۔ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی میں عربی فارسی نہایت قلیل معدود کتابیں ہیں۔ کتب خانہ برٹش موزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا ہے۔ کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں۔ انمیں سے تفسیر یاقوت التاویل کا حال دریافت کرکر آئندہ میل میں لکھونگا۔ فقط

سیور صاحب کی کتاب کے جواب کا سامان نہیں ہونے کا۔ اب اسکی توقع نہیں۔ ایک انگریزی خواں اور ایک طالب علم جو مقامات نشان دادہ کو کتب میں تلاش و نقل کرسکتا ہے۔ میرے ساتھ ہوتے تو ایک برس میں اسکا جواب لکھ لیتا۔ اب نہیں ہوسکتا۔ مگر میں اس کے مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ رہا ہوں۔ اور انہیں کا نام "مواعظِ احمدیہ" رکھا ہے۔ پہلا وعظ تیار ہوگیا۔ اسکا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں معتبر و غیر معتبر اور صحیح و غلط روایتیں شامل ہیں۔ اور وہ اس قابل نہیں ہیں۔ کہ ان کی ہر ایک بات اصلی مذہب سمجھا جاوے۔ پس جن لوگوں نے ہماری کتابوں کی روایتیں چن کر ہمارے مذہب پر یا جناب پیغمبر خدا صلعم کی نسبت الزام و اتہام دیا ہے۔ وہ حماقت ہے۔ کیونکہ اول یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ وہ روایت صحیح و معتبر بھی ہے۔ یا نہیں۔ مگر اس کا طرزِ گذارش سید کا صاف نہیں ہے، بیجدار شمشیر برہنہ ہے۔ اس کے مصنف کے دل میں بجز مذہب اسلام کی محبت کے اور کسی کی محبت نہیں ہے۔ اس نے اسطرح پر یہ وعظ لکھا ہے۔ جیسی کہ مولوی اسمٰعیل صاحب نے محبت توحید میں تقویۃ الایمان لکھی ہے۔ ایک مقام پر لکھا ہے۔ کہ

ایمہ مجتہدین کے مسائل اجتہادی اور قیاسی اصلی مذہب مسلمانوں کا نہیں ہے۔ وہ صرف ایک قانون دان کی رائے ہے۔ اگر ہزار ابو حنیفہ و شافعی کے مسائل اور اجتہادات غلط ہوں۔ تو مذہب اسلام کی نورانیت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ پس کسی مجتہد کی رائے پر اعتراض کر کر مذہب اسلام کو غلط قرار دینا بجز حماقت کے اور کچھ نہیں۔ باقی حالات ڈاک آئندہ میں لکھونگا۔ حافظ جی صاحب کیخدمت میں بہت بہت سلام عرض کر کے کہنا۔ کہ اگر آپ ابھی میری غیر مذبوحہ مرغی سے ناراض ہوئے ہوں۔ تو للہ معاف فرمائیے گا۔

والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (۶۔ اگست ۱۸۶۹ء) (روز جمعہ مقام لندن)

آج دربار ہے۔ اور میں ستار آف انڈیا۔ بیننے جاتا ہوں۔ فقط

برخوردار حامد تسلیمات عرض کرتا ہے۔ مرزا خداداد بیگ سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔

(۸)

مخدوم من و محبوب من سلامت۔

تسلیم نہ صرف لفظ تسلیم بلکہ دل و جان تسلیم۔ نامہ محبت مورخہ ۱۸ جولائی یافتم مسرتے کہ آن پذیرفتم پایانی ندارد۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردہ۔ اشعار آبدار آں محبت نامہ بجانم خلید و روانم چنید مگر ایں اتحاد روحانی و جسمانی را باید نگریست۔ کہ احمد و مہدی دریک بحر و مضمون گنجیدہ اند ؎

مشتاق جمال تست ایں احمد شیدا ہم۔

در مصرع اول کہ خطاب بمن فرمودہ اند اگر بجائے لفظ دیدارت احوالت بودے۔ نہایت مناسب حال من بودے۔

"آنی کہ باحوالت خلقے است تماشائی"۔ وہذا ہو الحق۔ آنم کہ باحوالم خدا ایست تماشائی" اگرچہ علم است ہمیں قدر است کہ نمیدانم کہ خدائی من تماشائی کدام احوال من میکند۔ انہ ہو الغفور الرحیم

گناہ من ار نیامدی در شمار ؎ ترا نام کے بودے آمرزگار

میں یا حدیث و سیر یا تفسیر میں کوئی ایسی قوم بھی عرب میں پائی جاتی ہے جسمیں رسم ختنہ
نہ ہو۔ عرب میں سوائے اولاد حضرت ابراہیم کے اور قومیں بھی آباد تھیں۔ اگر یہ بھی ثابت
ہو جاوے۔ کہ ان قوموں میں رسم ختنہ نہ تھی تو نہایت عمدہ بات ہے۔ نقول مقامات
جو سابق میں طلب کی ہیں۔ یقین ہے۔ کہ اب تک روانہ ہو چکی ہوں گی۔ بشرطیکہ
حافظ جی صاحب نے مہربانی کی ہو۔ اور میرا بہت بہت سلام ان سے کہئے۔ اس بات
کے دریافت ہونے سے کہ صاحب کمشنر بہادر نے آپکے خلعت کی بھی رپورٹ کی حد سے
زیادہ خوشی ہوئی۔ خدا مبارک کرے۔ اسکی منظوری سے انشاء اللہ تعالیٰ جلد خوشی
حاصل ہوگی۔ بھائی مہدی تم پانیر اخبار الہ آباد میں سے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو۔
وہ لکھتا ہے۔ کہ آجکل ہندوستان میں خاندانی مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے
ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں۔ وہ بھی
ضعیف ہیں۔ جلد پنشن لینگے۔ اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونیکا۔ اور آئندہ
بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا۔ دیکھو جو میں کہتا تھا
اور جسکا غم کرتا تھا۔ اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹیکل بہت بڑا ہے۔ اور کہیں
سے دستیاب ہو۔ تو بھیجونگا کر انکل سنو۔ بہرحال تمکو عزت خدا دے۔ وہ تمام قوم کی عزت
ہے۔ اور مجھکو دہری خوشی ہے۔ ایک قومی۔ دوسری خاص محبت و محبت کی۔ اللہ
تعالیٰ ہمیشہ با اقبال رکھے۔ حامد کچھ دل پڑھنے پر نہیں لگاتا۔ بہرحال گھر میں پڑھانے کے
سو روپیہ مہینہ کا آدمی نوکر ہے۔ جو تین گھنٹے آکر حامد کو اور لیٹن محمود کو پڑھا جاتا ہے
مگر حامد کا دل نہیں لگتا ہے۔ دربار ملکہ معظمہ کی حاضری کیلئے مجھ سے کہا گیا۔ مگر میں
نے بعض مصلحت کی نظر سے کہا ہے۔ کہ پھر کسی دربار میں حاضر ہونگا۔ ہمیشہ دربار ہوتے
ہیں۔ یہاں کے امراء سے دوستانہ ملاقات نہایت بے تکلف ہوتی ہے۔ اور کھانے
پر جانا ہوتا ہے۔ ہمیشہ محمود میرے ساتھ ہوتا ہے۔ اور وہ ذریعہ گفتگو اکثر ہوتا
ہے۔ وزیر ہند سے ایک دفعہ معہ حامد و محمود ملاقات ہوئی تھی۔ اور دو دفعہ صرف
میں تنہا ملا۔ میں نے انگریزی میں ان کی سب باتوں کا جواب دیا سب سمجھا۔

اور سب جواب صحیح دیئے۔ مگر نہایت بد خراب انگریزی میں۔ یہاں کے اکثر امرا اور ممبران پارلیمنٹ ہندوستان کے خیر خواہ ہیں۔ مگر چونکہ حالات سے بخوبی واقف نہیں ہیں اسلئے بعضے تو کچھ جانتے ہیں۔ اور بعضوں کی رائے کی نہایت غلطی ہوتی ہے۔ حال کی پارلیمنٹ میں جو بل متضمن مزید اقتدار گورنر جنرل ہندوستان پاس ہوا ہے۔ درحقیقت ممبران پارلیمنٹ نے نہایت نیک نیتی سے اور ہندوستان کا فائدہ سمجھ کر پاس کیا ہے۔ مگر ایسی غلطی رائے کی ہے جسکا بیان نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا۔ اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کیلئے ہے۔ اگر انگلستان میں یہ قانون جاری ہوتا۔ تو کل رعیت اسکی منسوخی کی درخواست کرتی۔ میونسپل کے قانون سے میں مختلف الرائے نہیں ہوں۔ صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ حکام انگریزی اس روپیہ کو بیجا صرف نہ کریں۔ ٹیکس کے باب میں کچھ گفتگو نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت آمد و خرچ پورا نہیں ہے سو کتاب طیار ہو گئی۔ آج کی ڈاک میں دو جلدیں میر ظہور حسین صاحب کے پاس بھیجی ہیں اسلئے کہ الہ آباد کے بعض عقلمند صاحبان فرماتے ہیں کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ آج کی ڈاک میں آپ کے پاس دو جلد روانہ کرونگا۔ اور باقی کتابیں جہاز میں پھیر کے رستے سے روانہ کرونگا تاکہ محصول کم خرچ ہو۔ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (از لنڈن) (۲۰۔ اگست ۱۸۶۹ء روز جمعہ)

چھجو آداب و تسلیمات عرض کرتا ہے۔ اور اسوقت میرے سر پر کھڑا ہے۔ اور آپ کی تصویر مانگتا ہے۔ اس نے بھی ایک البم بنائی ہے۔ فقط۔

(۹)

جناب مخدوم و مکرم بندہ سلامت۔

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے۔ کہ دو قطعہ نامہ مورخہ ۴۔ اگست و ۵۔ اگست معہ ہنڈوی صہ روپیہ کے پہنچے۔ اور ممنون عنایت کیا۔ اپنے سفر کی بابت جو آپنے مجھ سے رائے پوچھی ہے۔ درحقیقت آپ کی رائے صحیح ہے۔ اگر آپ یہاں تشریف لائینگے۔ تو کچھ فائدہ جو معاوضہ اسقدر زیر باری قرضہ کا ہو نہیں ہونیکا۔ میں ہرگز

صلاح نہیں دیتا۔ کہ آپ اسقدر قرضہ اٹھاویں۔ اور برس روز کیلئے یہاں آویں۔ یہ اِس قدر بڑا شہر ہے۔ اور ایک ایسا بڑا کارخانہ ہے۔ کہ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا میرے واسطے جو کچھ یہاں ہوا۔ آپ اسکو تعجبات اور امورِ اتفاقیہ سے سمجھئے۔ صاف صاف یہ بات ہے۔ کہ یورپ صرف دو آدمیوں کے کام کا ہے۔ اوّل ان کے جو جوان نوعمر ہیں۔ اور علوم و فنون جدیدہ کی تربیت چاہتے ہیں۔ اور یورپ کی زبان سے واقف ہیں۔ دوسرے اُن لوگوں کیلئے جو صرف سیر کے خواہاں ہیں۔ یا اپنے ملک اور اپنے ملک کے لوگوں کی ترقی میں کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ سیر کا تو مختصر یہ حال ہے۔ کہ یہاں وہ چیزیں وہ کارخانے اور وہ صناع اور وہ عمارات اور ایسے عجائبات ہیں۔ لا عین رأت واذن سمعت امکان نہیں ہے۔ کہ جن لوگوں نے اسکو نہیں دیکھا۔ ان کے سامنے وہ بیان ہو سکیں۔ اور وہ سمجھ سکیں۔ جسوقت انسان یورپ کی سرحد پر پہنچتا ہے۔ حقیقت میں اسکو ایک نیا عالم معلوم ہوتا ہے۔ اور اسکو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ ہندوستان میں جاکر جو انگریز ہمکو مثل جانور کے جانتے ہیں۔ درحقیقت ہم ہندوستانی ایسے ہی ہیں۔ عقلمند اور نصیحت اور عبرت پکڑنیوالا آدمی تمام حالات اور رسم و رواج یورپ دیکھکر یہ بات سمجھ سکتا ہے۔ کہ کونسی رسمیں اور عادتیں ہندوستان کی اور خصوص مسلمانوں کی اچھی ہیں۔ اور کونسی خراب اور قابلِ تبدیل ہیں۔ اصولِ ایمانیہ اسلامیہ پر جسقدر یقین یورپ کے آنے سے اور یہاں کے حالات اور علوم اور علماء کی رائیں دریافت کرنے سے ہوتا ہے۔ بلاتشبیہ نعوذ باللہ ویسا یقین حج سے نہیں ہوتا۔ زیادہ تعجب یہ دیکھکر ہوتا ہے۔ کہ یہ سب کچھ جو ہوتا ہے۔ صرف تجّار سے اور آپس میں لوگوں نے کیا ہے۔ گورنمنٹ سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ اور یہ دیکھکر آدمی یقین کر سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں اگر بہت سے آدمی متوجہ ہوں۔ اور علوم و فنون و سوسائٹیز پر کوشش کریں۔ تو وہ بلا اعانت گورنمنٹ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ان خیالات سے اور حال دیکھنے سے عقلمند اور بیدار آدمی کو اپنے ملک کی ترقی اور بھلائی اور قومی خیر خواہی زیادہ بڑھتی ہے۔ جس شخص کے پاس روپیہ ہو اسکو صرف اسقدر کافی ہے۔ کہ یورپ آوے اور تین چار مہینے موسم گرما میں جبکہ یہاں سب کچھ جاری ہوتا ہے۔ ہر ایک چیز کی سیر

کرے اور چلا جاوے۔ اور اپنے ملک میں اس بھلائی کو پھیلاوے۔ مگر میں ہرگز رائے
نہیں دیتا تھا۔ اس امر کے حاصل کرنیکو قرض سے اپنا گلا بند ہاوے۔ پس میں آپ کو ہرگز
رائے نہیں دیتا۔ کہ قرض لیکر آپ یہاں تشریف لاویں۔ اور بالفرض اگر آویں بھی تو
چھ مہینہ سے زیادہ کیلئے آنا محض لغو و حماقت ہے۔ میرے حال پر خیال نہ کیجئے۔ میرا حال
جدا تھا۔ اور چند خیالات مجھکو تھے جنکے سبب میں نے جائیداد بیچی اور دس ہزار کا قرض کیا۔
عاقل و عیاش آدمی کیلئے جو خوشی اور نعمت یہاں متصور ہے۔ خدا معلوم بہشت
میں بھی ہوگی یا نہیں۔ میرے ایک بڑے معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں
جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے ہوئے کئی سو مرد و میم و لیڈی نہایت خوبصورت
و خوش کلام اور قابل جمع تھیں مجھ سے پوچھا۔ کہ کہو لنڈن بہشت ہے۔ اور حوروں کا ہونا سچ
ہے۔ کہ نہیں۔ پس مختصر حال و نتیجہ سفر یورپ کا یہ ہے۔ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا
ہے۔ یہاں کا حال دیکھکر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بیجا تعصب اور تنزل
موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اور کوئی تدبیر اپنے
ہموطنوں کے ہوشیار کرنیکی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جسکو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم نے خوب
اختیار کیا ہے۔ اس میں بھی وہی حماقت و نالائقی اور گمراہی ہے۔ جو اور تمام کاموں میں
ہے۔ پس کوئی کیا کرے۔ بداقبالی و بدنصیبی کا کچھ علاج نہیں۔ فقط

میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی صلعم میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے
لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ اِدھر فکر ترتیبِ مضامینِ کتاب۔ اُدھر فکر جواب اعتراضات
اُدھر فکر تنقیح و تصحیح روایاتِ صحیحہ میں مشغول رہتا ہوں۔ اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے
یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے۔ اُدھر جب حساب دیکھتا ہوں۔ تو جان نکل جاتی ہے۔ کہ الہی
لکھنا اور چھپوانا شروع کر دیا۔ مگر روپیہ کہاں سے آویگا۔ مسلمان البتہ آستینیں چڑھا
کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہونگے۔ کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ۔ مگر یہ نہ
کہو۔ کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو۔ تو جان بچا جاویں گے۔
دوسرا باب جسمیں عرب کا جغرافیہ اور وہاں کی قوموں کا۔ اور حضرت اسمٰعیل کے وہاں آکر

آباد ہونیکا ذکر ہے چھپ رہا ہے۔ عرب میں سے ایک کتبہ نکلا ہے۔ جو یہاں کے برٹش میوزیم میں موجود ہے وہ کتبہ آنحضرت صلعم سے بہت پہلے کا ہے۔ اور اس سے حضرت ہود کا عرب میں پیغمبر ہونا اور قوم عاد کے مکانات کا وجود بخوبی ثابت ہوتا ہے چنانچہ وہ کتبہ بعینہٖ اُسی خط میں معہ ترجمہ میری کتاب میں مندرج ہوگا۔

میری دانست میں نہایت خیرخواہی اسلام کی۔ اور سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی۔ کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں چھاپی جاوے۔ اسلیے انگریزی چھاپنا شروع کردیا۔ اور اردو ابھی ملتوی ہے۔ علاوہ اس کے انگریزی عبارت لکھنے والے جیسے عمدہ اور کم قیمت پر یعنی بہ نسبت ہندوستان کے کم قیمت پر ملتے ہیں ہندوستان میں ممکن نہ تھا جو شخص کہ میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے۔ اس کی لیاقت کا کوئی انگریز ہندوستان میں نہیں ہے۔ پس ایسا شخص ہندوستان میں کہاں ملتا۔ اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی جسمیں دس باب ہیں۔ تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھونگا۔ خدا قبول کرے۔ آمین۔

اس معاملہ میں سوائے تمہارے میں اور کسی کو کچھ نہیں لکھتا۔ اس لئے۔ کہ جو میرے دلی دوست ہیں۔ ان کو خدا نے عقل نہیں دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک دل سے شوق نہ ہو۔ صرف خاطر سے کچھ کرنا فائدہ مند نہیں ہے۔ بہرحال مجھکو اعانت کی نہایت ضرورت ہے۔ اول تو انتخاب و تحریر مقامات کتب و تحقیق بعض مسائل کی جو میں آپ کو لکھوں۔ آپ اسکو بخوبی انجام دیجئے۔ اس میں کچھ تامل نہیں۔ مگر اسقدر دیر نہ ہو جیسی کہ اب تک کی ہے۔ اسوقت تک حدیث معراج وشق صدر کی نہیں پہنچیں۔ دوسری بلاشبہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کم سے کم دو ڈہائی ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ آپ وہاں احباب مخلصین سے چندہ کیجئے۔ صورت چندہ کی یہ ہو۔ کہ جو جس کا مقدور ہے دے۔ اور بعد طیار ہو چکنے کتاب کے جسقدر روپیہ اس نے دیا ہے۔ اس قدر قیمت کی کتابیں اس کو دے دی جاویں۔ اس چندہ کرنے میں یہ خیال نہ کرنا چاہیے۔ کہ کل ڈھائی ہزار کا چندہ ہو۔ کیونکہ جسقدر ہو وہی غنیمت ہے۔ اور اسی قدر بوجھ ہلکا ہوگا۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ

میں میر ظہور حسین - میرزا رحمت اللہ بیگ - مولوی زین العابدین - تراب علی - محمد احمد - مہدی علی وغیرہ آدمیوں کو خط لکھوں - کہ مجھے ضرورت ہے - سو روپیہ بھیجدو - سوائے اسکے اور کچھ نہ لکھوں - یقین ہے - کہ یہ لوگ بھیجیں گے پس جسقدر مدد ہوگی - وہی غنیمت ہے - فقط -

دوسری صورت یہ ہے مکہ کسی مہاجن سے کچھ روپیہ قرض لیا جائے - اور اس کتاب کی طیاری میں لگا یا جاوے - بعد طیاری کے کچھ شبہ نہیں ہے - کہ یہ کتاب بہت بکیگی - اور انگریز بہت لینگے - آج تک مسلمان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب آنحضرت صلعم کے حال کی انگریزی میں نہیں ہے - پس اسکی قیمت سے اسکا روپیہ دیا جاوے گا - اگر نقصان ہو - تو میں اور وہ لوگ جو اس میں شریک ہوں - اداکریں - فقط

چند بڑے قابل انگریز جو مسلمان ہوگئے ہیں - ان کی لکھی ہوئی کتابیں نہایت تلاش سے بہم پہنچائی ہیں - اور دس گنی قیمت دیکر خریدی ہیں - ان میں ایک کتاب ہاتھ آئی ہے - جس میں اس انگریز نے نہایت خوبی سے یاتی من بعدی اسمہ احمدؐ کے فقرہ کو ثابت کیا ہے - کہ ویسی دلیلیں کبھی مسلمان مولوی کے خیال میں بھی نہیں گذر سکتیں - علاوہ ایں کیے میں کیا بتاؤں - کہ میں نے کیا کیا کہا ہے - اگر تم یہاں ہوتے - تو شاید بھولے نہ سماتے بلا تصنع میں آپ سے عرض کرتا ہوں - کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت ستار آف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی - عین آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے خواہ اسکو کوئی میری ضد سے حاصل کرے - خواہ میرے حسد سے - خواہ میرے ذلیل کرنیکو چشم ما روشن دل ما شاد - ان کا یہ فرمانا - کہ سید احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھاکر ستار آف انڈیا لیا - اور انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دیکر ہمیں نہیں بھول گیا - اُن کی مونچھیں نہیں ہیں - داڑھی پر ہاتھ پھیر میرے سر اور آنکھوں پر خدا کرے ایک ان کو اور ہزار مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو - حافظ جی صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام اور جب انتخاب احادیث پہنچیگا - جب شکریہ بھی کرونگا - جناب مولوی معین الدین کیخدمت میں السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ - السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین - وعلے الذین آمنوا

بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم و آمنوا بجمیع آیات اللہ وکلماتہ و آمنوا علی کلامہ تعالٰی
وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم ۔ والسلام ۔

(خاکسار سید احمد) (از مقام لنڈن) (۱۰ ۔ ستمبر سنہ ۱۸۶۹ء)
(بروزِ جمعہ)

(۱۰)

جناب مخدوم و مکرم من ۔ تسلیم ۔

پلندہ نقولِ مقامات کا پہنچا ۔ ممنون عنایت کیا ۔ میرے دل نے اور میری آنکھوں نے حافظ جی صاحب کا بہت بہت شکر کیا ۔ ایسا خوشخط تھا ۔ کہ آنکھوں کو روشنی ہوتی تھی مگر اسقدر خوشخط لکھنے کی کچھ ضرورت نہ تھی ۔ بہر حال دل و جان سے شکر ہے ۔ اگر وہاں ہوتا تو ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا لیتا ۔ فقط

میری یہ رائے ہے ۔ کہ سو سو روپیہ احباب مخلصین سے چندہ لیا جاوے تینتس ۳۳ آدمی جمع ہونے چاہئیں ۔ اسمیں جسقدر ہو جاوے بہتر ہے ۔ مگر تین ہزار روپیہ سے کم غرض نہیں ہونیکا ۔ تین آدمیوں کو خط لکھے ہیں ۔ محمد احمد ۔ مرزا عباس بیگ صاحب نواب ضیاءالدین خانصاحب مگر پہلے شخص سے شریک ہونیکی بہت کم توقع ہے آپ تو رعیت خاص ہیں ۔ پس آپ کو لکھتا ہوں ۔ کہ سو روپیہ بھیجدو ۔ بذریعہ ہنڈوی درشنی ۔ مولوی زین العابدین کو بھی خط لکھا ہے ۔ سو روپیہ للہ مانگے ہیں ۔ تعطیل دسہرہ میں آپ ضرور اُن سے ملیں ۔ اور اُن سے میرا خط لیکر ضرور پڑھیگا ۔ اور لوگوں کو بھی یعنی مرزا رحمت اللہ بیگ اور میر ظہور حسین اور میر تراب علی کو بھی لکھونگا ۔ مجھکو بعضی دفعہ خیال ہوتا ہے ۔ کہ ایسا نہ ہو ۔ کہ یارِ شاطر سے بارِ خاطر ہو جاؤں ۔ بہر حال خدا کیواسطے کرتا ہوں ۔ کچھ اپنا ذاتی معاملہ نہیں ہے ۔ کہ جس میں یارِ شاطر یا بارِ خاطر ہونیکا خیال کروں ۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے نہ خط کا جواب لکھا ۔ نہ سابق کے ۵۰ روپیہ اب تک بھیجے ۔ اس کا سبب نہیں معلوم ہوا ۔ اور سب جگہ سے جس جس کو لکھا تھا ۔ آ گئے ۔ فقط

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کل معجزات منتخب کر کے ایک فہرست مع مختصر حال کے بنائیے۔ ان میں سے جسقدر کہ غیر ثابت ہیں۔ ان کے اوپر تو لفظ غیر ثابت لکھدیجے۔ اور جسقدر کہ آپکے نزدیک ثابت ہیں۔ ان کا ثبوت لکھئے۔ اور جن کتابوں پر استدلال کیجئے۔ ان کی عبارت کی نقل کیجئے۔ اور جن لوگوں نے اس کے برخلاف رائے دی ہو۔ اسکا ردّ بتائیے۔ اور ایسی دجوہات بھی لکھئے۔ جو غیر مذہب والے پر حجت ہوں۔ اور یہ سب چیزیں میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں تو یہ سب کچھ لکھونگا مگر دیکھونگا۔ کہ یہ حضرات جو تقلید کی غلامی کر رہے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ بہرحال آپ ہر طرح پر اسوقت میں میری مدد کیجئے۔ جو بات جو مضمون میں آپ کو لکھوں اس کو آپ سمجھئے۔ کہ نہایت ضروری ہے۔ اور نہایت تاکید سے لکھا ہے۔ اور اسکا جلد اور نہایت جلد انجام دینا نہایت ضرور ہے۔ کیونکہ جو بات میں آپکو لکھ بھیجتا ہوں اس سے بیفکر ہو جاتا ہوں۔ کہ وہ ضرور انجام ہو جاویگی۔ آپ بھی اپنے مخلصین با اعتنا جو چندہ میں شریک ہوں۔ پیدا کیجئے۔ اپنے ماموں صاحب کو بھی لکھئے معاوضہ صرف اسقدر۔ کہ سو روپیہ کی قیمت کی کتابیں ان کو دے دی جاوینگی۔ روپیہ بہر نوع صرف ہوتا جاتا ہے۔ کتبے کھدوائے۔ نقشجات جو استدلالاً کتاب میں داخل ہونگے۔ بنوائے ہیں۔ صرف پنسل سے اس نقشہ کی بنوائی جسمیں سفر موسےٰ اور وادی الطّی اور بیابانِ فاران کا بیان ہے۔ للعہ دیئے ہیں۔ اور اب وہ چھپنے کو جاتا ہے۔ عنقریب اس شخص کا بل آنیوالا ہے۔ جو انگریزی عبارت لکھتا ہے۔ پس روپیہ بھیجنے میں اور شریکوں کے فراہم کرنے میں ذرہ بھی توقف نہ چاہئے۔ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (۱۷ ستمبر ۱۸۶۹ء)

(مقام لندن)

(۱۱)

جناب عالی۔

آپکا عنایت نامہ مورخہ بلا تاریخ پہنچا۔ تیسری ستمبر کو میں نے بہت بڑا خط لکھا تھا

بڑے مضمون اور مطالب اس میں تھے۔ افسوس کہ اس تاریخ کا میل جو جہاز لیکر چلا
تھا۔ وہ عدن کے قریب ڈوب گیا۔ میں نے بہت صاف صاف رائے آپکو لکھی ہے۔
درباب سفیر ولایت۔ یقین ہے۔ کہ انشاء اللہ پہنچیگی۔ اب میرا حال سنئے۔ مواعظ احمدیہ
کے لکھنے میں شب روز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا
جلنا سب بند ہے۔ آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا۔ اور سر ولیم
میور صاحب اور اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے۔ سب کے
ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ مگر ایسا جواب نہیں ہے جیسا کہ تمہارے ہاں
کے ملاں شریف بہانی صفحۃ النبوۃ دیتے ہیں۔ نہایت محققانہ جواب ہیں۔ اور یہ فخریہ
کہ کسی شخص کے آگے ڈالدو۔ کیسا ہی بیدین کیوں نہ ہو۔ اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت ٹھیک
اور انصاف کا جواب ہے۔ تو تو میرا نام ورنہ میرا نام ہی نہیں۔ اپنی تحریر کو آپ بھی دیکھتا
ہوں۔ اور ایسا خوش ہوتا ہوں۔ کہ بیان سے باہر ہے۔

دوسرا خطبہ جغرافیہ عرب کا قریب الاتمام ہے۔ نہایت عمدہ طور سے ثابت ہوا ہے کہ
فاران وہی میدان اور پہاڑ ہیں۔ جہاں کعبہ واقعہ ہے۔ معلوم نہیں۔ کہ آپ فاران
کے لفظ سے واقف ہیں۔ یا نہیں۔ کیونکہ یہ بہت بڑا رکن مباحثہ کا ہے۔ جسقدر لکھا ہے
وہ انگریزی ہو گیا۔ اور چھپ رہا ہے۔ اسوقت میرے سامنے دوسرے خطبہ
کے چند صفحے ورق چھپے رکھے ہوئے ہیں۔ پہلا خطبہ جو طیار رکھا ہے۔ ایک نسخہ
اسکا آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اور جب دوسرا ختم ہو جاویگا۔ اسوقت وہ بھی بھیجونگا
وعلیٰ ہذا القیاس۔ مگر اس بات کی احتیاط رہے۔ کہ اس کتاب کی تصنیف کا شہرہ
نہ ہو۔ اور چھپنے تک کہ کتاب پوری نہ ہولے۔ اور چھپ نہ لے۔ اسوقت تک کسی کو نہ
معلوم ہو کہ ولیم میور صاحب کی کتاب کا جواب لکھا جاتا ہے۔ پس اخبار سے
مخفی رکھنا چاہئے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا۔ کہ قبل اتمام کتاب جناب سر ولیم میور
صاحب کو اسکا حال معلوم ہو۔ بعد اتمام انشاء اللہ تعالیٰ میں خود بھیجونگا۔ مجھکو
بجز روپیہ کے اور کسی چیز کی فکر نہیں۔ صرف چاہتا ہوں۔ کہ آپ اس خط کے پہنچتے

کے بعد میر ظہور حسین صاحب کے پاس جائیے۔ اور میری یہ درخواست ہے۔ کہ دونو صاحب ملکر کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے۔ سود اور روپیہ میں ادا کردونگا۔ مگر چونکہ میں یہاں ہوں۔ اسلئے کچھ بندوبست نہیں کرسکتا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کیلئے دلی لکھا ہے۔ اور میں نے لکھا ہے۔ کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیجدو۔ اگر ہزار روپیہ آپ دونوں صاحب قرض لیکر بھیجدیں۔ اور ہزار روپیہ یقینی دہلی سے آوے۔ اور پانچ چھ سو روپیہ چندہ کے ذریعہ سے وصول ہوجاوے۔ تو کتاب بخوبی چھپ جاویگی۔ میں نے میر ظہور حسین صاحب سے سو روپیہ چندہ کے طلب کئے ہیں۔ گو وہ کیسے ہی تنگ ہوں۔ مگر ضرور بھیجیں گے۔ وہ میری بات سے کبھی انکار نہیں کرینگے۔ اور سو روپیہ آپ اپنے چندے کے بھیجدیجئے۔ اور اس خط کا جواب بلا توقف بھیجئے گا۔ کہ ہزار روپیہ قرض کی تدبیر ہوسکی یا نہیں۔ کیونکہ اگر تدبیر نہ ہوسکے۔ تو مجھے جلد اطلاع کرنی چاہیے تاکہ میں اور فکر کروں۔ اگر یہ کتاب بعد چھپنے کے خاک میں ملادی جاویگی۔ تب بھی ہزار روپیہ جو قرض لیے جاتے ہیں۔ وصول ہوجاویں گے۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہوگیا ہے۔ خدا مدد کرے۔ ایک سوداگر صرف اسی خطبہ کے ڈیڑھ سو نسخے خریدتا تھا۔ میں نے متفرق بیچنے سے انکار کیا۔ اس نے بہت سی کتابیں دی ہیں مستعار واسطے لکھنے کتاب کے اس شرط پر۔ کہ یہ کتاب سوائے اس کے اور کسی کے ہاتھ یورپ بھر میں نہ دوں۔ پس مجھکو کچھ شک نہیں ہے۔ کہ جسقدر روپیہ لگے گا۔ اس سے بہت زیادہ قیمت سے وصول ہوگا۔ صرف اس وقت روپیہ لگانے کی دقت ہے۔ اگر ہندوستان سے روپیہ آنے کی مایوسی ہوجاوے۔ تو میں خود یہاں کسی بنک سے روپیہ قرض لونگا۔ انشاءاللہ تعالیٰ کتاب ضرور پوری کرونگا۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب کا کوئی خط نہیں آیا۔ نہ چندہ سابق کا روپیہ انہوں نے بھیجا ہے۔ ان کا حال لکھو۔ کہ وہ کیسے ہیں۔ اب زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ والسلام۔

بنگالیونکا اپیل دائر ہے ۔ ابھی حکم آخر نہیں ہوا محکمہ بند ہے ۔ نومبر میں کھلیگا فقط
(خاکسار سید احمد) (مقام لندن) (یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء)

(۱۲)

مخدوم و مکرم من ۔
السلام و علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ ۔ آپکا عنایت نامہ مورخہ بلا تاریخ پہنچا ۔ اور دل کو باغ باغ خوش کیا ۔ افسوس کہ جس مجلس میں مرزا صاحب و مولوی زین العابدین آپ کی خدمت میں جمع تھے ۔ میں وہاں نہ تھا ۔ میرے نیاز نامے جو آپ کے نام ہیں ۔ انہوں نے درحقیقت مولوی زین العابدین کو واسوخت کا مزہ دیا ہوگا ۔ جسقدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے ۔ درحقیقت وہ بہت کم ہے ۔ اس کا فر غارتگر ایمان کو جیسا کہ وہ ہے ۔ میں ہی خوب جانتا ہوں اب آپکو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے ۔ میں رشتہ و ناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا ۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو میں اپنے چھوٹے حقیقی بھائی سے کم نہیں سمجھتا تھا ۔ اور اب بھی بلحاظ ان کی صحت و تندرستی و خوشی و آرام و دینی و دنیاوی عیش کے ایسا ہی سمجھتا ہوں ۔ اور ایسا ہی چاہتا ہوں آپ یقین جانئے کہ جسقدر مجھکو اپنے بھائی کے مرنے کا رنج ہوا تھا ۔ اسی قدر یا اسکے قریب مولوی سمیع اللہ خانصاحب کیطرف سے جو میرے دل میں رنج و ملال آیا ہے ۔ اسکا مجھکو رنج ہوا ہے ۔ وہ بچے ہیں ۔ انہوں نے دنیا نہیں دیکھی ۔ دوستی و محبت کے معاملات و برتاؤ سے محض ناواقف ہیں ۔ کسی رنڈی پر وہ عاشق نہیں ہوئے ۔ کسی لونڈے پر وہ عاشق نہیں ہوئے ۔ ان کو مزہ محبت اور دوستی کا مطلق معلوم نہیں ہے ۔ سچ یہ ہے ۔ کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا ۔ وہ نہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے ۔ نہ انسان کی دوستی کا ۔ اور نہ محبت کے لایق ہے ۔ ان کی ناتجربہ کاری ہے ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں ۔ کہ میں کسی کے کہنے سننے سے ان کی طرف سے رنجیدہ ہوا ہوں ۔ میں تو اس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں

جو دوست کی نسبت یہ خیال کرے۔ کہ اس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات
کی یا کہی۔ میں تو دوست کی گالی دینے اور برا کہنے کو بھی دوستی پر حمل کرتا ہوں۔ اور
درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوئی ہے۔ مگر جبکہ حقیقت میں خلاف
محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو۔ تو پھر شیشۂ محبت جو نہایت نازک ہے کسی طرح
ثابت نہیں رہ سکتا۔ آپ خیال کیجئے۔ کہ محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط چیز ہے
کہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی۔ اور کوئی اسکو نہیں توڑ سکتا۔ مگر وہ نازک بھی ایسی
ہے۔ کہ باریک سے باریک شیشہ اور حباب کو بھی اس سے نسبت نہیں ہے۔
وہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدموں سے بھی نہیں ٹوٹتی۔ اور ایک ادنیٰ سی خلاف
محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اور جوں جوں محبت زیادہ بڑھتی ہے اس
کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو اب بھی میں اپنے بھائی
سے کم نہیں سمجھتا۔ مگر جو ملال کہ میرے دل میں ہوا۔ وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ بہت
ہماری دوستی کہ جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے۔ جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ ٹوٹ جاتی
وہ بات جو لکھے وہ جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ پس آپنے جو لکھا ہے کہ میں
مولوی سمیع اللہ خاں کو ضرور خط شرکت چندہ کیلئے لکھوں۔ تو میں کیا لکھوں۔ آپ
یہ خیال نہ فرمائیے۔ کہ جو آپنے لکھا۔ اس سے میں نے انکار کیا۔ میری تو وہ مثل
ہے۔ کہ دوست کو جان و ایمان دونوں دیتا ہوں۔ لیکن دل کا یہ حال لکھا ہے۔ اسکے
جواب میں جو حکم ہوگا۔ بجا لاؤنگا۔

میں نہیں سمجھتا۔ کہ ہمارے برادر شفیق جناب حاجی مولوی شاہ محمد علیم اللہ عرف
احمد جان برادر بزرگ مولوی سمیع اللہ خاں کو مجھ سے کیا رنج پہنچا ہے۔ شاید
یہ رنج ہو۔ کہ میں نے ان کے چھوٹے بھائی سے برادرانہ محبت کی تھی۔ یا یہ سبب
ہے کہ انہوں نے حج کر لیا۔ ششماہی کے روزے رکھ لئے۔ شاہ عبد الغنی صاحب
کے مرید ہوکر خلیفہ ہوگئے۔ ان کی نمازوں اور روزوں اور حج و زہد و تقویٰ کا خدا پر اتنا
احسان ہوا۔ کہ بار احسان سے خدا کی کمر دوتا ہوگئی۔ اسنے عشرہ مبشرہ میں ایک عدد زیادہ کر دیا۔

مگر ہمیں ایسے خدا کو جس پر لوگ اسکی عبادت کا احسان کریں - اور اسکی ہیبتِ احسان کے بوجھ سے
ختم ہو جاوے - ایک کوڑی کو بھی نہیں خریدتا - مولوی سمیع اللہ خاں اپنے بھائی کی محبت
نہ توڑ سکے - مگر میری محبت توڑنی منظور کی - پس وہ نازک شیشہ کیونکر قائم رہ سکتا ہے -
خیر خدا ان کو اور ہم سب کو معاف کرے - فقط

آپنے جو جو انتخاب احیاء العلوم کے بھیجے - اسکا شکریہ کرتا ہوں - خدا جزائے
خیر دے - اور خدا کرے تمہاری نیکیوں اور نمازوں کے بوجھ سے تمہارے خدا کی پشت
خم نہ ہو - میں باقی انتخابات کا جن کے بھیجنے کا وعدہ ہے منتظر ہوں - میں نہایت خوشی سے
آپکو اطلاع دیتا ہوں - کہ دو باب میری کتاب کے اور ختم ہو گئے - ایک بشارات آنحضرت
صلعم میں توریت و انجیل سے - اور ایک حقیقتِ معراج و شقِ صدر میں مگر جب دیکھو
گا - کہ کیا لکھا ہے - تو معلوم کیجیے گا - میں نے جن جن احباب کو چندہ کی شرکت کیلیے
خط لکھے تھے - اُن میں سے بعض نے انکار لکھ بھیجا - اور بعض نے جواب نہیں بھیجا
نہ جواب آنیکی توقع ہے - صرف ایک شخص نے سو روپیہ بھیجدیئے ہیں - اب صرف
چھ جگہ سے آنے کی توقع ہے - مہدی علی - زین العابدین - مرزا رحمت اللہ بیگ
ظہور حسین - تراب علی - محمد احمد - پس کل سات سو روپیہ جمع ہوں گے - کتاب میں ہرگز
تین ہزار سے کم خرچ نہ ہوگا - دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے - بغیر قرض لیے کام نہیں
چلنے کا - ایک ارادہ ہے - کہ جلدِ اول چھاپ کر فروخت کرنی شروع کی جاوے
جسقدر آوے - دوسری جلد میں صرف ہو - بہرحال خدا مالک ہے - مسٹر ڈیون پورٹ
کی کتاب کا ترجمہ کر ڈالا - جب تک میں نہ آؤں - اس کے چھاپنے کی کچھ فکر مت
کرو - نہایت مشکل سے میں نے ایک اور کتاب مسٹر ہنٹر کی تلاش کی ہے - وہ
صرف ایک دفعہ چند نسخے چھاپے ہوئے تھے - وہ کتاب ایسی عمدہ ہے - کہ
مسٹر ڈیون پورٹ کی کتاب اس کے آگے آفتاب و ستارہ کی نسبت
رکھتی ہے - میں نے جو ہزار روپیہ لینے کی نسبت لکھا تھا - اسکی بابت کیا صلاح
ہوئی - مگر مرزا پور سے ہرگز قرض لینا منظور نہیں ہے - الہ آباد کے بنک سے تم

اور میر ظہور حسین شریک ہوکر قرض لو۔ معجزات کا انتخاب اور اہل کلام نے جو تعریف معجزہ کی بیان کی ہے۔ اور جو بحث اسپر کی ہے۔ اور منکرین معجزات کا جو رد لکھا ہے اسکا انتخاب جلد بھیجو۔ اسلئے۔ کہ بالفعل میں بنسبت نسب آنحضرت کے لکھ رہا ہوں پھر نسبت روایات کے لکھونگا۔ پھر نسبت قرآن کے۔ پھر نسبت رسوم جاہلیت کے۔ اور یہ سب باب ایک مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں ختم ہوجاوینگے۔ پھر بحث معجزات شروع ہوگی۔ آپ نے اپنے چندہ کا روپیہ یقین ہے روانہ کردیا ہوگا۔ اور مرزا رحمت اللہ اور زین العابدین نے بھی بھیجا ہوگا۔ میر ظہور حسین پاس سے کچھ جواب نہیں آیا۔ عنقریب چھاپہ والے کا بل آنیوالا ہے۔ فقط

مجھکو مطلق یاد نہیں ہے۔ کہ وہ کونسا خط ہے۔ اور اس میں کیا مضمون تھا جسکو پڑھ کر میاں احمد جان صاحب روئے۔ امید ہے۔ کہ آپ مطلع فرماوینگے تاکہ میں اس بات کو اپنے معجزات کی کتاب میں لکھ لوں۔ والسلام علیکم قلبی لدیکم

(خاکسار تابعدار شما بندۂ شما سید احمد) (از مقام لنڈن)

(۱۳۔ نومبر ۱۸۶۹ء)

(۱۳۲)

جناب مخدوم و مکرم بندہ سلامت۔

بعد سلام مسنون الاسلام التماس یہ ہے۔ کہ آپکا عنایت نامہ محمود کے نام پر آیا۔ اس کے دیکھنے سے نہایت تردد ہوا۔ آپ نے اس خط میں کوتاہ لکھی ہے کو ایسا کام فرمایا ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ کچھ مفصل حال نہیں لکھا۔ کہ کیسا قاتل کیسی پناہ دہی۔ کیسی رپٹ۔ یہ بات کیا تھی۔ اور واقعہ کیا ہوا۔ آپ نے کس پر اور کیسی نالش کی ہے۔ بہرحال مفصل تمام حالات سے مطلع فرمائیے۔ کہ رفع تردد ہو۔ یہاں ہم سب اچھی طرح ہیں۔ اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اور دوستوں کی خیر و عافیت میں منتظر ہیں۔ فقط

نجم الاخبار کا مضمون۔ جو سوسیٹی کے اخبار میں مندرج ہوا تھا۔ میں نے دیکھا۔

اور حیران ہوگیا۔ کہ کون شخص یہہ اخریدار پیدا ہوا۔ مجھکو تو اپنے ہموطنوں اور بالتخصیص ہم مذہبوں سے بجز لعنت اور پھٹکار اور جوتی پیزار کے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہے۔ اور میں اس کے سننے اور کھلنے میں خوش ہوں نہ میرا دل رنجیدہ ہوتا ہے۔ نہ میں ان کو برا جانتا ہوں پھر خلاف توقع یہہ کیونکر ظہور میں آیا۔ منشی نجم الدین میرے دوست ہیں۔ اور غالباً وہ مجھکو اسقدر لعنت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ جسقدر کہ اور لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر وہ آرٹیکل انکا لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ غالباً جب آپ دہلی گئے ہونگے۔ تو وہاں منشی ذکاءاللہ صاحب سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ اور آپ کی تقریر و خوش بیانی نے منشی ذکاءاللہ صاحب کے دل کو تحریک دی ہوگی۔ اور انہوں نے وہ آرٹیکل لکھا ہوگا۔ بہت سے الفاظ اور طرز تقریر سے انہی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال خدا بھلا کرے۔ فقط

اب اس کتاب کا حال سنیئے جو تصنیف ہو رہی ہے۔ جسکا نام آپ تجویز کر دیجیئے انگریزی میں اسکا نام ہے "سیریز آف ایسیز آن دی لائف آف محمد" اور عربی میں اُسکا نام میں رکھنا چاہتا ہوں "خطبات احمدیہ علی سیرۃ محمدیہ" میں نہیں جانتا۔ کہ ناموں پر الف لام لانا جائز و صحیح ہے۔ یا غلط یعنی اگر بجائے نام مذکورہ بالا کے یہ نام رکھا جائے تو دل کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ خطبات الاحمدیہ علی السیرۃ المحمدیہ۔ اور یہ نام بھی ہو سکتا ہے خطبات احمدیہ علی سیرۃ سیدنا محمد رسول اللہ۔ خطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ یہ اخیر کا نام اگر بموجب قواعد نحویہ کے صحیح ہو۔ تو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ بہرحال آپ نام تجویز کر کے جلد بھیج دیں۔ کیونکہ اس خط کا جواب آنے تک اس کی پہلی جلد انشاءاللہ تعالیٰ ضرور چھپ جاویگی۔ مگر خیال رہے۔ کہ نام میں لفظ خطبات کا ضرور ہو۔ اسلیئے کہ میں نے ہر ایک حصہ کو بلفظ خطبہ تعبیر کیا ہے۔ پہلی جلد میں بارہ خطبہ ہیں۔ جو سب مرتب ہو چکے۔ برابر چھپ رہے ہیں۔

خطبۂ اول جغرافیہ عرب کا مخلوط تاریخ عرب سے جس میں کمال تحقیق سے ثابت کیا ہے۔ کہ فاران مکہ کے پہاڑ ہیں۔ جہاں سے پیغمبر ہونے کی توریت میں بشارت تھی۔ خطبۂ دوم۔ رسم و رواج و عادات عربوں کے زمانہ جاہلیت میں جس میں

دکھایا گیا ہے کہ اسلام نے کس قدر اُنکو آراستہ کیا۔

خطبۂ سویم۔ عرب میں کسقدر مذاہب قبل اسلام کے جاری تھے۔ اور ان میں سے اسلام کس سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور اس مناسبت سے اسلام کا بھی خدا کیطرف سے ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یا صرف ایک بنایا ہوا مذہب۔ فقط

خطبۂ چہارم۔ یہودی اور عیسائی مذہب کو اسلام سے فائدہ ہوا۔ یا نقصان۔

خطبۂ پنجم۔ اوپر بیان حالت کتب اسلامی کے۔

خطبۂ ششم۔ مذہبی روایتوں اور ان کے اعتبار اور عدم اعتبار کا حال۔

خطبۂ ہفتم۔ قرآن مجید پر اس میں نہایت عمدہ عمدہ بحثیں ہیں۔

خطبۂ ہشتم۔ تاریخ مکہ و تاریخ بزرگانِ آنحضرت صلعم۔

خطبۂ نہم۔ نسب نامہ آنحضرت۔ اور جواب اُن تمام بحثوں کا۔ جو آنحضرت کے نسب نامہ کی نسبت کی ہیں۔

خطبۂ دہم۔ بیان بشارات آنحضرت صلعم از توریت و انجیل۔

خطبۂ یازدہم۔ حقیقت شق صدر و معراج۔

خطبۂ دوازدہم۔ حالاتِ آنحضرت صلعم پیدائش سے بارہ برس کی عمر تک کے اس ایک جلد کے چھپنے اور طیار ہونے میں چودہ پندرہ سو روپیہ کے خرچ کا تخمینہ ہے۔ مگر اب تک کسی نے زرچندہ نہیں بھیجا۔ سوائے ایک شخص کے۔ میر ظہور حسین صاحب کا خط تک نہیں آیا۔ معلوم نہیں۔ کہ کیا سبب ہے۔ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (از مقام لنڈن)

(۱۷۔ دسمبر ۱۸۶۹ء)۔

(۱۴)

جناب مخدوم و مکرم بندہ سلامت۔

بعد سلام مسنون الاسلام التماس یہ ہے۔ کہ چند ہفتے سے برابر آپ کے خط کا انتظار ہے۔ آپ نے جو محمود کے نام خط لکھا تھا۔ اس میں مہمل و مجمل طور سی

ایک آدھ بات تردد میں ڈالنے والی لکھدی تھی۔ اس کے بعد سے پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اور اس لئے بے انتہا تردد ہے یقین ہے۔ کہ اب کی ڈاک میں ضرور آپکا خط آوے۔ مگر آپ خط لکھنے میں گو دو حرف خیریت کے ہوں۔ دریغ و توقف نہ فرمایا کیجئے۔

میں نے جو ایک خط علیگڈھ اخبار میں لکھا۔ میں سنتا ہوں۔ کہ اس سے بہت ناراضی پیدا ہوئی۔ اور لوگ نہایت برا بھلا کہتے ہیں۔ لاچاری ہے۔ میری قسمت میں ہی یہہ ہے۔

میں اپنا حال آپکو کیا لکھوں۔ سکتہ سا ہو گیا ہے۔ دن رات کی محنت و مشقت ہے اور اس طرح طرح کی تکلیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ جلد اول خطبات الاحمدیہ کی تصنیف تمام ہوئی۔ اور اسی مہینہ میں چھاپہ بھی تمام ہو جائیگا۔ اب جو اندازہ اس کے یعنی ایک جلد کے چھاپہ کی لاگت کا کیا گیا۔ تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے ہیں۔ اور جان میں جان نہیں ہے۔ میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے۔ تین سو روپیہ اسکے چندہ کی بابت بھیجا ہے۔ میر ظہور حسین صاحب نے مارچ روپیہ بھیجا ہے۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اپنا چندہ سو روپیہ کا بھیجدیا۔ اگرچہ میں نے بھی تاکید کی ہے۔ مگر آپ بھی تاکید کیجے۔ زین العابدین سے روپیہ منگا کر بھجوا دیجے۔ وہاں اسکو ہنڈوی لندن ملنے کی دقت ہوئی ہو گی۔ مگر اب وقت زیادہ توقف کا نہیں رہا۔ قرضہ ہزار روپیہ لینے کی نسبت معلوم نہیں۔ کہ کیا ہوا۔ بہرحال اب اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا جلد روانہ فرمائیے۔ اس خط کو لکھ رہا تھا۔ کہ ہندوستان کے اخبار پہنچے۔ اور "شعلہ طور" کانپور بھی پہنچا۔ نہایت لطف دیا۔ آپ بھی اسکو پڑھکر خوش ہوئے ہونگے۔

دوسری جلد کے چھاپہ شروع کرنیکی بابت نہایت تردد ہے۔ بہرحال اس خط کا جواب آنے تک جو آخر فروری میں آجاویگا۔ اس کا چھاپہ شروع نہیں ہو سکتا۔

پس آپکی جو لے اس باب میں ہو سو وہ بھی ارقام فرمائیے - یہاں کے ایک کاغذ میں میری کتاب کا ذکر چھپا ہے - اسکو میں نے کاٹ کر سوسئیٹی کے اخبار میں چھپنے کیلئے بھیجا ہے - وہ چھپیگا - اور مفصل حال جلد اول کا معلوم ہوگا - اگرچہ میں بالاجمال آپکو پہلے بھی لکھ چکا ہوں - بہر حال آپ خط تو لکھئیے جس سے تردد رفع ہو - والسلام -

(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن)

(۱۵-جنوری ۱۸۷۰ء)

(۱۵)

مخدوم و مکرم من -

جس قدر آپ کی تاخیر تحریر سے مجھکو رنج و تردد ہوا ہے - بیان سے باہر ہے - مہینا ہے آپکا خط محمود کے نام آیا تھا - جس میں نہایت اجمال سے چند کلمات متردد انہ مندرج تھے - اس وقت سے برابر تردد و رنج سے خالی نہ تھا - الحمد للہ کہ آپ کا عنایت نامہ ۱۸-دسمبر کو پہنچا - اور اگرچہ وہ تردد بالکلیہ رفع نہیں ہوا - مگر کسی قدر رفع ہوگیا - امید ہے کہ آئندہ خطوط سے انشا اللہ تعالیٰ بالکل رفع ہو جاویگا - میں نے متعدد خط آپکے نام بھیجے ہیں - اور آئندہ سے ہر ہفتہ خط ضرور بھیجتا رہونگا - غلام کو تعمیل حکم میں ذرہ فرق کرنیکا مقدور نہیں ہے - جیسا کہ ایک عرضی سے جو اخبار میں چھپیگی ظاہر ہوگا) کتاب جو چھپ رہی ہے - میں یقین کرتا ہوں - کہ اس کی بدولت مجھے لندن میں بسبب تنگی خرچ نہایت تکلیف اور محتاجی اور قرضداری اٹھانی پڑیگی - تن بتقدیر - انگریزی مصنفوں اور جناب میور صاحب نے ایسا کچھ لکھا ہے - کہ ممکن نہیں ہے - کہ ان کی چاروں جلدوں کا جواب چار جلد سے کم آوے - جلد اول میری کتاب کی بالکل جواب ہے ان کی پہلی جلد کا اور اور مصنفوں کا جنہوں نے اس مضمون پر لکھا ہے - میرے ہم قوم اس محنت کی جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی قدر نہیں کرینگے - بلکہ نہایت الزام دینگے - اور کافر و مردود بنا دینگے کیونکہ میں پابند تقلید نہیں رہا ہوں - اور شاید دو یا تین مسئلوں میں جمہور سے اختلاف کیا ہے

اور چند علماء کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ پس ہمارے شفیق تمام جیز کو چھوڑ کر انہیں
مسئلوں کی بدولت فتوے دینگے۔ یہ خطبہ بشارات کا پروف آپکے پاس بھیجتا ہوں۔
اسکو پڑھو۔ اور انصاف کرو۔ کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ اور میں فخر سے کہتا ہوں۔ کہ
جناب حضرت مولوی امداد العلی صاحب بھی ایسا نہ لکھ سکیں گے۔
بھائی جان سنو۔ اب یہ وقت نہیں رہا۔ کہ میں اپنی مکنونات ضمیر کو مخفی رکھوں
میں صاف کہتا ہوں۔ کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے۔ اور خالص اس روشنی
کو جو قرآن و حدیث صحیح سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ تلاش کرینگے۔ اور حال کے علوم
سے مذہب کا مقابلہ نکر سکیں گے۔ تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جاویگا
اسی خیر خواہی نے مجھکو برانگیختہ کیا ہے۔ جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں۔ اور
تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔ ورنہ آپکو خوب معلوم ہے۔ کہ میرے نزدیک اسلام کے واسطے
کیلئے اور بہشت میں داخل ہونے کیلئے آئمہ کبار در کنار مولوی عبد الحی کی تقلید بھی کافی ہے
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک الٰہی طہارت ہے۔ کہ کوئی نجاست باقی
نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہوں۔ کہ بدلایل و مباحثہ مجھکو قایل کر دیا جاوے۔ کہ
میری یہ رائے صحیح ہے۔ یا غلط۔ اور میں دشمن اسلام ہوں۔ یا مثل ابوبکر و عمر کے
دوست اسلام ہوں۔ آیا میں جو اسلام کو ابو حنیفہ و شافعی سے زیادہ دوست رکھتا
ہوں۔ اور یقین کرتا ہوں۔ کہ ابو حنیفہ و شافعی تو در کنار۔ ابوبکر و عمر بھی اگر خود کو
کچھ غلطی کریں۔ تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں ہو سکتا۔ اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ
تمام عالم کافر ہو جاوے۔ یا تمام عالم فرشتہ ہو جاوے۔ تو خدا کی خدائی میں
کچھ نقصان یا زیادتی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اسلام کے مسائل کا حال ہے۔
کہ اگر تمام مجتہدین صواب پر ہوں یا خطا پر۔ اصل اسلام کی جو روشنی ہے اس میں
کچھ نقص نہیں ہے۔ پس یہ اعتقاد میرا صحیح ہے۔ یا غلط۔ اگرچہ دوستوں اور احباب
کے واسطے اسی مضمون کو مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ الا آج تک عام
لوگوں کے سامنے نہیں کہا تھا۔ آج میں نے ایک عرضداشت بخدمت اہل وطن

لکھی ہے۔ اور واسطے چھپنے کے بھیجدی ہے۔ اس کے شروع میں یہ مضمون بھی لکھدیا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ جو آپ کی رائے ہو۔ اسکی نسبت آپ بھی لکھ کر اخبار میں بہ ثبت اپنے نام کے چھپوا دیجے خواہ آپ کی رائے میری رائے کے مطابق ہو۔ یا مخالف۔ فقط

لوگوں نے جو اخباروں میں مجھکو برا بھلا لکھا۔ اس سے آپکو غصہ آگیا معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہوگا۔ مگر مجھکو کہاں تک بچاؤ گے۔ میں تو ہدف تیر ملامت ہوگیا ہوں۔ اور روز بروز ہوتا جاؤنگا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے۔ جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔ میرے خطوط کا مضمون جو آپنے اپنے آرٹیکل میں لکھدیا۔ آپ مالک ہیں۔ جو چاہیں سو کریں۔ اگر میرا بس ہوتا۔ تو ایسا نہ کرنے دیتا۔ بہرحال جو تمہاری خوشی ہے۔ وہ میری مرضی ہے۔ میں نے عرضی میں اپنے دل کا حال اپنے دوستوں کے ساتھ لکھدیا ہے۔ اور برادران عزیز کا بھی۔ اب کے ہر ہفتہ خط لکھونگا۔ اسلئے ابھی کو طول دینا ضرور نہیں۔ آئندہ ہفتہ میں لکھونگا۔ محمود چار شخصوں کا ذکر کیا کرتا ہے۔ محمد احمد کا۔ آپ کا۔ مرزا رحمت اللہ کا۔ اور ذکر یہہ ہوتا ہے۔ کہ میں جا کر ان تینوں سے کہونگا۔ بالکل طریقہ زندگی بدل دیں۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے رہنا اختیار کریں۔ اور میر ظہور حسین کا ذکر وکالت کے باب میں ہوتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہہ دن مفارقت کے بخیریت گذرتے ہیں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ہم سب بخیر و خوبی ملیں گے۔ اور جو کچھ دل چاہتا ہے۔ سب کچھ انشاء اللہ تعالیٰ ہوگا۔ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (از مقام لنڈن)

۲۱۔ جنوری ۱۸۷۰ء

(۱۶)

مخدومی و مکرمی سلامت۔

بعد سلام مسنون۔ التماس یہہ ہے۔ کہ گذشتہ ڈاک میں عریضہ روانہ کر چکا ہوں۔ اب بموجب حکم آپ کے ہر ڈاک میں عریضہ بھیجا کرونگا۔ آپکا کوئی عنایت نامہ اس ڈاک

میں نہیں آیا۔ یہہ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ بھی ہمیشہ لکھا کیجیے۔ خصوصاً ایسی حالت میں
جبکہ بسبب بعض خیالات کے تردد رہتا ہے۔ اور جب ڈاک میں آپکا خط نہیں آتا مایوسی
سے رنج ہوتا ہے۔ حجر اسود کی نسبت جو حدیثیں ہیں۔ کہ وہ بہشت کا یاقوت ہے۔ اور
قیامت میں اسکی دو آنکھیں ہونگی۔ وغیرہ۔ اس کی نسبت آپکی کیا رائے ہے۔ جلد
مطلع کیجیے۔ میں تو ان احادیث کو ضعیف اور بے سند جانتا ہوں۔ وہ پتھر ابو قبیس پہاڑ
میں کا ہے۔ اور بموجب یہودی رسم کے قدیم زمانہ میں نصب کیا گیا تھا۔ کچھ عجب نہیں
کہ حضرت ابراہیمؑ نے نصب کیا ہو۔ بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ حجر اسود کو بوسہ دینے اور
کعبہ کیطرف بطور سمتِ قبلہ سجدہ کرنے اور بت پرستی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اسکا جواب
تحقیقی میں نے لکھا ہے۔ اور فرق بتایا ہے۔ آپ کیا جواب دیتے ہیں۔ اور اور
عالموں نے کیا جواب دیا ہے۔ اس کا جواب جلد ارقام فرمایئے۔ ورنہ وہ خطبہ جو مکہ معظمہ
پر ہے۔ چھپ جاویگا۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن)

(۲۸۔ جنوری سنہ ۱۸۷۰ء)

(۱۷)

جناب مولانا کرم من سلامت۔

بعد سلامِ مسنون التماس یہہ ہے۔ کہ آپ کی تقریر دلسوز و رقت خیز و درد انگیز
مدرسۂ عربی دہلی مقرر کردہ مولوی محمد سمیع اللہ صاحب پر جو اخبار سوسیٹی میں چھپی۔ میں
نے دیکھی حقیقت میں نہایت پُر اثر ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کے دل سے
نکلی ہے۔ کیونکہ سیدھی دل میں بیٹھتی ہے۔ آپ نے خوب اہلِ دہلی کو نالائق و ناشائستہ
مثل حیوان کے بتایا۔ یہہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ کہ ہم تو ذرہ سی بات کہیں۔ تو فضیحت
ہو۔ اور تم دشنام تک کے قریب لفظ بھی کہو۔ اور کوئی کچھ نہ کہے۔ اور سب جناب مولوی
صاحب، جناب مولوی صاحب کہہ کر ہاتھ چومیں۔ میں جانتا تھا۔ کہ مولوی سمیع اللہ خاں
صاحب قریب سو روپیہ ماہواری کے اپنے پاس سے دیتے ہوں گے۔ افسوس ہے

کہ کل پندرہ ہزار روپیہ سے بھی کم تھا۔ اور اگر فرضی جمع خرچ کی رقم اسمیں شامل ہے۔ تو کچھ بھی نہیں۔ افسوس کہ آپ نے اپنی تقریر میں بیان نہ فرمایا۔ کہ خود بانی نے جو فضل الہی سے تمام اعزہ موجودہ دہلی سے مقتدر ہیں۔ کس قدر روپیہ دیا۔ اسوقت البتہ آپ کی لعنت و ملامت محتاجان دہلی پر جو نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ درست و بجا ہوتی۔ میں سوسیٹی کیلئے سب سے بھیک مانگتا ہوں۔ مگر دس ہزار ایک سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا ہے۔ پس ایسی حالت میں اگر میں بھائی مہدی علی سے سو روپیہ دینے کو کہوں۔ تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ جان من! جناب من ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے افسوس ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان ڈوبے جاتے ہیں۔ اور کوئی انکا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں۔ اور زہر نگلتے ہیں۔ ہاتھ پکڑ نکالنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو۔ اور یقین جان لو۔ کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے۔ تو دیکھتے کہ تربیت کسطرح ہوتی ہے۔ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے۔ اور علم کیونکر آتا ہے۔ اور کسطرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرسکتی ہے۔ انشاءاللہ تعالی میں یہاں سے واپس آکر سب کچھ کہونگا۔ اور کرونگا۔ مگر مجھ کافر مردود گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا۔ میں اپنی کتاب کا دیباچہ بھی آج لکھ چکا ہوں۔ الحمدللہ علی احسانہ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن)

(۱۱-فروری سنہ ۱۸۷۰ء)

(۱۸)

جناب مخدوم من سلامت۔

بعد سلام مسنون التماس اینکہ شکر ہے خدا کا۔ کہ ہزاروں انتظار کے بعد آپکا عنایت نامہ پہنچا۔ مورخہ ۹۔ فروری آپ کی صحت و سلامتی اور خوشنودی مزاج

اور مصئونی جمیع آفات سے شکر خدا کیا ۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ باعزت و اقبال رکھے آمین
ار خدا ! تو انکا بھی خدا ہے جو حلال کی ہوئی مرغی کھاتے ہیں ۔ اور ان کا بھی
خدا ہے ۔ جو گردن مروڑی ہوئی مرغی کھاتے ہیں ۔ مجھ مرتی مرغی کھانیوالے کی
بھی دعا قبول کر ۔ آمین ۔ آپکو دربار میں گھڑی ملنا مبارک ہو ۔ آپنے خوب تماشے
سفر کلکتہ تا دہلی میں دیکھے ہونگے ۔ نہایت خوب کیا ۔ جو آپ نے یہ جلسے دیکھے
قصۂ عاد و ثمود کو میں نے اپنی کتاب میں نہایت مختصر کر دیا ہے ۔ مخالفین ان
قصوں سے انکار کرتے ہیں ۔ اور قصۂ باغ ارم پر ہنستے ہیں ۔ اور سد سکندری
کے قصے کو جھوٹ کہتے ہیں ۔ پس آپ لوگ بڑے مولوی کہلاتے ہیں ۔ اس کا
ثبوت دیویں ۔ میں نے حضرات علمائے مسلمین کی تاریخیں الٹ ڈالیں ۔ جو بزرگوار
ہیں ۔ وہ اس قصہ کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیتیں نقل کر دیتے ہیں ۔ اور اس
کیسا تھ اور جھوٹ طوفان کہانیاں ملا دیتے ہیں ۔ بابا قرآن مجید کو وہ لوگ جن
کے جواب دینے کو اسکا ثبوت درکار ہے ۔ قبول نہیں کرتے ۔ بلکہ خود اسی پہ اعتراض
کرتے ہیں ۔ اور جو قصہ اس میں بیان ہے ۔ اسی کو تو وہ غلط بتاتے ہیں ۔ پھر وہی
چیز ان پر دلیل نہیں ہو سکتی ۔ میں نے لکھا ہے ۔ کہ باغ ارم عمارت ذات عماد
غلط محض ہے ۔ اور ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلہا فی البلاد سے ایک محل یا چو کھنبہ
یا ہزار کھنبہ سمجھا غلط ہے ۔ وہ صرف ایک قوم کا ذکر ہے ۔ جو اولاد ارم سے تھی ۔ اور
جو دراز قد تھی ۔ تشبیہ کیونکہ بعض قوم کے آدمی دراز قد ہوتے ہیں ۔ صرف ان کو تشبیہاً ذات العماد
کہا ہے ۔ جیسا کہ ایک جگہ تشبیہاً فرمایا ہے ۔ "کانہم اعجاز نخل خاویہ" ۔ حال یہ ہے ۔
کہ میں خدا کا اور اس کے رسول کا اور ان کے کلام کا دوست ہوں ۔ ملا مولویوں
کا دوست نہیں ہوں ۔ جو مثل یہودیوں اور عیسائیوں کے ان کو اربابا من دون اللہ
سمجھوں ۔ اور جو کچھ میں نے لکھا ہے ۔ اسکو تاریخ سے اور غیر مذہب کی کتابوں
سے ثابت کیا ہے ۔ پس اب میں ایک برس کی مہلت دیتا ہوں ۔ کہ ان قصوں
کو جسطرح پر کہ ہمارے مولوی صاحبان فرماتے ہیں ۔ اور ممبروں پر بیٹھ کر وعظ میں

لوگوں کو پھسلاتے ہیں۔ یا جسطرح کہ ہمارے مؤرخین باعلم اسکو لکھتے ہیں۔ اس کا
ثبوت دیویں۔ یا وہ یہی بتادیں۔ کہ باغ ارم اور سد سکندر کس ملک میں اور کس
جگہ تھی۔ اور اب بھی اُن ستونوں میں سے کوئی ستون مل سکتا ہے۔ افسوس
صد افسوس۔ ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو
ایسی لغو اور مہمل کہانیوں میں ڈالدیا ہے۔ اور جب کوئی چاہتا ہے۔ کہ اسکی
تحقیقات اور اُسپر غور کیا جائے۔ تو اس کو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور،
مرتی مرغی کھانیوالا بتاتے ہیں۔ آیت "یاتی من بعدی اسمہ احمد" کا نہایت عمدہ
بیان مسٹر ہگنز نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ اور بخوبی بجنسہ اس آیت کا موجود
ہونا انجیل یوحنا میں ثابت کیا ہے۔ اور وہی مشہور لفظ فارقلیط کا ہے۔ مگر
جسطرح پر کہ اسکو مسٹر ہگنز نے ثابت کیا ہے۔ اسکو پڑھکر مسلمان متعصب مولویوں
کو غیرت کرنی چاہیئے۔ کہ جو کام اُن کے کرنے کا تھا۔ اسکو ایک غیر مذہب کے
منصف شخص نے کیا۔ میں نے اسمیں کچھ اضافہ نہیں کیا۔ بعینہ مسٹر ہگنز کی تحریر
نقل کردی ہے۔ مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہہ ثابت کی ہے۔ کہ نام آنحضرت
کا محمد توریت میں موجود ہے۔ چنانچہ عبری توریت میں وہ لفظ اور نشان شمائل آنحضرت
کے بجنسہ نکالے ہیں! مگر افسوس ہے۔ کہ اسپر بھی میں کافر ہوں۔ اور یاران باد
فروش وعظ گو مسلمان کیا انہوں نے خدا کو بھی اپنا سا نابینا یقین کیا ہے۔ چند
صفحے ہوئے۔ کہ باب بشارات تمام میں آپکے پاس بھیج چکا ہوں۔ اسکو ضرور
سنئیے۔ یہ سب بحث اُس میں مندرج ہے۔ اور یاران زمانہ سے ایک فتویٰ پوچھئیے
کہ آنحضرت صلعم کی بشارات کے اثبات میں ایک شخص نے اسقدر محنت وجانکاہی
کی ہے۔ وہ شخص کافر ہے۔ یا مسلمان۔ نظر ربی۔ نظر ربی۔ اسمع یا محمد۔ ما نقول،
امتک لذتیک التی تقول علی اسمک۔ ابی وامی یا رسول اللہ۔ اللھم اھدنا واھدھم
اللھم اغفرلنا واغفرلھم۔ برحمتک یا ارحم الراحمین۔ میں جو خط لکھتا ہوں۔ خاص
تمہارے پڑھنے کیلئے لکھتا ہوں مجھے ایسے لفظوں میں لکھنا نہیں آتا۔ جو

اندھوں کے دکھانے کے لایق ہو۔ میں یقین کرتا ہوں۔ کہ جسقدر لوگ مجھکو برا کہتے
ہیں۔ اگر خدا مجھے اُسپر صبر کامل عطا کرے۔ تو میرے لئے ایک نہایت عمدہ زادراہ
دوسری دنیا کیلئے ہے۔ جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ ایسا کس کا نصیب۔ جس کو
نہایت عمدہ زادِ راہ وہاں کے لئے ہاتھ آوے۔ حج کریں حاجی صاحب۔
حدیث پڑھیں مولوی صاحب۔ اور سب کا نتیجہ ہمکو ملے۔ اس سے زیادہ کیا خوب
بات ہوگی۔ جو جو نصیحتیں آپ نے مجھکو ارقام فرمائی ہیں۔ میں انکا دل سے شکر
گزار ہوں۔ اور دل سے اقرار کرتا ہوں۔ کہ اسپر عمل کروں گا۔ اور اس عریضہ کی
تاریخ آپ یاد رکھئے۔ اس کے بعد سے میری کوئی تحریر نہ دیکھئے گا۔ میں
اپنی تحریر سابق کو ذرا بھی سخت نہیں سمجھتا۔ کیا میں نے اس میں کسی کو گالیاں دی
ہیں۔ کیا مینڈک کی کہانی کا یہ مقصود ہے۔ جو انہوں نے نکالا ہے۔ یا صرف
وہ مشہور کہانی ہمیشہ اس مثل کی جگہ استعمال ہوتی ہے۔ کہ جس کسی نے ایک
چیز نہیں دیکھی۔ وہ اسپر یقین نہیں کرسکتا۔ صرف یہہ لفظ کہ وہ مثل حیوان کے ہیں
سخت ہے۔ گو حقیقت میں نہیں ہے۔ خدا ان کو سمجھاوے۔ ان اندھوں سے
کہو۔ کہ ذرا انگلش مین کلکتہ کے اخبار کو پڑھا کریں۔ کہ وہ کیا کچھ حضرات ہندوستانیوں
کی نسبت لکھا کرتا ہے۔ اور انگلستان کے اخبار اسکو نقل کرکے کیا کیا باتیں لکھتے
ہیں۔ حقیقت میں کمال بیعزتی کی بات ہے۔ کہ ایسی باتیں جو حقیقت میں سچ
ہیں۔ ہم دیکھیں۔ اور زندہ رہیں۔ زیادہ تر مجھکو مسلمانوں پر رنج و افسوس ہے
یہاں کے کتب خانوں میں بعض قدیم انگریزی کتابیں میں نے دیکھیں۔ جنمیں
مسلمانوں کے چال چلن۔ ان کی سچائی۔ ایمانداری کی تعریفیں اور مثالیں لکھی ہیں
زمانہ حال میں جو کچھ ان کے اوصاف چھپتے ہیں۔ انکو دیکھکر عبرت مند آدمی کو منہ
دکھانے کی جگہ نہیں رہتی۔ تمہارے محمود کی یہ رائے ہے۔ کہ جو صفت لفظ
جنٹلمین کی ہے۔ بہت کم رئیس ہندوستانی ہوں گے۔ جن پر صادق آتی
ہو۔ ایک خط اس کے پاس نہایت شریف خاندان کے شخص کا آیا۔ اس میں

لکھا ہے - کہ میں نے کئی خط رجسٹری کراکے بھیجے ہیں - اُس نے کہا - کہ ایسا جھوٹ
لکھنا کیا جنٹلمین کا کام ہے - جب اُن کو اِس بات کی بھی شرم نہیں آئی - کہ جسکو
میں لکھتا ہوں - وہ جھوٹ سمجھیگا - تو وہ کیونکر جنٹلمین گنے جا سکتے ہیں - غرضیکہ ہم
لوگوں نے ایسی بد عادتیں اختیار کر لی ہیں - جس سے شیطان کو بھی شرم آتی ہے
اور اصل یہ ہے - کہ غیرت نہیں رہی - اور جھوٹی شیخی میں مرتے ہیں - اس میں
کچھ شک نہیں - کہ میرے برا کہنے سے آپکو نہایت رنج ہوتا ہوگا - اور اسی جوش
میں آپنے کچھ لکھا ہوگا - جواب تک میں نے نہیں دیکھا - مگر آپ کیوں نہیں
صبر کرتے - اور آئندہ سے آپکی نصیحت پر عمل کرنے کا میں نے اقرار کر لیا ہے - پچھلے
گناہوں سے توبہ! توبہ! توبہ - مگر صرف آپکے حکم سے میں انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب آنیوالا
ہوں - مسٹر ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپنا میرے آنے تک ملتوی رکھیے - میں خدا
معلوم آپ سے کیا کیا کہنے کو ہوں - اور کیا کیا کرنے کو - بعد سب گفتگو کے جیسا
مناسب ہوگا - کیا جاویگا - اسقدر جلدی کیا ضرور ہے - (اخبار میں لفظ حاشیہ کے
غلط چھاپ دئیے ہیں - لم لایجوز کالم بھی چھاپا ہے -) میں بڑا خوش ہوا - کہ میں
ادیب ہو گیا - واہ وا میں ایسا ہی ادیب ہوں - کہ حریری و متنبی میرے سامنے مات
ہیں - (جھوٹی شیخی پر لعنت) (ایسی جھوٹی خوشی پر تف) میں ہمیشہ سیدھی طرح اردو میں
خط لکھتا ہوں - مگر جب کاغذ ایسا ہوتا ہے - جس کی پیشانی پر پھول یا نقش بنے
ہوتے ہیں یا کچھ چھپا ہوتا ہے - اور وہ خط لکھنے کو موجود ہوتا ہے - تو لاچار بہ اتباع
وضع کاغذ اسی طرف سے لکھا جاتا ہے - اب آپکا حکم جو ہوا ہے - اس کی تعمیل
کرونگا - اور کبھی اس قسم کے کاغذ پر عربی لفظ نہ لکھونگا -

میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور نصف ماہ اگست میں یہاں سے روانہ ہونگا - اور
ایک ہفتہ مصر میں رہونگا - اور وہاں کے مسلمانوں کا حال دیکھونگا - اور آخر
ستمبر میں انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی زیارت بمقام الہ آباد حاصل کرونگا -

مجھ کو جو آپ سے عقیدت اور محبت ہو گئی ہے - بیان سے باہر ہے -

کوئی دن ایسا نہیں ہوتا۔ کہ آپکا تذکرہ نہایت جوشِ محبت سے نہ کرتا ہو۔ اس
حد سے زیادہ خاص مسلمانوں کے ابتر حال کا رنج ہے۔ اور تمام خیالات جو قریب
مالیخولیا کے ہیں۔ بکتا ہے۔ اور ان کے ساتھ یہہ بھی کہتا جاتا ہے۔ کہ بس
مولوی مہدی علی میرا ساتھ دینگے۔ اور ہم اور وہ ملکر یہہ کام کرلیں گے۔ وہ اپنے
میں اور آپ میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ بعض دفعہ کہتا ہے۔ کہ ہم یوں کریں گے۔
اور حقیقت میں اِس لفظ "ہم" سے مولوی مہدی علی مراد ہوتے ہیں۔ اس کو مذہب
اسلام اور اس کی خوبیوں اور اس کے مسائل کی سچائی پر ایسا استقلال اور یقین
کامل ہوگیا ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں جہاں ذکر حجرِ اسود
لکھا ہے۔ وہاں یہ بات لکھی ہے۔ کہ جو حدیثیں نسبت حجرِ اسود کے وارد ہیں۔ کہ
وہ بہشت کا پتھر ہے۔ اور چنیں و چناں۔ وہ ضعیف ہیں۔ سندِ کامل نہیں رکھتیں
وہ دو گھنٹہ تک بیوقوفی سے لڑا۔ کہ نہیں یہی صحیح ہے۔ اور اسی پر مجھے یقین کامل
ہے۔ میں نے کہا کہ بابا تو اپنا یقین کامل اپنے پاس رہنے دے۔ تو میری رائے
میں دخل کرتا ہے۔ کہا۔ کہ نہیں۔ جو مجھے دل سے یقین ہے۔ وہی سچ ہے۔ غرضیکہ ایسی
بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے جبکہ میں نے اسکی تحقیقات بیان کی۔ اور اصلیت لکھی۔ اور
بیان کیا۔ کہ وہ کیا چیز ہے۔ اور اصلیت اسکی کیا ہے۔ تو اس سب کو پسند کیا۔ مگر کہا۔ کہ
وہ بھی سچ ہے۔ اور یہ بھی لکھ دو۔ کہ حقیقت میں فرشتے بہشت سے لیکر آئے تھے تماشہ
یہ ہوا۔ کہ نوبت تحریر اس اعتراض کی پہنچی۔ کہ حجرِ اسود کا بوسہ دینا۔ اور کعبہ کے گرد پھرنا
کیوں بت پرستی نہیں۔ اور مہادیو کے گرد پھرنا۔ اور ڈنڈوت کرنا۔ کیوں بت پرستی ہے
چنانچہ عیسائیوں کا اعتراض۔ کہ آنحضرت صلعم کامل طرح سے بت پرستی موقوف نہ کرسکے
تو جھٹ بول اٹھا۔ کہ خدا کا حکم۔ میں نے کہا۔ کہ ہندو بھی کہتے ہیں۔ کہ خدا کا حکم ہے۔
جب تو بہت دق ہولیا۔ اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔ تو جواب میں نے لکھا ہے۔ وہ سنایا
اسکو سنکر اس کا خون بڑھ گیا۔ کہ اسلام پر سے بڑا اعتراض خوب اٹھایا گیا۔ حدیث غرانیق
کے بیان میں اور حدیث الشیخ والشیخۃ میں جو آپ نے آپ کے ان کے علماء کو نہایت

سخت و سست لکھا ہے - اور امام فخر الدین وغیرہ کو اپنے ساتھ کر لیا ہے - اگر اس زمانہ میں میں ہوتا - اور خلیفہ یا قاضی ہوتا - تو ضرور ان مولوی صاحبوں کو جنہوں نے اتہام ان دونوں حدیثوں کا آنحضرت صلعم پر لگایا ہے تعزیر کرتا - میں نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں ان انگریزوں کی تصنیف کا حال جنہوں نے آنحضرت پر اعتراض کئے ہیں، لکھا ہے۔ اور اُن انگریزوں کا جنہوں نے نہایت انصاف سے مذہب اسلام کی حمایت کی ہے شکر کیا ہے - اور ان کے اقوال اور رائیں بھی جا بجا نقل کی ہیں - منجملہ ان کے دو شخصوں کی رائوں کے پرچے اس عریضہ میں ملفوف کرتا ہوں - ان کے ترجمے صحیح صحیح لکھئے - اور دیکھئے - کہ کیا چیز ہیں - اور میرے حق میں دعا رخیر کیجئے - کہ میں نے کس محنت سے کیا کیا چیز بہم پیدا کی ہیں - ہزاروں باتیں کہنے کو ہیں - کہاں تک لکھتا جاؤں -

حافظ کریم بخش صاحب کی عنایت و محبت دلی کا حد سے زیادہ مشکور ہوں - میں اپنے ساتھ محبت کرنیوالوں کا خواہ وہ قیصر ہو - یا بیچارہ غریب حافظ - "بندۂ درم ناخریدہ ہوں"۔

میرا بہت بہت سلام انکو پہنچے - حامد بہت تسلیمات آپکو اور سلام و نیاز حافظ جی کو عرض کرتا ہے - محمود نے کہا - کہ میری طرف سے کچھ مت لکھو - میں خود لکھونگا - چھجو بہت تسلیمات عرض کرتا ہے - آپ کے عنایت آمیز لفظ سنکر بھولا نہیں سماتا - الٰہی خاں خانساماں کو سلام پہنچے - بخدمت جناب مولوی معین الدین صاحب کو بعد سلام مسنون کے عرض یہ ہے - کہ قصۂ عاد و ثمود و باغ ارم و سدِ سکندری کا ثبوت کتابوں سے ڈھونڈ کر نکال رکھئے گا - مگر ایسا ثبوت جو غیر مذہب والوں پر حجت ہو - اور یہ بھی ارقام فرمائیے - کہ پہلے تو ہم صرف کرپے تھے - اور اب نیم چڑھے ہو گئے - اب بھی ہمارے ساتھ کھائیے گا - یا نہیں؟ والسلام -

(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن)

(۱۶ - مارچ ۱۸۷۰ء)

جو صدمہ گرانی لاگت کتاب کا مجھ پر ہے - بیان نہیں ہو سکتا - مگر آپ کے عنایت نامہ سے

جس میں ہر طرح کی تقویت ہے۔ جان آگئی۔ خدا انجام بخیر کرے۔ نواب ٹونک کے پاس سے اگر ہزار روپیہ ملے۔ تو کیا کہنا ہے۔ خدا ایسا ہی کرے۔ مگر جب تک آ نہیں جاتے۔ تسلی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ اس باب میں لکھنا فضول ہے۔

(۱۹)

جناب مخدوم و مکرم من۔

اب کی ڈاک میں بھی کوئی عنایت نامہ آپکا نہیں آیا۔ سات دن تک امید بندھی رہتی ہے جب نہیں آتا۔ تو نہایت مایوسی ہوتی ہے میں چاہتا ہوں کہ میرے ہندوستان پہنچنے سے پہلے آپ ایک ایسوسی ایشن خاص مسلمانوں کی بہتری و اصلاح کیلئے قائم کر رکھیں۔ اپنی طرف سے آپ ایک التماس واسطے تقرر مجلس مذکورہ کے چھاپ کر لوگوں کو تقسیم کریں۔ اور ممبر جمع کر کے ایسوسی ایشن بنائیں۔ تاکہ مجھ بدنام کا نام اسمیں نہ آنے پائے۔ اور کسی کو احتمال بھی نہ ہو۔ کہ کچھ میری شرکت اسمیں ہے۔ ایک مسودہ التماس کا جو آپ کیطرف سے تقسیم ہونا چاہیئے۔ سرسری طور پر لکھکر بھیجتا ہوں۔ اس کے پڑھنے سے میرے خیالات آپ کو بخوبی واضح ہو جاویں گے۔ آپ اسکو اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں جد تغیر و تبدیل جسطرح پر چاہیں۔ مرتب کر کے چھاپیں۔ کار وائی سوسائٹی کی میرے آنے کے بعد شروع ہو۔ آپ غور فرماویں۔ کہ ایسی سوسائٹی یا ایسوسی ایشن کا بنانا نہایت ضرور ہے۔ اس پر آپ ضرور متوجہ ہوں۔ اس ایسوسی ایشن کا کوئی عمدہ سا نام تجویز فرمائیے۔ میں نے جو نام رکھا ہے۔ نہایت برا ہے۔ آپ کوئی تجویز کریں۔ میرے خیال میں مفصلہ ذیل نام آتے ہیں۔ (مجلس الفلاح فی معاشرت المسلمین) (مجلس المومنین فی اصلاح معاشرت المسلمین) (مجلس تہذیب اخلاق مومنین) مگر ان میں سے کوئی نام بھی عمدہ نہیں ہے۔ بہر حال آپ جو نام تجویز کریں۔ اس کو ایک پرچہ کاغذ پر نہایت خوشخط عربی میں جناب حافظ جی صاحب

سے لکھوا کر میرے پاس بھیجدیں۔ کہ میں اس نام کی نہایت خوبصورت آہنی پیٹری یہاں سے بنوا تا لاؤنگا۔ کہ جو ماہواری رسالہ الیسوسی ایشن سے نکلا کریگا۔ اس پر وہ نام بذریعہ اس پیٹری کے جو نہایت خوبصورت ہوگی۔ چھپا کریگا۔ یہاں سب خوبصورتی اس پیٹری کی ہو جاوے گی۔ الاحرف جیسے لکھے آویں گے۔ بعینہ ویسے ہی بنیں گے۔ اِسلئے حرف نہایت خوشخط ہوں۔ اور بہت پرکار قلم سے نہ لکھا جاوی بلکہ متوسط قلم سے ہو۔ اور اسکا قلم اس سے زیادہ موٹا نہ ہو۔ جیسا کہ یہ لفظ بطور نمونہ کے لکھتا ہوں۔

اب ج۔

چندہ اور رسوم داخلہ جو میں نے تجویز کی ہے۔ اسمیں کچھ زیادتی کمی نہ فرمائیگا۔ کیونکہ وہ نہایت مناسب ہے۔

میں نہیں جانتا۔ کہ آپ کی رائے میں الیسوسی ایشن کا مقرر کرنا اچھی بات ہے۔ یا نہیں۔ مگر میں تو اسکو نہایت مفید سمجھتا ہوں۔ اس کے انجام کے لئے چنداں خرچ کی بھی درکار نہ ہوگی۔ قواعد اس کے اور تمام بندوبست اس کی کارروائی کا وہاں پہنچکر میں آپ کی خدمت میں عرض کرونگا۔ مگر آپ اس کا اشتہار میرے آنے سے پہلے دے دیجئے۔ اور ممبر جمع کر لیجئے۔ جہاں تک ممکن ہو۔ مختصر نام تجویز کیا جائے۔ اور جب پرچہ کا غذ پر نام عربی خط میں لکھا جاوے تو خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اسکی سطر اس لکیر سے جو میں نیچے کھینچتا ہوں۔ زیادہ لمبی نہ ہو جائے۔ بلکہ اگر اس سے کچھ کم ہو۔ تو مضایقہ نہیں۔ اور نہ پیٹری کے بننے اور اسکی خوبصورتی میں دقت پڑیگی۔ اگر اس قلم سے جسکا نمونہ میں نے بتایا ہے۔ نہ آسکے۔ تو قدرے کم اور باریک کرلیا جائے۔ مگر سطر اس سے بڑی نہ ہونے پائے۔ فقط۔

بخدمت جناب حافظ جی صاحب سلام مسنون بعد نیاز پہنچے۔ والسلام
(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن) (تاریخ روانگی خط
۲۲-اپریل ۱۸۷۰ء)

(۲۰)

جناب مخدوم و مکرم من۔

دیکھئے اب کی میل میں بھی آپکا کوئی عنایت نامہ آتا ہے۔ یا نہیں۔ کئی روز ہوئے۔ کہ میں نے آپکو واسطے مقرر کرنے ایک ایسوسی ایشن کے لکھا تھا میری رائے میں مناسب ہے۔ کہ ابھی اسکی تدبیر ملتوی رکھی جاوے۔ کیونکہ ابھی بہت سے امور ایسے ہیں۔ کہ بغیر زبانی گفتگو و جواب سوال و صلاح مشورہ کے طے نہیں ہو سکتے۔ فقط

میرے پاس شعلۂ طور کانپور پہنچا۔ آپ نے دیکھا۔ کہ دشمنوں اور حاسدوں اور بدطینتوں کا کچھ علاج نہیں۔ آپ نے جو گفتگو عمّ نواب صاحب ٹونک سے میری نسبت کی ہے۔ وہ کیسی صفائی اور نیک دلی کی تھی۔ اعانت کتاب کی جو آپ نے ان سے درخواست کی۔ وہ صرف ایک اپنی نیکی سے کی۔ اب اس تمام مجلس کا نام (چندہ دستگیری مسافر لندن) رکھا گیا ہے۔ جو مضمون کہ اسمیں لکھا گیا۔ وہ آپنے پڑھا ہوگا۔ اور امید ہے۔ کہ اور بہت کچھ لکھا جاویگا اگرچہ ایسی باتوں سے کبھی دلکو ملال ہوتا ہے۔ جو مقتضائے بشریت ہے۔ مگر فی الفور رفع ہو جاتا ہے۔ اور دلکو صرف دو خیالوں سے تسلی ہوتی ہے اوّل تو اس خیال سے کہ آجتک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا۔ جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی دشمن مخالف نہ کھڑا ہوا ہو۔ آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ، خلفائے اربعہ، محی الدین جیلانی، مجدد الف ثانی، محمد اسمٰعیل دہلوی۔ و علی ہذا القیاس پس میں تو اُن کی جوتیوں کی برابر نہیں ہوں۔ پھر مخالفت پر کم

باندھنی کچھ بُری بات نہیں ہے۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں
کہ جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے۔ ویسے ہی نیکی بڑھتی گئی ہے۔
پس اگر میرا کاروبار اور میری نیت سچی اور نیک ہے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ اسمیں کچھ
نقصان نہیں ہونے کا۔ اور اگر وہ نیک نہیں ہے۔ اور میں غلطی سے اس کو نیک
خیال کر رہا ہوں۔ تو بلاشبہ ٹوٹ جاویگا۔ اور مخالف جو ایسی صورت میں ضرور ہے
کہ نیکی پر ہونگے۔ کامیاب ہوں گے۔ اور ایسی حالت میں مجھکو بھی ان کی کامیابی
خوشی کرنی ہوگی۔ نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑے ہونے
کا رنج جس روپیہ کے دینے کا نواب صاحب ٹونک کے چچا نے وعدہ کیا ہے۔
اس کے ملنے کی مجھکو ہرگز توقع نہیں ہے یقینی نہیں ملنے کا۔ مگر ہمارے شفیق
جناب مولوی سید امداد العلی خاں بہادر کو عمدہ مضمون چندہ دستگیری مسافر
لندن مل گیا۔ فقط

دیکھو دشمنی آدمی کو ایسا اندھا کر دیتی ہے۔ اسی اخبار میں تاریخ ہندوستان
کے مضمون کو پھر نقل کر کے بشدومد لکھا ہے۔ کہ جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا
ہو۔ وہ کیسا جاہل ہے۔ حالانکہ خود اسی عبارت کو لکھتے ہیں۔ پھر مجھ میں اور
ان میں کیا فرق ہے۔ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا ہے۔ اور
انہوں نے اردو سے۔ ایک اور مجھے خبر ملی ہے۔ جس کا مجھے کمال رنج اور فکر
ہے۔ کہ بابو شیوا پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل
میں جوش آیا ہے۔ کہ زبان اردو و خطِ فارسی جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا
دیا جاوے۔ میں نے سنا ہے۔ کہ انہوں نے سینٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں
سے تحریک کی ہے۔ کہ بجائے اخبار اردو ہندی ہو۔ ترجمہ کتب بھی ہندی ہو۔
یہ ایسا تدبیر ہے۔ کہ ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔
مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے۔ اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا۔ کہ ہندو
علیحدہ اور مسلمان علیحدہ ہو جاویں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں۔ بلکہ

میں سمجھتا ہوں۔ کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ہوکر اپنا کاروبار کرینگے۔ تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔ الّا اس میں دو ادمی کا خیال ہے۔ ایک خاص اپنی طبیعت کے سبب سے کہ میں کل اہل ہند کیا ہندو کیا مسلمان کی بھلائی چاہتا ہوں۔ دوسرے بڑا خوف اِس بات کا ہے۔ کہ مسلمانوں پر نہایت بداقبالی اور ادبار چھایا ہے۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں۔ اور وہ مطلق اپنے نقصان کو نہیں سمجھتے۔ اس پر حسد اور کینہ ان میں باہم بہ نسبت ہندوؤں کے اور جھوٹی شیخی بہت زیادہ ہے اور کسی قدر مفلس بھی ہیں۔ اِن وجوہات سے وہ ہرگز اِس قابل نہیں ہونے کے۔ جو اپنی بھلائی کے لئے کچھ کرسکیں۔ اگر سلطان محمود ان تعصبات کو نہ چھوڑتا۔ اور سلطان عبدالمجید اس طریقہ کو جسے سلطان محمود نے اختیار کیا تھا۔ ترقی نہ دیتا۔ تو آج روسیوں کے حملہ کے سبب ترکوں کا اور مسلمانوں کا دنیا پر نام و نشان نہیں رہتا۔ اور خدا جانے جزیرۂ عرب میں کیا ہوتا۔ اس کے بعد حال کے سلطان سلطان عبدالعزیز نے جو اس سے بھی زیادہ بے تعصب طریقہ اختیار کیا ہے۔ اگر نہ ہوتا۔ تو سلطنتِ روم۔ جس تاریکی اور تباہی کی حالت میں پڑی تھی۔ ممکن نہ تھا۔ کہ اب تک غرق نہ ہو جاتی۔ اِن تینوں بادشاہوں کو یورپ کا طریقہ اختیار کرنے میں اُن جاہل متعصب ترکوں کے الزام سے اور بیوقوف ناسمجھ مولویوں اور قاضیوں کی لعنت و ملامت سے بچنا نہایت مشکل تھا۔ مگر جو علماء کہ عقلمند اور بے تعصب تھے۔ انہوں نے ان کی تمام چیزوں کو جن کو سلطان چاہتا تھا۔ اور جن کے بغیر درحقیقت ترقی مسلمانوں کی غیر ممکن تھی۔ جائز و درست اور عین مطابقِ شرع بتلایا۔ اور خود سلطان نے اور تمام لوگوں نے ان کو اختیار کیا۔ پس یہ سبب ہے۔ جو آج آپ قسطنطنیہ کا نام سنتے ہیں۔ یہ تمام حالات میں نے جمع کئے ہیں سب آپکو دکھلاؤنگا۔ بہرحال تعصب خود خلافِ شریعت ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس میں گرفتار ہیں۔ خدا کی نامہربانی ان کی طرف رجوع ہے۔ وہ

اب مثل یہود کے ذلیل و خوار ہونے والے ہیں۔ پھر اس کا علاج کیا ہے۔ خدا کیساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں۔ اور ہر روز چھپتی ہیں۔ اور بکتی ہیں۔ ان میں جو حالات مسلمانوں کے لکھے جاتے ہیں۔ انکو دیکھ کر مرجانے کو ہی چاہتا ہے۔ بہت سی باتیں ان میں بلاشبہ سچ ہیں۔ اور درحقیقت ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس سے اسلام کو بدنامی ہے۔ پس اس بیوقوفی سے کہ کانپور میں بیٹھے جھوٹی شیخی مارا کریں کیا ہوتا ہے۔ میرے صرف ایک لفظ لکھنے سے کہ حیوان ہیں۔ نالائقوں کو اس قدر طیش کھانے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ اور انگریزی اخباروں اور تاریخوں میں جو اوصاف چھپ رہے ہیں۔ اُن سے کسی کمبخت کو غیرت نہیں آتی۔ فقط

سلطان عبدالمجید کی ایک اسپیچ میرے ہاتھ آئی ہے۔ جس کو رشید پاشا۔ اس کے وزیر نے تمام علماء اور قضات اور مفتیوں اور سرداروں کو جمع کرکے پڑھا تھا۔ وہ قابل دیکھنے کے ہے۔ کہ اسمیں کیا ہے۔ میں ساتھ لاؤں گا۔ ڈاک ہندوستان کی آگئی۔ آپکا کوئی عنایت نامہ نہیں آیا۔ لاچار اسی عریضہ کو بند کرکے روانہ کرتا ہوں۔ بعد ایخدمت حافظ جی صاحب سلام مسنون پہنچے۔ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (مقام لندن)

(۲۹۔ اپریل ۱۸۷۰ء)

بعد تحریر اس عریضہ کے سوسیٹی کا اخبار میرے پاس آیا۔ جس میں میری عرضداشت کا جواب آپ کی طرف سے چھپا ہے۔ اس کی نسبت اگلے میل میں کچھ لکھوں گا مگر یہ تو مجھے بتاؤ۔ کہ جو باتیں ہم اپنے دل سے کرتے ہیں۔ وہ تم تک کون پہنچا دیتا ہے۔ یا تو تم چور ہو۔ کہ میرا دل چرا لیجاتے ہو۔ یا خود میرے دل ہو۔ کہ میری سب باتیں تم ہی سے ہوتی ہیں۔ میں کافر ہوں۔ اگر یہ چاہتا ہوں۔ کہ میری رائے و تدبیر مانی جاوے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ قوم کی بھلائی پر لوگ

متوجہ ہوں - اور یہہ دکھاتا ہوں - کہ تعصب بہت بڑا مانع ہے -
عریضہ سابق میں در باب تقرر ایسوسی ایشن کے لکھا تھا - اور اس عریضہ میں منع لکھا ہے - اب بعد معائنہ اخبار مذکور کے یہ لکھتا ہوں - کہ اُن دونوں باتوں میں سے آپ کسی کو نہ مانیں - بلکہ جو آپ کا دِل چاہے - اور آپ کی رائے میں مناسب ہو - اس کے مطابق کام کریں - اگر بالتخصیص مسلمانوں کی ترتیب کیلئے جداگانہ مدرسہ مقرر ہوجاوے - تو ایک رحمت ہمارے لئے ہے -
کوئی رات نہیں جاتی - کہ ایسے مدرسہ کی تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں - مگر بغیر دس لاکھ روپیہ نقد ہوئے ممکن نہیں ہے - والسلام -
(سیّد احمد)

(۲۱)

جناب مخدومی و مکرّمی مدظلہ العالی -
بعد تسلیم سلام مسنون - التماس یہہ ہے - کہ آپکا عنایت نامہ مورخہ ۲ - مئی پہونچا - دل وجاں روح وروان کو تقویت بخشی - خدا آپ کو سلامت رکھے - قبل اس کے کہ آپ کی تحریر کا جواب شروع کروں - ایک امر نہایت ضروری لکھتا ہوں - فی الفور بلا تامل سکےعثتے اس کی تعمیل فرمائیے - اور وہ کام یہ ہے - کہ یہاں ایک نہایت معزز و عالی درجہ صاحب ہیں - جنکا حال ہمیں آپ سے زبانی کہونگا - اور وہ میرے بڑے دوست ہیں - انہوں نے بسبب کسی ضرورت کے مجھسے فرمائش تفسیر عزیزی کی کی ہے - اور مجھے یقین ہے - کہ اصل تفسیر عزیزی فارسی اول کا سیپارہ اور آخر کے دو سیپارے یعنی اس کے دونوں ٹکڑے لکھنؤ یا میرٹھ و دہلی میں چھاپہ ہوئے ہیں - پس جو نسا چھاپہ نہایت عمدہ ہو - فی الفور خرید کر میرے پاس روانہ کرو - کہ میرے یہاں ہونے تک پہنچ جاوے - یہ خط آپ کو شروع جولائی میں پہنچیگا - اگر آپ فی الفور روانہ

فرمائینگے۔ تو شروع اگست میں قبل میری روانگی کے یہاں پہنچ جاوے گا۔ یقینی میرزاپور میں کوئی دوکان کتب فروش کی نہ ہوگی۔ آپ فی الفور ایک خاص آدمی لکھنؤ روانہ کرکے وہ کتاب خرید منگوائیے۔ اور باحتیاط تمام لفافہ موم جامہ سرکشادہ میں بذریعہ بک پوسٹ روانہ فرمائیے۔ تاکید اکید تصور فرمائیگا۔ فقط۔

ہمشیرہ حامد و محمود کے انتقال کا جو صدمہ ہم پر ہوا۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ رضینا برضاء اللہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ فقط۔

لندن کے احباب اور علماء اور اشخاص نامی جسطرح محبت و اخلاق سے مجھ سے ملے اور صرف اپنے اخلاق سے مجھ غریب نالایق کی جسقدر خاطر کی۔ اُس کا میں نے کبھی ذکر نہیں لکھا۔ اگر وہ لکھا جاتا۔ تو مبالغہ پر محمول ہوتا۔ اور حاسد شاید آتش حسد میں اسقدر افروختہ ہوتے۔ کہ بجز آتش حسد کے اور کچھ نہ رہتا۔

تبدیلِ وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ وہ سب بجا ہے۔ بشرطیکہ میرا جادو، توبہ توبہ میرا معجزہ، نعوذ باللہ میری کرامت، لاحول ولاقوۃ الا باللہ میری حماقت تم میں نہ اثر کریگی۔

ذرا صبر کرو۔ تین مہینے خیر سے گذر جاویں۔ جب الہ آباد کے اسٹیشن پر گلے ملوگے اور چھاتی سے چھاتی لگے گی۔ اسوقت پوچھیں گے۔ کہ جانِ من (معاف کیجیے بیخودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔

حقیقت میں ۳۰۔ اپریل کے اخبار میں جو مضمون چھپا ہے۔ وہ الہام یا القاء غیبی ہے۔ نہایت عمدہ ہے۔ اگر میں یہودی ہوتا۔ تو بجائے عزیز ابن اللہ کے مہدی ابن اللہ کہتا۔ توبہ استغفر اللہ خدا معاف کرے ؎

قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش۔
اصطلاح شوق بسیار است و من دیوانہ ام

میرے تئیں جسقدر طعنے دوگے، میری جان خوش ہوگی۔ آپ خفا ہوں۔ یا نہ ہوں

ہیں سچ اپنے دل کا حال کہتا ہوں - کہ اگر خدا مجھکو ہدایت نہ کرتا - اور تقلید کی گمراہی
سے نہ نکالتا - اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا - تو یقینی مذہب کو چھوڑ
دیتا - فرض کرو - کہ تقلید چھوڑنے میں میں کسی مسئلہ پر یا عقیدہ میں غلطی میں پڑوں
چنداں نقصان نہیں ہے - مسلمان تو رہونگا - کیا آپ کے نزدیک امام اعظم
علیہ الرحمتہ نے کسی مسئلہ میں غلطی نہیں کی - قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ
مسلمان تیلی - جولاہوں - ناخواندہ یا کم علم مسلمانوں کو سزا دینے لگے گا - تو بندہ
سامنے ہوکر عرض کریگا - کہ جناب باری انصاف فرمایئے - کہ ان بیچاروں کا کیا قصور
ہے - یہہ تو حضور خود بدولت ہی کی تقصیر معلوم ہوتی ہے - کہ ان کو ایسا مذہب
دیا تھا - جس کے سمجھنے اور حل کرنے میں جناب مولوی سید مہدی علی صاحب
جگر گوشۂ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اپنے تئیں لایق نہیں سمجھتے
تھے - پھر یہ بیچارے غریب کیا کرتے - جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی
زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے - وہ کوئی معما یا بدر چاچ کا شعر
نہیں ہے - جس کے حل کرنیکو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسین تمنائی درکار
ہوں - خدا تو فرماتا ہے "ہو الذی بعث فی الامیین رسولاً منہم یتلو علیہم آیتہ" - ذرا
مہربانی و عنایت سے قرآن مجید کھولکر ملاحظہ فرمایئے - اس میں یہی لفظ ہیں - کہ بجائے
ان کے یہ الفاظ ہیں "ہو الذی بعث فی الفلسفیین رسولاً الخ" بہر حال ملنے کے بعد
جو کہو گے - مانیں گے - جو بات ملنے کی نہ ہوگی - وہ بھی مانیں گے - مولوی معین الدین
صاحب کے دوبارہ ارتداد سے نہایت افسوس ہوا - ان سے فرمایئے - کہ جناب مولوی
صاحب گوز پر گوز اور وضو پر وضو اچھا نہیں ہے - بہر حال بہت بڑے عالم ربانی
ہیں - ان کی خفگی برداشت کرنی چاہیے - اور مجھ شیطان کا بہت بہت سلام عرض کیجئے -
اور فرمادیجے - کہ حضرت ہوشیار رہئے - کبھی ایسی ملمکاری دی ہوگی - کہ یاد کروگے
جناب مولوی سید امداد العلی صاحب کی عنایت و شفقت جو مجھپر ہے - اس کا حال معلوم
ہوا - خدا ان کو خوش رکھے - اور وہ درجہ جو خدائی سے بھی بالا ہو - عطا فرمائے

الحق ولی را ولی می شناسد۔ شادم کہ من ہم ولی ہستم۔ سبحان اللہ بہ خدائے خود راضی نبودم۔ حالا بر ولایت خود راضی شدہ ام۔

میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحر نے پڑھی۔ جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے اور جسطرح میرے ہاتھ چومے۔ اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں۔ اس کے چند مقام ایسے ہیں۔ جنکو دیکھکر تو مسلمانان ہند فتوئ کفر دیں گے۔

کتاب کے اخراجات کا صدمہ اور عین اسی حالت میں صدمہ غم انتقال ہمشیرہ حامد و محمود کا لاحق ہونا۔ جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گذرا۔ واقعہ کربلا سے کم نہ تھا۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔

آپ نے جو الفاظ اپنی محبت و الفت سے لکھے ہیں۔ انکا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف لکھتا ہوں۔ کہ اب کچھ حاجت نہیں رہی۔ تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا سب بیباق ہو گیا۔ اب آپ نہ کچھ قرض لیجئے۔ نہ اپنی تنخواہ بھیجئے۔ اگر نواب ٹونک سے درحقیقت روپیہ ملے۔ تو وہ بھیج دیجئے گا۔ اس کے سوا اور کچھ نہ بھیجئے گا۔ اگرچہ یقینی وہ نہیں ملنے کا۔ کل جو اخبار لندن میں چھپے ہیں۔ ان میں آپ کی گفتگو کا بالکل اور نواب ٹونک کے ہزار روپیہ دینے کا ذکر چھپا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ ہزار روپیہ کا اسقدر چرچا ہو گیا۔ اور جناب مولوی سید امداد العلی صاحب نے مضمون چندۂ دستگیری مسافر لندن بھی لکھدیا۔ اور جو کچھ انہوں نے متعدد جلسوں میں ہنسی اڑائی ہے جس کی صحیح خبر مجھے پہنچی ہے۔ اسکا بیفائدہ مجھے رنج ہوا۔ اور آپ یقین جان لیجے گا۔ کہ وہاں سے ایک کوڑی نہیں ملیگی۔ یہ آپ کی غلطی تھی۔ جو آپ نے اُسپر یقین کیا۔ مرزا خدا داد بیگ امتحان میں ناقص نکلے۔ اور انکا بہت نیچا نمبر رہا۔ اور آئندہ بھی مجھے توقع نہیں ہے۔ جسوقت میں آپ کے الفاظ چھجو کو سناتا ہوں۔ خوشی کے مارے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ اور آپکو ہزاروں دعائیں دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ خدا وہ دن کرے۔ کہ ملازمت ہو۔ بخدمت عالی جناب حافظ جی صاحب سلام بصد عجز و نیاز

پہنچے۔ میں نے ان کو دربارہ مہدی میں اپنا وکیل مقرر کر رکھا ہے۔ کہ ہردم میری شفاعت کرتے رہیں۔ اور میری نالایق حرکتوں کی معافی چاہتے رہیں۔ والسلام۔

(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن)

(۱۰۔ مئی ۱۸۷۰ء)

(۲۲)

بخدمت شریف خلیفۂ ظاہری و مرشدِ حقیقی و معنوی مولانا مرشدنا مولوی سید مہدی علی صاحب۔

مخدوم و مکرم من سلامت۔

جو حادثہ جانکاہ قضا و قدر سے دہلی میں گذرا۔ اور غالباً جس کی خبر آپ نے مجھ سے پہلے ہندوستان میں سنی ہوگی۔ اور جو غم اُس حادثہ کا مجھپر اور حامد و محمود پر ہوا۔ اسکا آپ خیال کر سکتے ہیں۔ اور فطرتی جو حال میری طبیعت کا ان دنوں ہے۔ وہ بھی آپ تصور کر سکتے ہیں۔ مگر بہر حال شکر خدا ہے۔ فقط۔

آپکا عنایت نامہ مورخہ ۲۶۔ اپریل معہ ہنڈوی تعدادی بیس پونڈ یعنی دو سو روپیہ کے پہنچا۔ اور آپکا شکر کیا۔ اور دعا کی۔ کہ خدا اس کی جزا دے۔ ان دنوں طبیعت ایسی رنجیدہ ہے۔ کتاب کے خرچ کے نہ سرانجام ہونے کا دوسرا رنج ہے۔ مجبوری یہاں روپیہ قرض لینا پڑا چنانچہ تین ہزار روپیہ قرض لینے کی گفتگو ہو رہی ہے خدا راست لاوے۔ آئندہ ڈاک میں فہرست لاگت کتاب کی بھیجونگا جس سے معلوم ہوگا۔ کہ کس قدر خرچ ہوا۔ آپ نے اور تمام دوستوں نے جسقدر مدد کی۔ وہ نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی غنیمت تھی۔ ورنہ زہر کھا کر مرجانے کے سوا اور کچھ چارہ نہ ہوتا۔ مگر اس نالایق[۱] پاگل زین العابدین نے

---

[۱] ان الفاظ پر تعظیم اور ادب کے ہزار الفاظ قربان ہیں۔ یہہ۔ اور اسی قسم کے الفاظ ان لوگوں کے حصہ میں آتے تھے جن سے سرسید کو غایت درجہ کی محبت ہوتی تھی۔ اور جن کیساتھ نہایت بے تکلفی کا برتاؤ ہوتا تھا۔

اب تک اپنا چندہ بھی نہیں بھیجا۔ آپ اُس کو نہایت تاکید کیجیے۔ اس وقت میرے
پاس دس روپیہ بھی کہیں سے آتے ہیں۔ نو ہزار روپیہ کے برابر معلوم ہوتے ہیں آپ
اپنے پاس سے اور اپنے ذاتی روپیہ سے اس سے زیادہ جو کہ آپ کر چکے ہرگز ہرگز
مدد نہ کیجیے گا۔ اور آپ نے جو لکھا ہے۔ کہ میری تنخواہ ملنے والی ہے۔ وہ میں بھیجدونگا
ہرگز ہرگز مت بھیجنا۔ میں اسقدر تکلیف اور اسقدر خرچ میں جو آپ کی طاقت سے
باہر ہو۔ آپکو ڈالنا ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ اور نہ اس طرح پر پڑنا چاہیئے۔ علاوہ اس
کے صرف یہی کام نہیں ہے۔ ہم کو اور بہت کام کرنے ہیں۔ لیکن کسی کو چندہ
میں شریک کرنے یا کتاب کا خریدار بہم پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگرچہ
میں سمجھتا ہوں۔ کہ اب یہ کوشش بھی چنداں مفید نہ ہوگی۔ بقول شخصیکہ۔ تا تریاق
از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود، اب مجھ کو اور میرے حال کو خدا
پر چھوڑ دو۔ فقط

کتاب جلد بندی سے طیار ہوگئی۔ اور کتب فروش کی دوکان میں فروخت کو رکھی
گئی ہے۔ خدا کرے۔ کہ کچھ بک جاویں۔ اور اس بے انتہا مصیبت سے مجھے
کسی قدر سبکدوشی ہو۔ اگر ممکن ہوا۔ تو اسی ڈاک میں ورنہ آئندہ ڈاک میں ایک
جلد آپ کے پاس۔ اور ایک ایک ہر ایک اہل چندہ کے نام روانہ کرونگا۔

راجہ صاحب کا میں نے خط دیکھا۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے۔ بالکل سچ
ہے۔ آپکا جو غصہ کسی قدر فرو ہوا۔ میں اس سے بہت خوش ہوں۔ کیسا برا خیال
تھا۔ کہ بسبب کسی ابتری خواہ اصلی یا غیر اصلی بدانتظامی کے سبب آپ سوسیٹی
سے علیحدہ ہو جاتے۔ بہر حال جو گذرا خدا نے خیر کی۔ مگر تعجب ہے۔ کہ آپ کو
بابو شیو پرشاد صاحب کے مسلمانوں کی نسبت چند ہی کلمات جو کچھ زیادہ سخت
نہ تھے۔ لکھنے ایسے برے معلوم ہوئے۔ مگر جو اُن کی یعنی مسلمانوں کی نیک نامی
یعنی بدنامی اور خوبی یعنی بدی ہر روز تمام ہندوستان کے اخباروں میں چھپتی رہتی
ہے۔ اور کوئی نالایق اور پاجی پن کی حرکت ایسی نہیں ہے۔ کہ جو مسلمانوں کی نسبت

نہیں لکھی جاتی۔ اور غیر مسافروں نے جو اپنے سفر ناموں میں مسلمانوں کی نالایقیوں کا حال لکھا ہے۔ اس سے آپکو کیوں رنج نہیں ہوا صرف اس کا سبب یہ ہے۔ کہ ان حالات سے آپکو اطلاع نہیں ہوتی۔ میری رائے میں آپ بابو شیو پرشاد کا جواب جس کے چھاپنے سے راجہ جیکشن داس بہادر نے انکار کیا۔ کسی اخبار میں مت چھپوائیے۔ اس باب میں میں نے بہت کچھ خیال کیا ہے۔ اور آپ سے کچھ کہنا۔ اور اصلاح کرنی ہے۔ اس کے بعد جیسا مناسب ہوگا۔ کیا جاویگا۔ ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کیلئے جاری کرنا میں نے تجویز کرلیا ہے۔ اور تہذیب الاخلاق اسکا نام فارسی اور انگریزی میں محمدن سوشیل رفارمر رکھ لیا ہے اسکا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لایق یہاں خرید لیا ہے۔ اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کردیں۔ کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جاویں گی۔ خرچ ماہواری اجرائے اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کرکے دیویں گے۔ اور اخبار مفت میں بانٹیں گے۔ اور بقیمت بھی بھیجیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹکل ہوں۔ اور کچھ نہیں ہونے کا۔ اسمیں میں اور آپ دو شخص آرٹکل لکھنے والے ہوں گے۔ اور اگر صلاح ہوگی۔ تو منشی ذکاء اللہ صاحب اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹکل لکھنے میں شریک کریں گے۔ غرضیکہ میں چاہتا ہوں۔ کہ میرے وہاں پہنچنے تک آپ کچھ نہ کریں۔ انشاءاللہ تعالیٰ میں عنقریب وہاں پہنچتا ہوں۔ فقط

میری روانگی کا زمانہ بالکل مقرر ہوگیا۔ اور سکرٹری آف سٹیٹ کو اطلاع دیدی گئی اور منظوری ہوگئی۔ اب میں انشاءاللہ تعالیٰ معہ حامد یہاں سے حسب مندرجہ ذیل روانہ ہونگا۔

۲۸- اگست ۱۸۷۰ء کو انشاءاللہ تعالےٰ میں لندن چھوڑونگا۔ ایک ہفتہ مصر میں رہونگا اور انشاءاللہ تعالیٰ معہ الخیر ۲- اکتوبر ۱۸۷۰ء کو بمبئی پہنچونگا۔ اور چوتھی پانچویں کو انشاءاللہ

تعالیٰ الہ آباد میں آپ کے جمال مبارک کو دیکھونگا - اور آپ کے قدموں کو ہاتھ لگاؤنگا
ان دنوں میں تعطیل دسہرہ کی ہوگی - ۲۶ - اکتوبر تک - اگرچہ دہلی جانے کو مطلق جی
نہیں چاہتا - اور گھر میں گھسنے کے خیال سے دل پھٹتا ہے - مگر بمجبوری بہین اور بھتیجوں
کے سبب ایک دن کیلیئے جانا پڑیگا - باقی ایام تعطیل کے کچھ علیگڈھ اور کچھ مرزا پور میں
بسر کرونگا - امید ہے - کہ تم مجھکو اگر اپنے پاس نہ بیٹھنے دوگے - تو اپنی جوتیوں میں
بیٹھنے دوگے - اگر اپنے ساتھ بٹھلا کر نہ کھانے دوگے - تو کتے کیطرح دوسری رکابی
آگے رکھدوگے - ورنہ اور لوگ تو مجھ کافر کو روٹی پانی دینا ہی کفر سمجھتے ہوں گے -
ہزار ہزار شکر ہے - کہ میرا خدا ایسا نہ ہو - جس کی روز لاکھوں تقصیریں کیا کرتا ہوں - اور
روٹی دیتا ہے - اور کیا عجب ہے بقول شخصے کہ قیامت کو بھی اپنی مہربانی سے
اپنے دائیں ہاتھ بٹھالے - لیکن اگر وہ بھی میرے بھائی بندوں یا میرے ہم مذہب
مسلمانوں کا سا ہوتا - تو میں کیا کرتا - اسوقت تو مولوی مہدی علی صاحب کا بھی سہارا
نہ رہتا - واہ - واہ کیا میری قسمت ہے - میرے خدا نے کیا اچھا خدا مجھکو دیا ہے -
الحمد للہ علیٰ ذالک - فقط

آپکا فرمان میری عرضی کے جواب میں جسقدر چھپا - میں نے اس کو متعدد دفعہ
پڑھا - اور مزہ اٹھایا - آئندہ جو کچھ اور چھپیگا - اس کو بھی دل لگا کر پڑھونگا - اور خوب
سمجھونگا - اور اپنی سعادت جانونگا - الا جس میں تمہارے ہاں کے مولویوں سے ناراض
ہوں - ایسا کسی سے ناراض نہیں - زندہ مولویوں اور بالتخصیص واعظوں کا تو جانی
دشمن ہوں - اور گذشتہ مولویوں سے سوائے چند کے رنجیدہ ہوں - کسی کو سوائے
چند کے لکھنے اور کتاب تصنیف کرنے اور کسی بات کے تحقیقات کرنیکا سلیقہ نہ تھا -
صرف جنگل سے بھلی اور بری - سوکھی اور گیلی لکڑیاں چننے والے تھے - خدا ان پر رحم
کرے - اور ان کی تقلید کرنے والے اندھوں کو ہدایت دے - اگرچہ تم خفا ہوگے
ہو لو - مگر میں سچ کہتا ہوں - کہ جسقدر نقصان اسلام کو تقلید سے پہنچا ہے - اتنا
کسی چیز نے نہیں پہنچایا ہے - اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے زیادہ زہر قاتل ہے -

بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود ونصاریٰ کے ارباباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے - خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچاوے - آمین - اور میرے دوستوں کو اور مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے - آمین - ثم آمین -
تم سے اس قدر باتیں کرنیکو دل چاہتا ہے - کہ اگر ہفتہ بھر برابر لکھے جاؤں - تو بھی پوری نہ ہونگی - اس لئے اِس عریضہ کو بخدمت جناب حافظ جی صاحب سلام مسنون عجز و نیاز مشحون لکھنے پر ختم کرتا ہوں - والسلام - (آپکا تابعدار غلام سید احمد)
(مقام لندن) (۲۷-مئی ۱۸۷۰ء روز جمعہ)

(۲۳)

مرشدنا مولانا -
میں نے آپکے فرمانِ عالیشان کا ایک حصہ جو ۲۹-اپریل کے اخبار میں چھپا متعدد دفعہ پڑھا - سبحان اللہ - سبحان اللہ - سبحان اللہ - واہ! واہ! واہ! کیا خوب اور کیا عمدہ ہے - جس پر میں بالکل ایمان رکھتا ہوں - اور آئندہ بقیہ مضمون پڑھنے کا نہایت مشتاق ہوں - آپ اس بات کے سننے سے خوش ہوں گے - کہ جناب راجہ جیکشن داس بہادر اور بابو شیو ایرشاد صاحبان کو بھی خطاب و تمغائے سٹار آف انڈیا مرحمت ہوا یقین ہے - کہ اس عریضہ کے پہنچنے سے پہلے آپکو معلوم ہو گیا ہوگا - جو کچھ کہ آپ کو لکھنا ہے - اب سب ملاقات پر منحصر رکھتا ہوں - اور بالتخصیص اسلئے کہ آجکل طبیعت نہایت پژمردہ و افسردہ ہے - والسلام - حافظ جی صاحب کو سلام مسنون پہنچے -
(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن) (۳-جون ۱۸۷۰ء)

(۲۴)

جناب مخدومی و مکرمی -
آپکا عنایت نامہ مورخہ ۱۶-مئی پہنچا - دل و جان کو تقویت دی - میں کچھ بیان نہیں کر سکتا - کہ اِن دنوں میں کوئی وقت رنج سے خالی نہیں ہوتا - آپ کا

عنایت نامہ کسقدر تسکین بخش ہوتا ہے۔ اگر غم غلط ہوتا ہے۔ تو صرف آپکے عنایت نامہ سے اور امید ہے۔ کہ ہندوستان میں آپکے جمالِ مبارک سے غم غلط ہوگا۔ میں نے حسب ضابطہ انڈیا آفیس میں اطلاع کر دی ہے۔ کہ میں ۲۸۔ اگست کو لنڈن سے روانہ ہونگا۔ اور تین چار روز فرانس میں رہونگا۔ ۲۔ ستمبر کے جہاز میں مارسیل سے سوار ہونگا۔ ۹۔ کو اسکندریہ پہنچونگا۔ وہاں اور مصر دونوں جگہ صرف ایک ہفتہ قیام کرونگا۔ اور ۱۶۔ ستمبر کو سویز سے پھر جہاز پر سوار ہونگا۔ اور انشاءاللہ تعالیٰ۔ دو اکتوبر کو بمبئی میں۔ اور چوتھی پانچویں کو الہ آباد پہنچکر آپ کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہونگا۔ اور یہ شعر ؎

باز آمدم کہ سجدہ ایں خاکِ پا کنم۔
گر طاعتے قضا شدہ باشد ادا کنم۔

پڑھکر آپ کے قدموں کو مثل نعلین بوسہ دونگا۔ اگرچہ آپکے قدم میرے ناپاک لبوں سے ناپاک ہو جاویں گے۔ مگر امید ہے۔ کہ آپ مرحمت سے دھو لیں گے۔ خنزیر خود ناپاک ہے۔ مگر جس پاک چیز کو وہ مس کرے۔ دھونے سے پھر پاک ہو سکتی ہے۔ افسوس میں نے غلطی کی۔ جو اپنے تئیں خنزیر سے تشبیہ دی۔ وہ تو مجھ سے بہت اعلیٰ ہے۔ خدا نے اس کو یاد کیا ہے۔ مجھے تو سوائے مہدی علی کے کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ (راست بگو چہ تو خدائی من ہستی) کافرشوم اگر باورنکنم) آپ کی تحریرات جو اخبار میں چھاپہ ہوئیں۔ ان سے میرا دل اسقدر خوش ہوا ہے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا ہو جو مقام مجھکو اسمیں کھٹکتے ہیں۔ اس سے میرا دل عجب طرز پر خوش ہوتا ہے۔ جیسے کوئی سوداگر یہ دیکھے۔ کہ ایک نہایت بیشبہا و بینظیر ہاتھی اسکی اوگی میں آپھنسے۔ اور وہ یقین کرے۔ کہ اب وہ نکلنے والا نہیں۔ جناب قبلہ و کعبہ من اجب آپ نے یہ قبول کر لیا۔ کہ اسلام اور عقل و نیچر میں مخالفت نہیں۔ تو کام پورا ہو گیا اب ہم آپ کی بہادری دیکھیں گے۔ کہ کیونکر تقلید کو تھامیں رہتے ہو۔ اور اس کو لازم ٹھہراتے ہو۔ پہلی ہی بسم اللہ آپ نے تقلید ترک کی۔ کہ ایک لفظ جدید لازم کا نکالا۔ یہ کیا سبب ہوا۔ کہ ان الفاظ فرض۔ واجب سنت مستحب میں سے کوئی لفظ کیوں نہ اختیار کیا۔

کیا کوئی نص صریح یا غیر صریح اس کیلئے نہ تھی۔ کیا کہیں حدیث میں اس کا ذکر نہ تھا۔
خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں نے آپ سے عرائض سابق میں اقرار کیا ہے۔ کہ میں کچھ
نہیں لکھنے کا۔ جب تک تم سے نہ ملوں۔ چنانچہ اس تاریخ سے کچھ نہیں لکھا۔ یہ عذر بدتر
از گناہ اس سے پہلے کا بھیجا ہوا تھا۔ ایک کام تمہاری مرضی بغیر کیا ہے۔ آج ہی اس کا
پروف آیا ہے۔ بجنسہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ بعد چھپ جانے کے کل کاپیاں
آپ کے پاس بھیجدونگا۔ چاہیں آپ تقسیم کریں۔ چاہیں جلا دیں۔ مولوی امداد العلی صاحب
نے جو کچھ آپ کو لکھا ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ دونوں کی صورت ملا لو اور پوچھو۔
کہ چاند کا سا ٹکڑا کس کا ہے۔ پھر چاند پر کا تھوکا منہ پر آتا ہے۔ مگر مجھ کو اپنی شامت
اعمال پر افسوس ہے۔ کہ مجھ روسیاہ کی محبت سے میرے دوست بھی لعنت ملامت
سنتے ہیں خدا اس کا بدلہ دنیا میں دے۔ میری کتاب کی بابت جو ممتاز علی خاں صاحب
نے سو روپیہ چندہ کے دئے ہیں۔ اس کی جسقدر مجھکو خوشی ہوئی ہے۔ بیان سے باہر
ہے یقینی ان کا حج مقبول ہوا۔ جو خدا نے ان کے دل کو مجھ پر نرم کیا۔ منشی محمد صدیق
صاحب کے چندہ سے بھی خوشی ہے۔ مگر نہ ویسی۔ اس لئے۔ کہ وہ یار شاطر اور دوست
شفیق ہیں۔ ان کے باپ کو میں اپنا مخدوم و بزرگ سمجھتا ہوں۔ مگر معلوم نہیں۔ کہ کیوں
ان کا دل مجھ سے برگشتہ ہو گیا تھا۔ امید ہے۔ کہ حالی کی ڈاک میں وہ روپیہ میرے پاس
پہنچیگا۔ مجھ پر جو سختی اس کتاب کے اخراجات کے سبب گذری۔ اس کو میرا دل جانتا ہے
اور جو سختی آگے گذرنے والی ہے۔ اس میں خدا ہی مددگار رہے۔ محمود کی نسبت جو آپ نے
اپنی محبت سے لکھا ہے۔ خدا سے امید ہے۔ کہ وہ ویسا ہی ہوگا۔ اس کے عقائد
مذہب اسلام پر نہایت پختہ و روشن ہیں۔ اس کے دل کو اسلام کے حق ہونے پر جیسا
یقین ہے۔ ویسا کسی چیز پر نہیں۔ مگر طبیعت نہایت کھلی ہوئی۔ صاف اور آزاد ہے۔
جن جھمیلوں میں آپ پھنسا رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں پھنسے رہنے کی توقع نہ رکھئے۔
خدمت جناب حافظ کریم بخش صاحب سلام مسنون مجز و نیاز پذیرا ہو۔
گو میں شفاعت کا قائل ہوں۔ یا نہ ہوں۔ مگر آپ میری شفاعت جناب حمدی

کے دربار میں فرماتے رہیں۔ والسلام

(آپ کا غلام سید احمد) (از مقام لندن)

(۱۷۔ جون ۱۸۷۰ء)

(۲۵)

جناب مخدومی و مکرمی سلامت۔

ایک وقت آپکے دو عنایت نامے مورخہ ۱۲۔ جون و ۲۴۔ جون معہ دو قطعہ ہنڈویات تعدادی تین سو روپیہ کی پہنچے۔ اگرچہ مجھکو اس خیال سے کہ دوسو روپیہ جو آپ نے اپنے پاس سے بھیجا ہے۔ بلاشبہ اس کے سبب تنگی اخراجات ہوئی ہوگی۔ رنج ہوا۔ مگر میں آپ سے اس خوشی اور تقویت کو بیان نہیں کرسکتا۔ جو اس روپیہ کے آنے سے ہوئی۔ اسوقت یہ روپیہ ایسا غنیمت ہوا ہے۔ کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ حقیقت میں جناب منشی ممتاز علی خاں صاحب کے چندہ دینے سے میرا دل بے انتہا خوش ہوا ہے۔ جو تکلیف کہ میں نے اس کتاب کی تصنیف میں اٹھائی۔ اور جو کچھ آئندہ اس کے سبب اٹھانی پڑے۔ جیسا کہ بعض دفعہ خیال ہوتا ہے۔ اس سب کا بدلہ میں نے پالیا۔ اگر اس کتاب کی تالیف میں درحقیقت میں نے کچھ ثواب کمایا ہو۔ اور ثواب عبادت بدنی کا منتقل بھی ہوتا ہو۔ تو میں نے کل ثواب بتمامہ منشی ممتاز علی خاں صاحب کو بخش دیا۔ برائے خدا تم اپنے پاس سے کچھ مت بھیجو۔ میرے ایجنٹ نے وعدہ کرلیا ہے۔ کہ تمام اخراجات جہاز وہ دیکر ہندوستان پہنچادیگا۔ پس اپنی ذات خاص پر تکلیف گوارا کرنے کی اب ضرورت نہیں رہی ہے۔ اگر ضرورت ہوتی۔ تو میں بلاشبہ تم کو لکھتا کہ اپنا گھر بیچکر بھیجدو۔ میں اپنے روپیہ میں اور تمہارے روپیہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتا میں نے ہر ایک صاحب کے نام جن کا چندہ آپ نے بھیجا۔ عریضۂ شکریہ لکھ بھیجے ہیں اور ایک ایک کتاب بھی روانہ کردی ہے۔ آپ نے جو کچھ میرے مردار مرغی کھانے کی نسبت خیال میں لکھا۔ آپ یقین جانیے کہ اس نے مجھکو عجب لطف دیا ہے۔ پہلے مجھ کو یہ

بتاؤ کہ کبھی دولت عشق مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے۔ یا نہیں۔ کیونکہ بغیر اس کے آدمی میں اور مٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب جو مزہ آپ کے الفاظ نے دیا ہے۔ اسکی مثال بیان کرتا ہوں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ کہ عاشق و معشوق میں آپسمیں خفگی ہوجاتی ہے۔ اور جوش محبت زیادہ ہوجاتا ہے۔ ایک دوسرے کو ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں سناتا ہے۔ وہ لفظ بظاہر تو ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ مگر ان سے جوش محبت اور نہایت مزہ دار الفت ٹپکتی ہے۔ زہے نصیب اس کے جو کسی سے سچی محبت رکھتا ہو۔ اور ایسے مزہ دار لفظ سنے۔ اب جو آپ نے دروازہ بند کرکے پیٹھنے کا وعدہ کیا ہے میں وعدہ ہی میں جو لطف آیا ہے۔ وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خدا بخیر و عافیت وہ دن دکھلائے جو کچھ عذر ثابت مجھ حرام خور پر درباب گردن مروڑی مرغی کے ہے۔ وہ میری گردن پر۔ مگر میں آپ کو تنبیہ دلاتا ہوں۔ کہ علماء ترکستان نے بلا کسی تامل کے اس کو جائز کیا ہے۔ تمام ترک جنگلی خاک پا ہونے کے بھی ہمکو لیاقت نہیں ہے۔ بسبب بے تامل کھاتے ہیں۔ ایک بہت بڑے دیندار عالم نے جو ترکستان سے آیا تھا۔ اور ایسا سخت دیندار ہے۔ کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹوگراف تصویر کھینچوانے سے انکار کیا۔ درباب گردن مروڑی ہوئی مرغی کے مجھ سے کہا۔ کہ ہذا قصور النصاریٰ لا باس لنا فی اکلہ فقد احل اللہ لنا طعام اہل الکتاب علاوہ اس کے جو شخص احتیاطاً اس کا مرتکب نہ ہو۔ نہایت عمدہ بات ہے۔ مگر اس کو مسئلہ شرعی ٹھہرانا اور اس کے مرتکبین کو آکل حرام قرار دینا نہایت مضر اور اسلام کے پاؤں پر بدستِ خود تیشہ زدن ہے۔ اس فقرے کے معنی آپکی سمجھ میں نہیں آئینگے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب خدمتِ عالی میں حاضر ہوکر اس کی تفسیر عرض کرونگا۔ بہ تعمیل حکمِ عالی جو عریضہ سابق بخدمت مولوی سمیع اللہ خاں صاحب میں نے لکھا تھا۔ غالباً آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا۔ آپ نے جو اپنے عنایت نامہ میں لکھا ہے۔ کہ دوسو روپیہ اور آنیکی توقع ہے۔ اگر وہ آدیں تو یہاں روانہ کرنا ضرور نہیں۔ بلکہ دوسو روپیہ جو آپ نے پیشگی بھیجے ہیں۔ اس میں مجرا ہوجاویں۔ ۲۰۔ اگست کو میرا ایجنٹ اطلاع دیگا۔ کہ کس وقت کتابیں فروخت

ہوئیں۔ ان کی قیمت بعد منہائی اخراجات روانگی کتب بہ ہندوستان میرے پاس آ جاویگی۔ مگر ظاہرا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کتابیں بارہ پندرہ سے اب تک زیادہ نہیں فروخت ہوئیں۔ امید تھی۔ کہ فرانس اور جرمنی میں یہ کتابیں فروخت ہونگی۔ اتفاقات قسمت سے انہیں دنوں میں ان دونوں ملکوں میں لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ بہت کچھ باتیں لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر اب سب ملاقات پر منحصر کرتا ہوں۔ مجھو دست بستہ آداب عرض کرتا ہے۔ وہ محمود کے ساتھ رہیگا۔ اور اس کے ساتھ پھر جاویگا۔ محمود کو اپنی پڑھائی اور اخراجات پورے کرنیکو علاوہ اس روپیہ کے جو روپیہ سرکار سے ملتا ہے تین ہزار روپیہ اور درکار ہوگا۔ سو انشاء اللہ تعالیٰ ہندوستان پہنچکر اس کے بھیجنے کی بقسطِ ماہواری یا یکمشت بفروختِ اپنے کسی مکان تجویز کرونگا۔
بعالیخدمت جناب حبل المتین من و شفیع من بدرگاہ حضرت مہدی یعنی جناب حاجی فضل حق صاحب سلام مسنون قبول ہو۔ والسلام

(خاکسار سید احمد) (۲۸ جون ۱۸۷۰ء) (مقام لندن)

(۲۶)

جناب مخدومی مکرمی سلامت۔

اب کی ڈاک میں آپکا کوئی نوازش نامہ نہیں آیا۔ مگر بقیہ فرمانِ عالی متعلق تقلید اخبار میں پڑھکر بے انتہا خوشی ہوئی۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزۂ احیاءِ اموات پر یقین کامل ہوا۔ کیونکہ لاشِ تقلید میں جسطرح آپ نے باعجاز مسیحائی جان ڈالی ہے۔ وہ معجزۂ احیاءِ اموات سے کم نہیں۔ مگر چند سوالات جو اسمیں باقی ہیں۔ اور جن کے سبب میں نہایت شُبہ میں ہوں۔ کہ اُس لاش میں جان آئی یا نہیں۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ بوقتِ حصولِ ملازمت زبانی عرض کرونگا۔ جو کہ اب میں بالکل پا برکاب بیٹھا ہوں۔ اور تردّدات بیشمار دلپر ہیں۔ اس سبب سے جو کچھ دل میں ہے۔ وہ لکھ نہیں سکتا۔ حساب چھاپہ کتاب ملفوف عریضۂ ہذا مرسلِ خدمتِ عالی ہے۔ اُس کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا

کہ کل آمدنی اس وقت تک ۱۶۱ الف ہوئی - اور خرچ ہوا ۳۹۴۸ سمیت [illegible] فاضل خرچ ہوا
۲۲۵۶ جو روپیہ قرض لیا گیا تھا - اُس میں سے زرِ فاضل ادا ہوا - الّا زادِ راہ واسطے
مراجعت ہندوستان کے باقی نہ رہا - اور اب جب تک کہ اور قرض نہ لیا جاوے - مراجعت
متعسر ہے - پس یہ ترددات ایسے جانکاہ ہیں - کہ بیان نہیں ہو سکتا - دو سو روپیہ جو
آپ کے پاس بابت چندہ جناب منشی ممتاز علی خاں و منشی محمد صدیق صاحب کے جمع
ہیں - اُن کا اور سو روپیہ چندہ مولوی زین العابدین کے آنیکا ہر دم چوں گوش روزہ دار
بر اللہ اکبر راست منتظر رہتا ہوں - خیر خدا ہر حال میں مددگار ہے - عریضۂ آئندہ میں
جو کچھ [illegible] کا حال ہوگا - عرض کرونگا - کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہوئی
پڑی ہوئی [illegible] باقی ہندوستان کے - ان کے محصول وغیرہ میں بھی دو سو روپیہ سے
کم خرچ نہیں ہونے کے - اب زیادہ حالِ ترددات کا لکھنا ناحق آپکو رنج و تردد میں
ڈالنا ہے - بخدمت جناب حافظ جی صاحب میرا سلام مسنون کہئے - اور واسطے حلِ مشکلات
کے استمدادِ دعا اُن سے چاہیئے - مگر مشکل یہ ہے - کہ آپکا محمود کہتا ہے - کہ ایسے امور سے
اور دعا سے کچھ تعلق نہیں ہے - دعا سے صرف روحانی فواید و مدارج حاصل ہوتے ہیں -
نہ دنیوی اور دعا سے زیادہ اور اکثر فائدہ اسی شخص کو ہوتا ہے - جو دعا مانگتا ہے - اور
خدا سے التجا کرتا ہے - نہ دوسرے شخص کو - مجھ سے کہنے لگا - کہ ورزش کا زور اسی
شخص میں آتا ہے جو ورزش کرتا ہے - نہ دوسرے میں - میں نے کہا - کہ تو تو سخت
بد مذہب وہابی ہو گیا ہے - میں آپکو یقین دلاتا ہوں - کہ یہ میری تعلیم اس کو نہیں ہے
یہ خود انہیں حضرت کی طبیعت کی پیداوار ہے - دیکھئے - آگے کیا کیا گل کھلاتے ہیں -
وہ کہتا ہے - کہ بالکل حقیقت اور افضلیت اور سچائی مذہبِ اسلام کی مجھپر کھل گئی ہے -
اور اب وہ نبوت اور وحی سے لیکر ادنے ادنے مسائلِ اسلام کی حقیقت بیان کرتا
ہے - آج اس نے کہا - کہ میں تو لندن میں آکر سچا اور پکا اور تصدیقِ قلبی سے مسلمان
ہوا ہوں - والسلام -

(خاکسار سید احمد) (از مقام لندن) (۸ - جولائی ۱۸۷۰ء)

ضمیمہ

اولڈ بوائے

زبان اردو میں ایک رسالہ اولڈ بائے شائع ہوا کرتا تھا۔ جسمیں طلبا ءِ علیگ یعنی علیگڈھ کالج کے قدیم طلبا ایام طالب علمی کی بعض دلچسپ و مضحک کیفیات اور ان کے مختصر حالات چھپنے کو بھیجا کرتے تھے۔ ہم اس رسالہ سے معدودے چند مضامین یہاں درج کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی مضحکات و مطائبات سرسید میں شمولیت کا پورا حق رکھتے ہیں +

علیگڈھ کالج کے کھلنڈرے

نمبر ۳ (از اولڈ بائے)

پیارے کھلنڈرو! آجکل تمہارے داستان گو کا دماغ عالم بالا پر ہے۔ وہ جامہ میں پھولا نہیں سماتا۔ ایک تو ماشا اللہ قد ویسے ہی لمبا تھا۔ مگر اب تو پانچ یا چھ انچ اور بھی اونچا ہو گیا ہے۔ پنجوں کے بل چلتا ہے۔ اچھلتا ہی۔ کودتا ہے۔ چلنے میں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا پیروں میں زبردست کمانیاں لگی ہوئی ہیں۔ جو اس کو مع اس کی تین من کی لاش کے زمین سے آسمان کیطرف پھینکتی ہیں۔ چہرے پر ہر وقت خوشی کے آثار ہیں۔ خوب ہنستا ہے۔ دانت ہر وقت ہونٹوں کے باہر پڑے رہتے ہیں۔ رہی زبان سو (وہ پہلے ہی کب قرار رہتا۔ جواب بند ہوتی۔ اب تو اور بھی قینچی کیطرح چلتی ہے۔

غرضیکہ خوب چیختا چلاتا ہے۔ اپنے سوئیں تو دماغ ہی نہیں جو چاٹتا۔ اس لئے غریب سننے والوں کا برا حال ہے۔ ہر ایک کو درد سر کی شکایت ہے۔ خدا ان پر رحم کرے۔ آخر یہ کیوں! اے کھلنڈرو! واقعی وہ معافی کے قابل ہے۔ اور جس قدر خوشی سے اچھلے کودے بجا ہے۔ پورے سال بھر کی رخصت اس کے پاس ہے۔ اور کام یہ سپرد کیا گیا ہے

کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جائے۔ کوئی صوبہ کوئی ضلع ایسا نہ بچے۔ کہ وہاں جاکر اپنے گھلنڈروں۔ اور پرانے بڈھوں سے نہ ملے۔ ان کو زور سے گلے لگائے۔ پیار کرے۔ خوب دبوچے۔ اور یہ سب کرکے ان کو "مادرِ مہربان" سے لا ملائے تاکہ سارے ملک کے ہاں جلسے ہو جائیں۔ بلکہ متفقہ کوشش سے اُن سردارانِ قوم کی مدد کریں جنکو خدا جانے ہمارے کالج کی بہتری کیلئے کھڑا کر دیا ہے۔

حضرت انشاء پردازِ ضرور کہتے ہیں۔ کہ گھلنڈرو تو سنا ہی تھا۔ یہ اُس کا بڑا بھائی پڑ بنڈڑا کہاں سے آگیا۔ ہمارے گھلنڈرو۔ سچا عشق۔ سچا جوش ایک وبائی بیماری ہے۔ جو ایک سے دوسرے کو اُڑکر لگ جاتی ہے۔ جسم میں تھوڑا مادہ موجود ہونا چاہیئے ذرا سی رُوئی ہو پھر ناممکن ہے۔ کہ یہ آگ نہ لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حکیم صاحب بھی ہم کو قابلِ معافی تصور فرماتے ہونگے۔ اور غالباً اب تو وہ بھی اس مزہ دار بیماری میں مبتلا ہو گئے ہونگے۔ ہم تو دیوانے اور مجذوب ہیں۔ مجذوب کی بڑ پر کون نکتہ چینی کرتا ہے۔ اور کوئی نکتہ چینی کرے بھی تو وہ کب سنتا ہے۔

اے گھلنڈرو! جب سے ہمارے اس ننھے مُنّے پیام بر "اولڈ بوائے" نے کاشی جی میں جنم لیا ہے۔ اسیوقت سے اُسکے مالکوں۔ اس کے اڈیٹر مسٹر عترت حسین اور اسکے خدمت گزاروں کو یہ خیال پیدا ہوا تھا۔ کہ اولڈ بوائے کیطرف سے سارے ہندوستان میں دورہ کرنے کے لئے ایجنٹ بھیجے جائیں جو ہر گوشۂ ہند سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر دور افتادہ اولڈ بوائز کو ایسوسی ایشن کا ممبر بنائیں تاکہ فرزندانِ علیگڈھ اپنی مادرِ مہربان کی اسکی شان اور ضرورت کے مطابق مالی مدد کر سکیں۔ مگر

جب کسی سے نہ کیا بارِ محبت کو پسند قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند۔

آخر یہ خدمت میرے سپرد کی گئی تھی۔ اور میں خوش تھا۔ اسکے بعد مسٹر محمد علی (ڈبل ع) نے نہایت درجہ تنگ کرنا شروع کیا۔ جو جو مشورہ ان حضرت نے دیا۔ وہ بالکل ان کے شایان تھا۔ آپ بڑودہ سے ایک سال کی فرلو بلا تنخواہ لائے ہیں۔ اور خدا کا نام لے کر "کامریڈ" کے نام سے ایک اخبار کلکتہ سے جاری کر دیا ہے۔ مجھے بھی دیوانہ وار یہی مشورہ

دیا۔ کہ میں بھی ایک سال کی رخصت لے لوں۔ اور "رائل کالج آف سائنس" کے لئے سارے ہندوستان میں دورہ کر دوں۔ بیوی بچوں کو زہر دیدوں۔ اور بنارس کے مکان میں آگ لگا دوں۔ وہ تو دم کٹی لومڑی تھے ہی۔ میں بھی ان کے مشورہ سے اپنی خوبصورت دم کاٹ کر انکا ہمشکل ہو جاؤں۔ عقل تو یہی کہتی تھی۔ کہ ہرگز مت سُن۔ مگر دل بار بار لالچ دلاتا تھا۔ کہ ضرور ایسا ہی کر۔ بہت لطف اٹھائیے گا۔

جب بمبئی کے کریکٹ ٹور سے ہم سب سرخرو اور اپنے کالج کی ناموری کا باعث ہو کر یکم جنوری کو الہ آباد واپس آئے۔ تو وہاں اسوقت ایک قومی برات جمع تھی جسکے خوبصورت دولھا۔ ہز ہائنس آغا خان تھے۔ قبلہ و کعبہ نواب وقار الملک بہادر۔ بھی وہاں موجود تھے۔ ان سب بڑوں کا یہ حکم ہوا۔ کہ رخصت لیکر اس کام میں مدد کروں۔ میرے چھوٹے اور بڑے والے عزیز دوست اور اول روز سے ساتھ کام کرنیوالے لڑکے تھے۔ کہ میں ایسا ضرور کروں۔ علیگڈھ کے احباب بھی مصر تھے۔ کہ میں ایک سال اس کام کیلئے دے دیں۔ اے کملنڈرو۔ میں تو اول سے ہی راضی تھا۔ مگر یہ اصرار اور یہ زبردستی مزہ دیتی تھی۔

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں میری جان جائیے ۔۔ اللہ تیری شان کے قربان جائیے

ان سب کے اصرار سے اور سب سے زیادہ "اندر والے" کے اصرار سے آنکھیں بند کر کے ایک سال کی رخصت کی درخواست بذریعہ تار دیدی۔ اور تعجب تو یہ ہے۔ کہ وہ درخواست ۲۴ گھنٹے کے اندر منظور بھی ہوگئی۔ میری خوش قسمتی واقعی قابل فخر ہے۔ اُس وقت سے کام بھی شروع کر دیا۔ اور اب سارے ہندوستان میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ سنو اور جلو۔

میری زندگی کیسی مزہ دار ہے۔ اُتر سے دکھن اور پورب سے پچھم تک ہر جگہ جاؤنگا۔ اور اپنے پرانے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے برسوں کے بعد ملونگا۔ ہندوستان کے سب سے جنوبی گوشہ راس کماری پر پیارے اسلم کیساتھ اس جگہ جہاں دو بڑے سمندر ملتے ہیں۔ کھڑا ہو کر علیگڈھ کے تذکرے کرونگا۔ اور اُن بڑے سمندروں کی لہروں سے مخاطب ہو کر فخریہ اپنے علی گڈھ کی تعریفیں کرونگا۔ اور کہونگا۔

سے ہیرو! تم کیا ہو۔ اور کیا ہے تمہاری طاقت۔ ہمارے علیگڈھ نے علمی سمندر کا ہیرو پیدا کیا جو تم سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔ تم کو پانی پر زور ہے۔ ہم کو پانی ہوا اور خاک سب پر طاقت ہے۔ ایک نہ ایک دن ہمارے کالج کے کھلنڈرے سمندر، ہوا، زمین پر ایسے کارنمایاں کریں گے۔ کہ دنیا دنگ رہ جائیگی۔ ذرا ٹھہرو، ہم تو ابھی سوتے سے اٹھے ہیں۔ مولانا نیولی نیند کا خمار اب تک آنکھوں میں ہے۔ خدا بھلا کرے چند محبان قوم کا جنہوں نے ہم کو جگایا ہے۔ انشا اللہ چند بیداری کے سالوں میں اس بات کا ثبوت دے دینگے۔ کہ دنیا کی اعلیٰ قوموں میں ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔ اے سمندر کی ہیرو! جاؤ، اور ہمارا یہ پیام ساری دنیا کو سناؤ۔ اور خاصکر ہمارے اُن بھائیوں کو جو ہم سے دور سات سمندر پار اپنی اور اپنے وطن کی ناموری کیلئے آکسفورڈ، کیمبرج، لنڈن، ایڈنبرا، اور جرمنی میں پڑے ہوئے علم حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان دونوں بھائیوں عبد الستار اور عبد الجبار الخیری کو بھی یہ پیام سنا دینا جو بیروت میں پڑے ہوئے اپنی قوم کیلئے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

غرض اسلم سے رخصت ہوکر مدراس جاؤنگا۔ اور وہاں اپنے بھائی مسٹر یعقوب سیٹھ عبد الحمید (سوبجر) اور میر حسن علی وغیرہ سے ملونگا۔ بنگلور میں جعفر کلامی اور آصف جیکری کے کان پکڑلونگا۔ یہ دونوں چھوٹے چھوٹے کالج میں پڑھتے تھے۔ کونوا میں شجاع الملک دہلق ایسے برسوں کے بعد ملونگا۔ سلی ہٹم میں ان کے بڑے بھائی نواب رفیع الملک سے ملاقات ہوگی۔ بلاری میں عبد الکریم (چھنڈول) اور ان کے بھائیوں سے ملونگا۔ سیدنر کے اب جوان ہوگئے ہونگے۔ مگر میرے زمانہ میں یہ گول مٹول چھوٹے چھوٹے تھے مگر بڑے لڑنے والے۔ بمبئی میں پروفیسر عباس سے مل کر "کلام پاک" کی وہ آیتیں سنونگا۔ جن کا تعلق کھانے سے ہے۔ سید محمد (ڈاکٹر) سے تو ابھی ملاقات ہوئی ہے۔ مگر اب پھر ملونگا۔ اور "نغینک یو" والا قصہ یاد دلاؤنگا۔ سورت میں مسٹر افضل زماں (گریم) سے مل کر یونیورسٹی کے لئے بہت سے روپئے لونگا۔ سچین میں صاحبزادہ احمد خاں صاحب سے ملاقات ہوگی۔ جونا گڈہ میں برسوں کے بعد مسٹر محمد امین فقیہ سے پرانے تذکرے ہونگے۔ اور خاندیس میں اپنے ہلس کو مدق کرنیوالے عزیز

کمال الدین سے اٹھارہ برس بعد ملکر خدا معلوم کیا کیا باتیں کرونگا۔ کراچی اور سندھ میں مسٹر علی اکبر حسن علی (بندر) آنریبل مسٹر غلام محمد بھرگری اور بہت سے بھائیوں سے ملکر دل خوش کرونگا۔ مشرقی بنگال میں اپنے عزیز دوست اور ابتدا سے ساتھ کام کرنیوالے مسٹر محمد محمود (بھوق) سے میمن سنگھ میں جاکر ملونگا۔ اور کام لونگا۔ مسٹر الطاف علی سے بارہ سال میں ملاقات ہوگی۔ مسٹر محمد چودھری سے سلہٹ میں ملونگا۔ ڈھاکہ میں مسٹر کبیر الدین اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس۔ مسٹر رحیم الدین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ مسٹر شہاب الدین مسٹر سلامت اللہ۔ مسٹر سکندر محمد سلام وغیرہ سے باتیں ہونگی۔ شائستہ آباد جا کر عزیزی احمد علی سے جسکو علی گڈھ کی یاد اب تک ستاتی ہے۔ اور جسکا پیارا اور محبت بھرا خط ٹوٹی پھوٹی اردو میں "اولڈ بوائے" میں شائع ہو چکا ہے۔ ملاقات کرونگا۔ اس کے والد ماجد سے تو اتفاقاً مل چکا ہوں۔ پنجاب میں سب جگہ جاؤنگا۔ اور خدا معلوم کس کس سے ملونگا۔ وہاں تو ایک فوج ہے جو علیگڈھ کے نام کی شیدا ہے۔

کلکتہ میں بیٹھا ہوا تو یہ لکھ ہی رہا ہوں۔ خدا ۱۰۹ رپن اسٹریٹ اور اس کے رہنے والونکو سلامت رکھے۔ علی گڈھ کی چوپال ہے۔ کیسے کیسے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر ظریف کو جو باوجود فلسفہ اور منطق کے پروفیسر ہونے کے قطعی اسم بامسمیٰ ہیں۔ مکان کے کواڑ کھول کر کھینچ لیا۔ اور اب تو خوب دل کھولکر باتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو اول دن سے کتاب کے کیڑے تھے۔ اب جو کام سپرد ہوا ہے۔ وہ بھی امپیریل ریکارڈ آفس میں دماغ میں ایسے ایسے مسالے جمع کرتے۔ کہ واہ وا۔ "اگر" کا مرید" جونک کیطرح ایسا پیچھے پڑا ہے۔ کہ ادھر جمع کیا۔ اُدھر اُس نے قومی دعوت کیلیئے لکھوا لیا۔ مسٹر محمد حسین سے ملاقات ہوئی۔ جو سر سید کے ہاتھ سے مار کھائے ہوئے ہیں۔ مجھے اُن پر رشک آتا ہے۔ کاش! یہ فخر مجھے بھی حاصل ہوتا۔ تو ہندوستان میں تو کبھی۔ "اولڈ بوائے" کو زندہ نہ چھوڑتا۔ پرانے قصے بہت سے سنے۔ اور دل خوش ہوا۔ اب وہ اپنے "اولڈ بوائے" کے لئے سلسلہ مضامین لکھتے ہیں۔ انعام الحق سے ملاقات ہوئی وہ بھی "اولڈ بوائے" کے ذریعہ سے سب دوستوں کو عنقریب "پیام محبت" بھیجیں گے۔

مسٹر مسعود حسین انسپکٹر پولیس غریب تو زبردستی بلگچیا کے تھانہ سے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر شام کو آموجود ہوتا ہے - اور نواب علی کو بھی جانوروں کے شفاخانے سے کھینچ لاتا ہے - خدا کا شکر ہے - کہ نواب علی کی کریکٹ برابر جاری ہے - اور انشا اللہ ستمبر میں وہ بمبئی میں بہت کامیاب ہونگے - نواب محی الدین مرزا اور معین الدین مرزا کے ساتھ بہت پرلطف وقت گذرا - اور دونوں میں علیگڈھ کی محبت دیکھکر دل خوش ہوا - باقر حسین (پوائنٹ آف آرڈر اور رشکِ نپولین) سے تو دن میں دس مرتبہ ملاقات ہوتی ہے - اور ہم سب اس کو پچھتر فیصدی والا شعر سنا دیتے ہیں - کوٹھی ۱۰۹ میں تین کھلنڈرے موجود ہیں - "کامریڈ" تو سرتا پا کھلنڈرا ہے - اسکا ایڈ والا اڈیٹر کھلنڈرا" اور اوّل درجہ کا کھلنڈرا ہے - اسکا اسسٹنٹ اڈیٹر مسٹر عبدالرحمن سندھی اس سے بھی بڑھکر کھلنڈرا ہے - اور اس کا منیجر مسٹر غلام مولیٰ تو مجسم کھلنڈرا ہے - اگر میرا بس چلے اور کوئی کام نہ ہو - تو میں ہمیشہ مولیٰ کو جیب میں لیئے پھرا کروں - جب دل گھبرایا جیب سے نکال کر باہر رکھدیا - اور پھر وہ مزیدار باتیں سنیں - کہ جی خوش ہوگیا - اے کھلنڈرو! ہمارا فرض ہے - کہ علی گڈھ کی اس سرائے، چوبل یا اڈے کی پوری خدمت کریں - تاکہ وہ مستحکم ہو جائے - اور کلکتہ میں عزت اور آبرو کے ساتھ (یہ مجمع) قیام کرے - اور قومی کام خوش اسلوبی سے ادا کرتا رہے -

اب میں ملک کے ایک اور گوشہ کی تاک میں ہوں - ممالک متوسط اور ہندِ وسطی (سنٹرل انڈیا) میں تو مصباح، ولایت اللہ، اکرمین (یعنی دونوں اکرم) منظور احمد، صغیر علی، اختر زماں - نواب زماں سے ملاقاتیں ہونگی - حیدرآباد میں تو دوستوں کی کان ہے - کم از کم تین سو "اولڈ بوائے" وہاں ہونگے - ان سب کا پتہ عظمت اللہ، قادر بیگ، جمیل احمد، عبدالحق، نذیر بیگ وغیرہ کے ذریعہ سے لگا لونگا - کیا لطف ہوگا -

بہار، اودھ، صوبہ متحدہ تو میرا دیکھا بھالا ہے - اب پھر ملاقاتیں ہو جائیں گی -

غرض ہندوستان کا کوئی کونہ مجھ جہانیاں جہاں گشت سے نہ بچے گا۔ اچھا سچ کہو۔ ایسی حالت میں ایسی خوشی بجا ہے یا بیجا۔ اگر میں جامہ میں پھولا نہ سماؤں تو کیا تعجب ہے۔ ایسا موقع عمر بھر میں مشکل سے ملتا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے جلد مل گیا۔

اسے کھلنڈرو! میں یہاں تک یہ مضمون کلکتہ میں لکھ چکا تھا۔ اور اپنے ذہن میں اسے ختم بھی کر چکا تھا۔ مگر آج ایک مہینے بعد تک مجبوراً تمام نہ کر سکا۔ غالباً خدا کو میری اسقدر خوشی بری معلوم ہوئی۔ یا خداوند کریم کو میری آزمایش کرنا منظور ہوگی۔ یا واقعی دل دکھانیوالی تکلیف میرے لئے ضروری تھی۔ غرض جو کچھ اسباب ہوں میری بہتری کے لئے ہونگے۔ مجھپر ایک صدمہ ایسا پڑا۔ جس کی وجہ سے معمولی فرائض منصبی کے علاوہ جو آجکل بہت زیادہ ہیں۔ اور کوئی کام نہ کر سکا اپنے کھلنڈرے کو معاف کرنا۔ اب اڈیٹر صاحب کے حکم تعمیل کرتا ہوں۔

گذشتہ مضمون میں میں کچی بارک کا حال لکھ چکا ہوں۔ کہ وہ اس زمانہ میں چمن ہو رہی تھی۔ پکی بارک بھی ہمارے لئے کچھ کم دلچسپ نہ تھی۔ اپنے گرو اور سردار مسٹر عباس حسین کے کمرے کا حال تو اول مضمون میں لکھ چکا ہوں۔

ان کے علاوہ میرا دوست سید ظہور حسین ۴ نمبر کے کمرے میں رہتا ہے اور اسمیں وقت کا بڑا حصہ گذرتا تھا۔ اس کے قریب ہی سلطان حسین مرحوم، زین العابدین مرحوم، اور نواب غلام محمد حسین خاں دہلوی رہتے تھے۔ سرسید کے نواسے سید احمد علی، اور ان کے بڑے بھائی سید حامد علی کا جواب گوالیار میں جج ہیں۔ ان کے قریب ہی کمرہ تھا۔ بڑے کمرے نمبر ۱۲ میں جو اب کالج کرکٹ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اور کپتانوں کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔ مسٹر آفتاب احمد خاں رہتے تھے۔ اور ان کے ہمراہ ان کے بہنوئی مسٹر احمد حسین خان تھے۔

آفتاب احمد خاں کالج میں نہایت خاموش زندگی بسر کرتے تھے۔ کیونکہ اُن دنوں بھی انکا شمار باوجود ایف۔اے میں ہونے کے بڑے طلبا میں ہوتا تھا۔

کمرہ نمبر ۴ تو ہم شیطانوں کا اکھاڑہ تھا۔ اس لئے ہمارا شور وغل اور گانے کا اثر ان پر کیا ہوتا تھا۔ گو ایک دروازہ بیچ میں تھا۔ مگر بظاہر کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ جس سے اُن کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا۔ مسٹر آفتاب احمد خاں کی وضع قطع کالج کے اور طالب علموں سے کسی قدر مختلف تھی۔ سب سے پہلے میں نے انہیں رامپور میں اسوقت دیکھا تھا جب وہ فٹ بال کی ٹیم کے کپتان ہو کر بے نظیر میلے کے موقعہ پر وہاں گئے تھے۔ میں اسوقت بریلی میں انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اور کچھ دنوں کیلئے وطن آیا تھا۔ میرے بڑے بھائی مسٹر ذوالفقار علی کالج میں تھے۔ اور ٹیم کے ہمراہ آئے تھے۔ اسی موقعہ پر میں نے مسٹر بیک اور مسٹر ماریسن کو بھی پہلے پہل دیکھا تھا۔ اور یہ منظر عمر بھر نہ بھولونگا ایک ڈیرے میں یہ سب ٹیم ٹھہری ہوئی تھی۔ جسوقت میں اس ڈیرے میں بعد مغرب اپنے بھائی کے ہمراہ گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ کھری چارپائیوں پر لڑکوں کے غول میں دو انگریز بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جو انگریزی لباس کے علاوہ سروں پر ترکی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہ منظر اس زمانہ میں عجیب تھا۔ اور بہت سی جگہ اب بھی ہوگا۔ پوری بے تکلفی سے۔ (مگر ادب کرتے ہوئے) ان میں باتیں ہونے لگیں۔ اور ہنسی مذاق بھی ہوتا جاتا تھا۔ یہ دونوں مسٹر بیک اور سر تھیوڈور ماریسن تھے۔ بعد میں تو میں نے اس طرح انہیں سینکڑوں مرتبہ دیکھا ہوگا۔ مگر وہ پہلا سماں ہمیشہ یاد رہیگا۔

مسٹر آفتاب احمد خاں کالج میں گرمی جاڑے ہمیشہ چوڑی دار پائجامہ پہنتے تھے۔ کالج جاتے وقت تو اچکن ہوتی تھی۔ مگر شام کو فٹ بال کھیلتے وقت یا باہر جاتے وقت اُس آڑے پائجامہ پر ایک کالی اور پیلی دھاری کا بلیزر پہن لیتے تھے۔ جو ذرا بے تکا معلوم ہوتا تھا۔ کالج میں صرف ان کے پاس ہی نئی قسم کی بائیسکل تھی۔ اور اُس کے لئے وہ کوٹ ضرور مفید ثابت ہوگا۔

مسٹر عنایت اللہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ابتدا سے مسٹر آفتاب احمد خاں نے پتلون یا پتلون نما پاجامہ جو کالج میں عام تھا۔ پہننے کی قسم کھائی تھی۔ اور جب تک کالج میں رہے۔ اُسے نباہا بھی۔ مگر ولایت جا کر مجبوراً وضع بدلنی پڑی۔

۳۱۔ نمبر کے کمرے اور کھانے کے کمرے کے درمیان میرے عزیز دوست مسٹر اسلام احمد خاں (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آگرہ) کا کمرہ تھا۔ اور یہ کمرہ اس زمانے میں کالج میں سب سے زیادہ اچھا سجا ہوا تھا۔ مگر اسلام احمد خاں کا سارا وقت ہمارے ساتھ عباس حسین کے کمرے میں گزرتا تھا۔ چند کمرے چھوڑ کر ۳۳ نمبر کے کمرے میں مسٹر مصطفےٰ خاں مرحوم رہتے تھے۔ اُسی سال انٹرنس پاس ہوئے تھے۔ مگر انگریزی کی قابلیت میں اور خاصکر لکھنے اور بولنے میں وہ کالج کے تمام طلبا سے لایق تر تھے۔ مرحوم سے جسقدر آخر زمانہ میں دوستی اور محبت ہوگئی تھی۔ اسی قدر ابتدا میں لڑائی رہتی تھی ہم تو شاید کچھ اب "صاحب" ہوں۔ مگر وہ اسی زمانہ سے بڑے "صاحب" تھے۔ جبکہ ہم سب پکے وحشی اور جنگلی تھے۔ خانصاحب مرحوم گرمیوں میں بھی برابر کمرے کے اندر سوتے تھے۔ اور پنکھا قلی دن رات پنکھا کھینچا کرتے تھے۔ ہماری اُن کی لڑائی رات کو کھیلنے اور غل کرنے پر ہوتی تھی۔ ہم سب کھانے کے بعد کبھی کبھی اپنے گروہ کے کمرے کے باہر جمع ہوتے تھے۔ اور اُس شب کو پاس والوں کا پڑھنا تو پڑھنا نیند بھی حرام ہو جاتی تھی کیونکہ وہ بھی ہمارے کھیل میں شریک ہو جاتے تھے۔ کبھی تو کشتی۔ ڈنڈ مگدر اور اور ورزشوں کی نمائش ہوتی تھی۔ اور کسی دن کبڈی کی باری آتی تھی۔ خانصاحب باوجود کمرہ میں بند ہونے کے شور کی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور دس بجے سے آدمی بھیجنا شروع کر دیتے تھے۔ پیام یہ "بہتر ہو۔ کہ آپ لوگ آرام فرماویں۔ مگر اد ھر آدمی کا آنا تھا۔ کہ غل دونا ہو گیا۔ آخر کو تنگ آ کر آدمی کا بھیجنا بند کر دیا۔ اور اس کے بعد غل میں بھی کمی ہونے لگی۔

بڑے دروازے کے قریب مولوی سلیمان صاحب کا کمرہ تھا۔ اور ان کے ساتھ ان کے بھتیجے، بھائی بدرو (مسٹر بدرالحسن) اور مسٹر علاء الحسن رہتے تھے۔ بھائی بدرو سے تو

بعد میں ہر ایج میں ساتھ رہنے کیوجہ سے بہت محبت ہو گئی۔ مگر علاؤل ! ہم کھلنڈروں میں اوّل درجہ کا کھلنڈرا تھا۔ اگر کریکٹ اور فٹ بال نصیب نہ تھی۔ تو گلی ڈنڈا ہر وقت موجود تھا۔ میں نے کالج میں بہت سے کپڑے پھاڑنے والے دیکھے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ علاؤل کی برابر کرتے کوئی نہیں پھاڑ سکتا تھا۔ نیا کرتہ ہو یا پرانا۔ اُجلا ہو یا میلا۔ مگر ہر کرتے کا شانے پر سے پھٹا ہونا ضروری تھا۔ خدا معلوم کیا وجہ تھی۔

پکّی بارک تو ختم ہوئی۔ مگر ہمارا ایک اڈا اور تھا۔ جہاں میں پہلے ہی دن اپنے بھائی کیساتھ گیا تھا۔ یہ تار والا بنگلہ تھا۔ جس میں اب قبلہ وکعبہ نواب صاحب رہتے ہیں۔ اُس زمانہ میں اس میں سرسیّد کے یار اور دمساز مولوی زین العابدین خاں صاحب رہتے تھے۔ سرے والے کمرے میں میرا عزیز دوست مسٹر سید زین الدین مع اپنے غ رغ ض ض ظ ظ بھائی بہنوں اور بھانجوں کے رہتا تھا۔ اور جب کبھی ہم کالج میں بھوکے رہجاتے تھے۔ تو اس جگہ ضرور کھانا کو مل جاتا تھا۔

اے کھلنڈرو! تم کو زین الدین تو ضرور یاد ہوگا۔ اس کی خوبصورت اور پیاری صورت تم سب کے سامنے ہوگی۔ مگر مجھے کامل یقین ہے کہ اگر تم اب اُس کو اتفاقاً کہیں دیکھ لو۔ تو ہرگز نہ پہچانو۔ گھر میں بہت سی موتوں کی وجہ سے وہ تو بالکل شکستہ دل ہو گیا تھا۔ جوگیوں کی سی صورت بنالی تھی۔ ہاتھ بھر کی لمبی ڈاڑھی تھی۔ جسمیں ابابیل گھونسلہ بنا سکتی تھی۔ کپڑے میلے ہیں تو کچھ فکر نہیں۔ جوتا پھٹا ہے۔ تو بے پرواہ۔ غرض ہر بات میں دنیا سے بیزار نظر آتا تھا۔ جب اول مرتبہ میں بنارس سے غازی پور میں جاکر اُس سے ملا۔ تو اس مردہ دل کو دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا۔ خوبصورت۔ بانکا۔ ترچھا۔ زین الدین۔ کھیلو نکا دھنی۔ تماشا کرنے میں مشاق نقل اور شرارت میں سب سے اوّل۔ اور ایسا مردہ دل۔ مگر میں ہمت نہ ہارا۔ دو تین گھنٹہ تک برابر علیگڑھ کے پرانے مضمون اور لطیفوں کی بھرمار کرتا رہا۔ برسوں کی کثافت اُوپر سے کھرچی کالج کی زندہ دلی کے کھولتے ہوئے پانی میں غسل دیا۔ اور بفضلہ تعالیٰ چند گھنٹوں کے بعد وہی پرانا ہنسنے اور ہنسانے والا زین الدین دکھائی

دینے لگا۔ اور رات گئی تک پرانے اور نئے تذکرے ہوتے رہے۔ کھلنڈروں کی داستان کچھ ایسی ویسی ہے کیسا ہی مردہ دل کیوں نہ ہو۔ انشاء اللہ سنتے ہی پھر کمربستہ ہو کر کالج اور قوم کی خدمت کرنے کیلئے کھڑا ہو جائیگا۔

نازک کلا میاں مری توڑیو عدو کا دل۔
میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑدوں

سنا ہے۔ کہ قبلہ و کعبہ حالی کے کلام کی نسبت بعض حضرات نے شکایت کی۔ کہ انہیں رونے رلانے پیٹنے چلانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ اور پر لطف کلام لکھنا چاہیئے تھا۔ دل خوش ہوتا۔ غالباً یہ خبر قبلہ و کعبہ کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہوگی۔ خیر! پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ حکیم محمود خانصاحب مرحوم کے لاجواب مرثیہ کے دو آخری بند نکتہ چینیوں کی زبان بندی کیلئے کافی ہیں۔

سنتے ہیں حالی! سخن میں تھی بہت وسعت کبھی ٭ تھیں سخنور کیلئے چاروں طرف راہیں کھلی ٭
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی ٭ اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی ٭
گاہ غزلیں لکھ کے دل یار و نکے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت در صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو عوال النغمہ اس محفل میں کم ٭ رہنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم ٭
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم ٭ کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم ٭
سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا۔
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا۔

حالی کی یہ معذرت اپنے استاد حضرت غالب کی مشہور معذرت سے کم رتبہ کی نہیں ہے۔

اے کھلنڈرو! میری یہ خرافات پڑھکر بہت سے سنجیدہ اصحاب کہتے ہونگے۔ کہ اس میں بجز کھیلنے۔ لڑنے اور غل کرنے کے کچھ اور بھی ذکر ہے۔

حضرت معترض! آپ خفا نہ ہوں۔ تو میں صاف عرض کردوں۔ کہ یہ سلسلہ خرافات

میں آپ کے خوش یا ناراض کرنے کیلئے نہیں لکھتا ہوں۔ آپ خوش ہوں۔ یا ناراض
خدا آپکا بھلا کرے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے لکھتا ہوں۔
اور اس لئے کہ شاید اور کسی علیگڈھ کے محبت بھرے دل کو یہ خرافات شاداب کر
دے۔ اور اس میں بھی اپنے پیارے کالج کی خدمت کرنیکی امنگیں پیدا ہو جائیں۔
ہم تو علیگڈھ کے اندھے ہیں۔ علیگڈھ ہی علیگڈھ ہم کو نظر آتا ہے۔ گانے کا شوق
ہے۔ مگر صرف ایک راگ آتا ہے۔

فغاں ہیں آہ میں فریاد میں شیون ہیں نالے ہیں
سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں۔

شوکت علی (اپالن بور گجرات)

ڈھینڈس

زمانہ سے زیادہ فراموش کار شاید ہی کوئی ہوتا ہو۔ اپنے وقت میں خواہ کتنا ہی نام آور کیوں نہ ہو۔ مگر جہاں اسکا وقت پورا ہوا۔ اور وہ گمنامی کے تودۂ خاک میں دفن ہو جاتا ہے۔ اس فراموش کاری کا علاج ہے۔ تو مؤرخ کے ہاتھ میں ہے۔ کہ وہ نامِ رفتگاں کو گمنامی سے بچا لیتا ہے۔ اور ماضی فراموش معیت زدگان دہر کو "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" میں ایک ساعت کی ساعت محو کرکے زمانہ گذشتہ میں پہنچا دیتا ہے۔

ہمارا کالج دنیا کا ایک چھوٹا نمونہ ہے۔ اس کے بھی قرب و دور زمانے ہیں۔ یہ بھی دنیائے دوں کے سے انداز کرنے لگتا ہے۔ یہاں بھی مشاہیر، گمنام اور انہیا رفتگاں ہوتے ہیں۔ مشاہیر وہ جن کی شہرت کالج کی دنیا سے نکلکر بڑی دنیا تک ان کے ساتھ جاتی ہے۔ اور ان کا پرلیبر ساتھ دئے جاتی ہے۔ کالج میں ان کی یاد ماضی کی دنیا حال کو۔ اور حال کی دنیا مستقبل کو دست بدست دیتی چلی جاتی ہے۔

بعض مشاہیر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگرچہ اُن کی شہرت لمعۂ برق کی طرح خیرہ کُن ہوتی ہے۔ لیکن دیرپا نہیں ہوتی۔ زمانۂ کالج ہی میں اُن کی شہرت کا ستارہ نصف النہار پر پہنچ کر زوال پانے لگتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ہمیشہ کیلئے غروب ہو جاتا ہے۔ گمنام اُن اصحاب کا فرقہ ہے۔ جو کالج میں آئے۔ رہے۔ اور چلے گئے۔ اور کالج ڈائرکٹری کو بھی اب تک معلوم نہیں۔ کہ وہ کون تھے۔ کہاں گئے۔ اور اب کہاں ہیں۔ از یادِ رفتگاں وہ گمنام گروہ ہے۔ جو زمانۂ کالج میں دوسری قسم کے مشاہیر میں سے تھا۔ اس کے ممبر جب تک کالج میں رہے۔ خوش حال رہے۔ اچھا کھاتے رہے۔ اچھا پہنتے رہے۔ خود خوش رہے۔ دوسروں کو خوش رکھتے رہے۔ اور

اب تو آرام سے گذرتی ہے۔

عاقبت کی خبر خدا جانے۔ ۔

کی مالا جپتے رہے۔ لیکن اب آسیائے گردوں نے انہیں ایسا پیسا۔ کہ اب پہچانے بھی نہیں جاتے۔ اب نہ وہ خوشحالی رہی۔ اور نہ وہ خوش لباسی۔ نہ وہ خوش مزاجی ہی باقی ہے۔ اور نہ وہ خوش گپیاں۔ غرض کہ نہ وہ ہم ہیں۔ نہ وہ تن آسانیاں۔ کیسی حالت ہیں ایک مایوسانہ۔ ناکام زندگی کے دن تیر کر رہے ہیں۔ اور دنیا میں زیادہ کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو زیادہ تر گمنامی میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔

؁۱۸۹۸ء تک کا زمانہ کالج کی تاریخ میں عیاشی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ عیاشی کالج کی خاص اصطلاح ہے۔ کالج میں اشرف جیسے وقت کش لوگ تھے۔ جو ننگے سر۔ لوسی فیشن بالوں کا جھنڈا ماتھے پر گرائے ہوئے ایک بارگ سے دوسری بارگ میں چکر لگاتے پھرتے تھے۔ مگر سورما ایسے تھے۔ کہ ایک دفعہ نینی تال میچ میں اسکورر ہو کر گئے۔ کپتان سے کسی بات پر خفگی ہو گئی۔ واپسی ٹکٹ روپیہ پیسہ سب کپتان کے پاس تھا۔ لیکن اشرف صاحب کی خفگی نینی تال سے جو پیدل چلے۔ تو کاٹ گودام

سنہ ... میں سرسید کا انتقال ہوا۔ اور کالج میں نیا دور شروع ہوا۔

آ کر دم لیا۔ وہاں خدا جانے اسٹیشن ماسٹر کو کیا پٹی پڑھائی۔ کہ اس نے اپنے حساب میں سے علیگڈھ تک کا ٹکٹ دیدیا۔ دوسرے دن میاں اشرف صاحب خواجہ محمود حسین صاحب کے کمرے میں ڈھونڈتا رہے ہیں۔ اور نینی تال میں اُن کی تلاش ہو رہی ہے اب وہی بے فکرے اشرف الحق صاحب ہیں۔ کہ کالج کو چھوڑ کر گیارہ برس تک انگلستان میں آوارہ گردی کرتے رہے۔ اور دنیا کی اُونچ نیچ دیکھ بھال ڈاکٹر اشرف الحق بی۔ سی ایچ بنکر حیدر آباد دکن میں کپتان بہادر ہیں۔ کالج میں تو اب بھی بہت سے لوگ انہیں بھولے ہوئے ہونگے۔ مگر اب وہ بڑے آدمی بننے والے ہیں۔ اب اُن کے لیئے ایڈریس طیار ہو جائینگے۔ اور اُن کے بیٹا ہوا۔ تو مبارک باد کے تار اُن کے نام بھیجے جائیں گے۔

اُس زمانے میں ایک عبد الحمید جیسے طالب علم ہوتے تھے۔ جو امتحان پاس کرنے کی نسبت جنٹلمین بننے کو ضروری سمجھتے تھے جس دن میں پہلی پہل علیگڈھ آیا تو یہ حضرت مجھے اسٹیشن پر ملے۔ آپکا قد مشکل سے تین فیٹ چار انچ ہوگا۔ مگر آپ کا قطر بلا مبالغہ شکسپیر کے جان فالسٹاف کے پیٹ کی گولائی سے کچھ بڑھا ہوا ہی ہوگا شکل صورت پیاری۔ آنکھیں مسمریزم کے مطلب کی۔ بال اسقدر بل کھائے ہوئے کہ روضۃ الکبریٰ کے مشہور جرنیل سنیٹس کے بھی کیا ہونگے۔ سوٹ۔ بوٹ۔ کالر ٹائی۔ ہر ایک فیشن سے کچھ آگے ہی نکلی ہوئی۔ میں اس شخص کے رعب میں آگیا۔ آپ نے مجھ سے نہایت مربیانہ اور بزرگانہ طریقہ سے دریافت کیا۔ کیا آپ کالج میں داخل ہونے کے لیئے آئے ہیں؟ اتنا کہہ کر سیٹی بجاتے، سگار کا دھواں اڑاتے ٹوپی کا پھندنا ہلاتے ہوئے یہ جا وہ جا۔ میں متحیر و بکبتا رہ گیا۔ اور ایک نووارد کی نادانی کے طریق پر عبد الحمید کو ایم۔ اے کلاس کا کوئی بہت بڑا سربرآوردہ طالب علم اور شاید کریکٹ کا کپتان سمجھا۔ مگر بعد کو کالج میں تھوڑے دن رہ کر خشہ جناب کی حقیقت معلوم ہوئی۔ کہ آپ اسکول کی کسی نیچی کلاس میں پڑھتے ہیں۔ اور ڈھینڈس کے نام نامی سے مشہور خاص و عام ہیں۔

یہ خطاب کب ملا۔ کس نے دیا۔ اور اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ اِس کا پتہ چلنا تو بہت مشکل ہے۔ مگر ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِن حضرت کے جسم کی گولائی پر کسی نے بیساختہ ان کو "ڈھینڈس" کا خطاب دیدیا ہوگا۔ جو اس دن سے مقبول خلائق ہو گیا۔ لیکن صرف جسم ہی ایسی چیز نہ تھا۔ جو انکو خطاب کا مستحق بناتا۔ بلکہ اصل چیز آپکے حرکات تھے۔ آپکو جنٹلمین بننے کا بہت شوق تھا۔ لیکن جنٹلمین سے آپ کی مراد انگریزی خوش پوشی تھی۔ جسے انگریزی میں ڈینڈی کہتے ہیں۔ اُس زمانے کے فیشن کے مطابق آپ جس قسم کا لباس پہنتے تھے اچھے سے اچھا ہوتا تھا۔ کبھی ریشمی اچکن آڑا پائجامہ اور کامدار ٹوپی ہے۔ تو کبھی ایک معقول ٹرکش کوٹ، پتلون اور ترکی ٹوپی۔ کبھی از سرتاپا بالکل انگریزی لباس ہوتا تھا۔ سنا ہے۔ کہ ایک دفعہ موریسن صاحب نے آپ کے والد صاحب کو لکھ دیا تھا۔ کہ تمہارا بیٹا تو "ٹیلر میڈ جنٹلمین" یعنی خیاط کا بنایا ہوا جنٹلمین ہے۔ مدتوں بیچارے کو لوگ یوں دق کرتے رہے۔

آپکو نہ صرف انگریزی لباس کی تعریف ہی سے شوق تھا۔ بلکہ آپ جب چلتے تھے۔ تو اکثر سیٹی بھی بجاتے تھے۔ اور گردن کو خاص طور پر کچھ ایسا جھٹکا دیتے تھے۔ جس سے ٹوپی کا پھندنا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہلتا رہے۔ اور جس چیز کا شوق ہو جائے بس اس شوق کو انتہا تک پہنچا دیتے تھے۔ چنانچہ کچھ دنوں کیلئے آپ رائڈنگ اسکول میں شامل ہوئے۔ تو بریچز اور رائڈنگ کوٹ وغیرہ سب طیار کرایا گیا۔ کسی نے پوچھا تمکو فوج یا پولیس میں نوکری کرنی ہے۔ جو اس زور شور سے سواری سیکھ رہے ہو۔ تو آپ نے جواب دیا۔ "آئی ایم جسٹ ٹیکنگ انٹرسٹ اِن رائڈنگ" اس دن سے جو کام ڈھینڈس صاحب کرتے تھے۔ اس کا نام ٹیکنگ انٹرسٹ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ کالج کے مصور نواب زماں بہادر آف باندا نے حضرت ڈھینڈس کی بہت ہی قلمی تصاویر بنائیں۔ کسی میں آپ بڑے زور سے ٹینس کا بلا ہاتھ میں لئے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور نیچے لکھا ہے۔ "مسٹر ڈھینڈس ٹیکنگ انٹرسٹ ان ٹینس" کسی میں آپ اسٹیشن پر اسباب تلنے کے کانٹے کے پاس بڑے غیظ و غضب کی

حالت میں کھڑے ہیں۔ اور لیگیج بابو اسباب تول رہا ہے۔ اسباب نہایت انگریزی کا ہے۔ بستر پر ایک ٹینس کا بلا بھی بند ھا ہے۔ کسی میں آپ فٹ بال سے اظہار شوق فرما رہے ہیں۔ کہ خود ہی فٹ بال بنے جا رہے ہیں۔ غرضیکہ ایک زمانہ میں ان کی تصویر کا بہت چرچا تھا۔

ٹینس کا شوق ایک دفعہ اس قدر ہوا۔ کہ نئی بارگ کے سامنے پاخانوں کے قریب آپ نے ٹینس کورٹ بنوا کر صبح و شام برابر ٹینس کھیلنا شروع کر دیا۔ اور اسقدر ٹینس کھیلا جاتا تھا۔ کہ جال کو اترنے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ یہاں تک کہ رات کو بھی جال یونہی لگا رہتا تھا۔ چنانچہ کسی صاحب نے مسٹر ڈھینڈس کو دق کرنے کیلئے جال غائب کر دیا۔ ڈھینڈس کو ٹینس کی ہڑک اٹھی۔ اور جال غائب! بہت پریشان ہوئے۔ سارے میں تلاش کرایا پتہ نہ چلا۔ آخر نوکر کو بہت کچھ مارا پیٹا۔ دوستوں سے بگڑے۔ اور غصہ میں آکر بلیٹ زمین پر مار کر توڑ دیا۔ گیندیں پھاڑ ڈالیں۔ اس غیظ و غضب کی تصویر ایک شاعر نے بہ تتبع نسیم لکھنوی یوں کھینچی ہے ؂

ہے ہے مرا جال لے گیا کون ہے ہے مجھے چال دے گیا کون
بارگ کے سوا چرانے والا باہر کا تھا کون آنے والا۔

افسوس! مجھے اور اشعار یاد نہیں۔ مگر تھے نہایت مزیدار۔

اسیطرح ایک دفع شب برات کے موقعہ پر آپ کو آتشبازی کا شوق ہوا۔ بصد منت و زاری مارسین صاحب سے آتشبازی چھوڑنے کی اجازت لی۔ مگر اجازت کیساتھ یہ شرط تھی۔ کہ کرکیٹ لان پر یہ شوق پورا کیا جائے۔ چنانچہ جناب ڈھینڈس صاحب اور مسٹر عظمت اللہ صاحب کرکٹر کے ہمراہ بازار گئے۔ اور آتشبازی لارہے پر لائے۔ شام کو بہت سے طلبا ء کا کالج لان پہ مجمع ہوا۔ اور آتشبازی چھٹنی شروع ہوئی۔ انار اچھالے گئے۔ اور ایسے زور زور سے پھینکے جانے لگے۔ کہ کئی انار سامنے کی نئی بارگ پہ جا پڑے: اور دو کمروں میں

آگ لگ گئی۔ پھر کیا تھا۔ آتشبازی بند ہوئی۔ اور سب لڑکے آگ بجھانے میں مشغول ہوگئے۔ اور بڑی پھرتی سے دو محاذ کے کمروں کی چھت اتار لی۔ اُس دن سے ایک محاورہ "چھٹ چکی" کالج میں رائج ہوگیا۔ جس کے معنے یہ لیئے جاتے تھے۔ کہ شوق پورا ہو چکا۔

اِس آگ لگنے پر بھی ایک نظم لکھی گئی تھی مجھے صرف ایک بند یاد ہے۔ جو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ؎

وہ کیا انار شہر سے منگایا ڈھیڈس نے
اور اُسکا لوگوں میں شہرہ مچایا ڈھینڈس نے
ادھر تو ہاتھ سے اسکو چھوڑا یا ڈھینڈس نے
اور اسطرف نئی بارک کے تن میں آگ لگی۔
اگیا لاگی نئی بارگ جل گئی رے

مدتوں کالج کی "سنگنگ پارٹی" میں یہ نظم گائی گئی۔ اور بہت ہی مقبول ہوئی۔

افسوس ہے۔ کہ انہوں نے تعلیم میں کوئی ترقی نہ کی۔ اور ماریسن گردی میں کالج چھوڑا۔ کالج سے جانے کے بعد مجھ سے کئی بار دہلی اور میرٹھ میں ملتے رہے۔ اب کوئی چار پانچ سال سے ان کا پتہ نہیں۔ خدا کرے زندہ ہوں۔ اور خوش ہوں۔ کالج والے اب ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ حالانکہ اپنے زمانے میں ڈھینڈس صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ اور کون تھا۔ جو انہیں نہ جانتا ہو۔ یہ بھی انہیں اشخاص میں سے ہیں جنکو از یادرفتگان کہنا چاہیئے۔

(زاہدی۔ از بھاولپور)

شکایت

نہ کسی کا جوشِ شباب ہوں، نہ کسی کا نام و خطاب ہوں
میں وہ پچھلی رات کا خواب ہوں کہ جو یاد وقتِ سحر نہیں

برادرم!

میں کون ہوں؟ آپ خوب جانتے ہیں۔ مگر کالج کے اولڈ بوائز شاید بالکل ہی نہ جانتے ہوں۔ ابھی حال ہی میں ایک پوسٹ کارڈ مولانا طفیل احمد صاحب کا بدایوں سے آیا تھا۔ جس میں ٹونک کے اولڈ بوائز کی فہرست بھیجنے کی فرمائش تھی۔ اور ایک مطبوعہ فارم معہ چند ناموں کے بھی ہمراہ تھا۔ اسمیں میرے نام کے آگے انتقال ہوگیا لکھا ہوا تھا۔ مجھے بیساختہ غالب کا یہ شعر یاد آیا ؎

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

مگر مولانا کے اعجازِ مسیحائی کے قربان۔ کہ مُردے جلاتے بھی نہیں۔ اور جواب بھی مانگتے ہیں۔ خیر میں نے پیارے کالج کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے زندہ ہوکر خدمت انجام دیدی۔ اور پھر دم سادھ کر پڑ رہا۔ کیوں نہ پڑ رہتا۔ جب کہ دیکھ رہا ہوں۔ کہ ہر اولڈ بوائے اپنے زمانہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اور کوئی اس زمانہ کو نہیں سراہتا۔ جب کہ میں وہاں رہتا تھا۔ کیا سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۳ء تک کوئی واقعات کالج میں نہیں ہوئے وہ کچی بارگ جسکا نام میرے بعد پہلے "فتح آباد" ہوا ہے۔ کب کم مشہور تھا۔ کیا کالج کے کسی اور حصہ نے سعید حسین جیسے ظریف پیدا کئے ہیں۔ جس کے باغِ طبع کا ایک خوشہ چین مسعود ڈامی ہے۔

سید علی حسن کپتان نے شملہ پر جو میچ جیتا ہے۔ اُس کی خوشیاں اس زمانہ میں سنائی گئیں۔ اور توقیر حسین (انگلش پوئٹ) کی انگریزی رباعی بورڈ پر لکھی گئی۔ اور سعید حسین نے اپنی شاندار پنجابی نظم پڑھی۔ چند شعر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

شملہ پہ جو ٹیم جا رہیاں ہیں — ایٹنگ سے انہیں ہڑیاں ہیں
کپتان علی حسن کی ہمکو — یہ ساری دوائیں بجائیاں ہیں

اس کے ساتھ ہی ایک کلاس فیلو پیارے لال پر گتا ہوئی ہے۔

ہے فلسطا کی پیارے لال ٹوپی کالی ڈوری لگائیاں ہیں
انگریزی وضع جو بھائیاں ہیں بنگلے کی بنائی لائیاں ہیں

غرض یہ کہ ان واقعات کا یاد رکھنے والا جب ایک بھی نہ رہا۔ تو میرا مرجانا کیا تعجبات سے ہے جب ہمصفیروں سے دنیا خالی ہو جائے۔ تو کس کے آگے خوش الحانی کے جوہر دکھائیں۔

علاوہ بریں میرے مرجانے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ وہ یہ کہ مجھے اپنے پیارے بھائیوں سے بہت سی اور بڑی لمبی لمبی شکائتیں ہیں۔ سب سے بڑی شکایت یہ ہے۔ کہ میرا کوئی نام ایسا نہ رکھا گیا۔ جس سے مجھے یاد کیا جاتا۔ کیونکہ میں بھی ٹونک والا تھا۔ اسلئے ساتویں نمبر کے کمرے میں رہتا تھا۔ جس میں سعیدالدین (ٹھنڈائی) کا مسکن تھا۔ اس لئے بعض اصحاب تفنن طبع کے طور پر عبد الٹھنڈائی کہتے تھے۔ مگر سوئے اتفاق سے میں ایسا جامہ زیب نہ تھا۔ کہ یہ ڈھیلا ڈھالا لباس ٹھیک بیٹھتا۔ نام وہ جس میں سننے والیکو مزہ آجائے۔ اس غلعت سے مجھے بے بہرہ رکھا گیا۔

پیارے منظر! تم اس بے انصافی اور ظلم کو تو دیکھو۔ کہ آج تک مجھے اولڈ بوائز ڈنر میں بھی نہیں بلایا گیا۔

جب میں حیدرآباد میں تھا۔ تو دو عزیزوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک تو مسٹر ظہور احمد (گھمراؤ) جو شاید اب بالسٹر صاحب ہو آئے ہیں۔ اور دوسرے مسٹر غلام حسین برادر وہم خطاب مسرسید۔ مصطفے حسین ان برادرانہ برتاؤ سے دل باغ باغ ہو گیا۔ اور ان سے بھی یہی شکایت کیگئی۔ مگر

کون سنتاہے فغان درویش۔
قہر درویش بجان درویش۔

ایسی حالت میں تم ہی بتاؤ۔ کہ جیوں۔ یا مر جاؤں۔

تم نے پرچہ وی پی بھیجا تھا۔ مگر نہ اسطرح جسطرح ایک بھائی پر حق جتا کر زور

جاکر بھائی بھیجتا ہے۔ بلکہ کارڈ میں یہ لکھدیا تھا۔ کہ مسٹر... کے کہنے سے بھیجا جاتا ہے۔ بس یہی غیرت تو مجھے چوٹ ہے۔ میں نے جھلا کر واپس کر دیا۔ اللہ اکبر اب میں ایسا بے حس اور بے آس قرار دیا گیا۔ کہ پیارے کالج کے بیہودہ دشمنی کی یاد تازہ کرنے والے کی قدر اگر کروں گا۔ تو مسٹر... کی سفارش سے۔ یہ میرے اخلاق کا انسلٹ ہوا۔ جس کے لئے تم مجھ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو۔ اور یہ تین روپے جو بھیجتا ہوں۔ انہیں سر پر رکھو اور چوم کر اپنے خزانے میں رکھدو۔ یہ فقیر کی تین کوڑیاں ہیں۔ جو تین گھونٹ کا حاکم بنائیں گی۔ اور خاص حلال عین المال میں سے ہیں۔

اچھا اب شکوے شکایت بند۔ ہم تم تو ہمیشہ کے دوست ہی ہیں۔ اور دل سے اتنا عرض کرنا ہے ؎

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے۔
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔

نہ کبھی کسی کام کرنے میں میری ضرورت پڑتی ہے۔ نہ کبھی دلی حکم مجھے دیا جاتا ہے۔ نہ یاد کیا جاتا ہے ؎

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

مسٹر شوکت علی صاحب کہاں ہیں۔ مجھے ایک خاص معاملہ میں صلاح کرنے کے لیئے اُن سے ملنا ہے۔ مسٹر علی سجاد کا پتہ نہیں۔ سنا ہے۔ کہ کہیں ملازم ہوگئے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں تسلیم ؎

(سید عبدالسلام ٹونک)

(ہم نے اپنے بھائی مسٹر سید عبدالسلام صاحب کا وہ زمانہ دیکھا ہے۔ جب وہ پڑھتے تھے۔ وہ زمانہ بھی دیکھا ہے۔ جب وہ پڑھاتے تھے۔ اور اس زمانے کی بھی ہمیں یاد ہے۔ جب انہوں نے ترکِ دنیا کیا تھا۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ اُن کی حالت کو دیکھ کر کسی نے "انتقال" ہوگیا۔ لکھدیا۔ اس سے صاحبِ تحریر

کی مُراد تغیرِ حالات ہوگی۔ اب ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی۔ کہ ہمارے بھائی نے پھر جنم لیا ہے۔ اور اب انہوں نے اپنے خدمات برادری کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔ ہم اپنے بھائی سے معافی مانگتے ہیں۔ کہ ان کی خدمت میں ہم نے سفارشی وی پی بھیجی۔ اور ان سے کہتے ہیں۔ کہ ؎

وہ جینا جی کہ مرتا رہ طلب میں۔
وہ مرنا مر کہ جیتا جاوداں رہ۔

اولڈ بوائے

مرقع کالج

(از مولانا بدر الدین صاحب بی۔ اے (علیگ) ایل ایل بی وکیل مراد آباد)

یہ رسالہ کالج کے اندرونی حالات اور اسکے عملی کارگذاریوں کے متعلق مصنف نے نہایت مضحکانہ مگر قابلانہ طور پر قلمبند کیا ہے۔ اسمیں لکھا ہے۔ کہ سر سید نے علیگڈھ کالج ان تین مقاصد کیلئے بنا کیا تھا۔ (۱) مسلمانانِ ہند کا علمی احیا (۲) ان میں ایک درست قومی روح کا پیدا کرنا۔ (۳) اور ایسے افراد جو صحیح معنوں میں شہری ہوں۔ ان کا مسلمانوں میں مہیا کیا جانا۔

مگر افسوس! کہ علیگڈھ کے طلبا بھی چارپائے بر وکتابے چند کا مصداق نکلے۔ اور سر سید کی ان تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔

مولینا بدر الدین ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ اب تک ہزارہا طلبا اس کالج سے بالغ العلوم ہوئے۔ لیکن کوئی نام بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا۔ جو کہ اعلیٰ درجہ کا ادیب

مورخ۔ فلسفی مستند۔ شاعر۔ قابل آرٹسٹ۔ یا کسی کار آمد کتاب کا مولف و مصنف ہو۔ یا پبلک پلیٹ فارم کا زبردست مقرر ہو۔ اس رسالے میں ارکان و طلبائے علیگڈھ کالج کو ساحر اور خود کالج کو دیوستان یا طلسم ہوشربا قرار دیا گیا ہے۔ اور واضح کیا گیا ہے۔ کہ ان ساحروں کے لئے جو اپنے معلم ساحروں کے زیر نگرانی تعلیم پاتے ہیں۔ جدا جدا دار الاقامے طیار کئے گئے ہیں۔ یعنی ڈی بنچیر[1]۔ ظہور[2] وارڈ۔ میکڈانل[3] ہوس۔ ممتاز[4] ہوس۔ اور انگلش[5] ہوس۔ ان میں ظہور وارڈ ابتدائی تعلیم کے ساحروں کیلئے ہے۔ انگلش ہوس ان طلباء کیلئے ہی جو سوٹڈ بوٹڈ رہنا۔ اور یورپین طرز معاشرت سے واقف ہو کر ولایت میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرنا چاہتے ہوں۔ کالج کی اعلیٰ جماعت کے ساحروں کیلئے سر سید کورٹ یا پکی بارک۔ سید محمود کورٹ (کچی بارک)۔ نئی بارک۔ ملٹو سرکل۔ سوسائٹی ہوس اور صاحب باغ مخصوص ہیں۔ کچی بارک کے ساحر کی عام خصوصیات یہ ہیں۔ مالدار ہو۔ اگر نہ ہو۔ تو امیرانہ ٹھاٹھ رکھتا ہو۔ خوب کھلنڈرا پڑھنے لکھنے سے نفور عم و فکر سے دور ہو۔ لوفر اور رائیلسٹ ہو۔ بانکا ترچھا اور مغربی تہذیب کا دلدادہ ہو۔ بایں ہمہ تمام کالج میں نئی نئی شرارتیں تجویز کرنے۔ اور ان کو بروئے کار لانے کا ڈھنگ خوب جانتا ہو۔ کچی بارک نام ہی سے ظاہر ہے۔ کہ پرانی کھپریل کی عمارت ہو گی۔ اس کے ساحر بڑے رٹو اور بدھو ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اگر پڑھنا چاہو۔ تو کچی بارک میں رہو۔ یہ ساحر کھیلنے میں طاق کودنے پھاندنے میں چالاک اور اکثر کرکیٹ اور فٹ بال کے کپتان کچی بارک ہی سے نمودار ہوا کرتے ہیں۔

ملٹو سرکل۔ یہ کالج کا گویا کالا پانی ہے۔ جس میں وہ لڑکے جو متواتر فیل ہوا کریں۔ علیحدہ رکھے جاتے ہیں۔ صاحب باغ و سوسائٹی ہوس یہ طلبائے قانونی کے لئے مخصوص ہیں۔ ان سب بارکوں کی عنانِ حکومت ایک اتالیق۔ نائب اتالیق اور بعض استادانِ کالج کے ذمہ ہے۔ طلباء کے کھانے کیلئے ایک وسیع ڈائننگ ہال

مخصوص کیا گیا ہے۔ جس میں غریب و امیر تمام مسلمان ساحر ایک ہی وقت پر دو تین دفعہ کھانا کھاتے۔ اور پلاؤ زردہ قورمہ فیرنی وغیرہ اڑاتے ہیں۔ یونین کلب اِس دو منزلہ مکان میں لڑکوں کا اپنا بنایا ہوا کتب خانہ ہے۔ جہاں طرح طرح کے اخبارات اور ایک کثیر التعداد کتابوں کی ہمیشہ مہیا رکھی جاتی ہے۔ یہ دراصل ساحرانِ کالج کی سیلف گورنمنٹ کی جگہ ہے۔ جہاں وہ ہر قسم کی کھیلیں۔ مثلاً شطرنج۔ تاش۔ چوسر اور پنگ پانگ وغیرہ کھیلتے۔ اور کریکٹ ہاکی۔ فٹ بال وغیرہ کی تجاویز ملکر سوچا کرتے ہیں۔ چنانچہ کریکٹ میں علیگڈھ کالج کے کھلنڈرے ولائیت تک خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

ہسپتال۔ یہ ایک خوشنما عمارت ہے۔ لیکن اِس کے ڈاکٹروں کے عملی کارناموں کے متعلق صاحب مرقع کا قول ہے۔ کہ اگر کسی لڑکے کا اپریشن کرتے وقت ڈاکٹر کا نشتر زخم میں رہ جائے۔ تو وہ اسی میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اسکی خبر ہی اسکو نہیں رہتی۔ اور اگر کسی درد کرنیوالے دانت کا نکالنا منظور ہو۔ تو مریض خواہ کتنا ہی چیختا چلاتا رہے۔ اس کے ساتھ صحیح و سالم دانت نکال باہر پھینک دئے جاتے ہیں۔ ایک یونانی مطب بھی اس کے ساتھ ہے۔ مگر اس میں ساحرانِ کالج کو عموماً خوش ذائقہ شربت ہی مہیا کیا جاتا ہے۔ یا قوتِ باہ کے نسخے۔ ورنہ علاج برائے نام کیا جاتا ہے۔

علیگڈھ کالج کی مختلف سوسائٹیاں

(۱)
کلب وغیرہ

"بھوق کلب" یہ ایک زندہ دلانہ کلب ہے۔ جو طلباءِ اودھ کی یادگار ہے۔

اِس کے ممبروں کو اکثر شاعری۔ بذلہ سنجی۔ ہزل و ظرافت۔ عاشق مزاجی۔ اور گانے بجانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ چنانچہ اِس کے بعض ممبروں کے نام و خطابات یہ ہیں۔ (۱) حقہ نوش۔ پلنگ سوار۔ خرمل خرمل میاں بدرل (۲) بذلہ سنج پارہ تمثال دل بھنگ بہادر میاں ولائیت علی (۳) رندی و خرابانی میاں راجہ غلام حسین۔ (۴) رسالہ چاٹ اخبار نوش پری میاں عزیز الدین (۵) گریٹر بہادر بھیا ظہورا۔

بھیا سوسائیٹی اس کے بانی بھیا بہادر محمد بخش تھے۔ کالج کے جس ساحر کو خطاب بھیا کیلئے ڈب کیا جاتا ہے۔ اس میں بے ہنگم پنا اور عجیب و غریب حرکات کے عمل میں لانیکا فطرتاً کچھ مادہ ہونا چاہیئے۔ بھیا بہادر کا خطاب دینے کیلئے کالج کے ساحروں کا شاندار جلسہ قرار پاتا۔ اور بھیا کے گلے میں کنیر کے پھولوں کے ہار اور سر پر لکڑی کا تاج رکھ دیا جاتا ہے اور اکثر مضحک تقریروں کیساتھ شیرینی تقسیم ہو کر اِجلاس برخواست کیا جاتا ہے۔

خاندان بوم اہلِ یونان علم و فن کی علامت ایک اُلّو کی تصویر قرار دیا کرتے تھے غالباً اِسی رعایت سے ایک قابل ساحر کو جس میں شئے لطیف کی تو کمی ہو۔ مگر قدرے چڑچڑی طبیعت رکھتا ہو۔ اور اس کے دلمیں بیلطری کا خبط بھی سمایا ہو۔ اور اکثر تنہا رہتا ہو۔ اسکو بوم اکبر کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اگر اوصاف مذکورہ میں کوئی ساحر ادھورا ہو۔ اور اس کو بوم بنانا بھی منظور ہو۔ تو اُس کو بومچہ ہی بنا دیا جاتا ہے۔ اگر اس سے بھی کچھ کمتیل ہو۔ تو بوچک کہینگے۔

شرارتیں اِس کالج کے ساحروں کی بعض شرارتیں حسب ذیل ہیں۔ (۱) سرد فاختہ اڑانا۔ یعنی کسی بھلے مانس کی آستین یا کف کالر وغیرہ میں ایک برف کا ٹکڑا بے دھیان چھوڑ دینا۔ (۲) گرم فاختہ اڑانی ہو۔ تو روئی کا ایک فٹ بال سا بنا کر سوتے طالب علم یا ساحر کے ننگے پاؤں پر رکھدیا جاتا ہے۔ اور اسکو دیا سلائی لگا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ (۳) مرے صاحب کا بھوت۔ اِسکی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ ایک

مرے صاحب کی نسبت مشہور کیا گیا ہے۔ کہ وہ علیگڈھ کالج ہی کے ایک بڑھ کے درخت کیساتھ ستاون کے غدر میں ناحق پھانسی دیا گیا تھا۔ جس کی روح ابتک رات کیوقت کالج میں پھرا کرتی ہے۔ اور نووارد لڑکوں کو ڈرایا کرتی ہے۔ لیکن فلاں قبر پر ملتفی توس رکھ دینے سے وہ روح فوراً آرام ہو جاتی ہے۔ اس ہیکے کا اثر نووارد طلبار پر عموماً ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ وہ کالج میں آنے سے پہلے بھوت پریت کے ہمیشہ قائل ہوتے ہیں۔ (۴) ڈنڈر وئینگ۔ موسم برسات میں جب پہلی زور کی بارش ہو۔ تو اس میں ساحران کالج کیچڑوں سمیت نکلتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر کیچڑ پھینکتے ہیں۔ یہ گویا برسات کی خوشی میں ہولی کھیلی جاتی ہے۔ (۵) ناشتہ پر حملہ۔ جو طلبار تنہا خوری کے عادی ہوں۔ یا کسی وقت ایک نووارد ساحر کے کھانے دانہ کو لوٹ لینا منظور ہو۔ تو ایک شرارتی پارٹی (جو کالج میں عموماً قائم رہتی ہے) حکم دیدیتی ہے۔ کہ آج اسکی ناشتہ پر حملہ ہو۔ اور فلاں کمرے کا توشہ لوٹا جائے۔

خطابات یکم اپریل کو اپریل فول مناتے ہوئے کالج کے بعض نامور ساحرول کو عجیب و غریب خطابات بھی ہر سال عطا کئے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیل طول فضول ہو گی۔

لطائف و ظرائف یوں تو مسلمانوں کی قوم اکثر زندہ دل واقعہ ہوئی ہے۔ مگر ان علیگڈھ کے ساحروں کی باتوں میں وہ رطب و یابس بھرا ہے۔ کہ اگر ان کے لطیفے قلمبند کرنا چاہو۔ تو کالج مذکور اس نعمت غیر مترقبہ کی گویا کان ہے۔ چنانچہ ایکدفعہ کچی بارک کے کچھ کھلنڈرے آپ ہی آپ یہ راگ الاپ رہے تھے ؎

میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا　　میری بھینس کے ڈنڈا کیوں ملا
جو پیٹ میں بچہ مر جاتا ۔ تو بتلا تیرا کیا جاتا ۔
میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا۔
میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا۔

ترڈے کے چرن کو جاتی تھی ۔ ۔ ! اور پیٹ بھرن کر آتی تھی !
وہ ہم کیلئے روز دلاتی تھی ۔ ۔ ! گھی دودھ ہم کو کھلاتی تھی۔
میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا ۔

حساب کا جنازہ

ایف۔ اے کیلئے ریاضی کا مضمون جب اختیاری قرار دیا گیا تو مسلمان طلبا جو اکثر حساب ہی میں ناکام رہا کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت خوشیاں منائیں۔ اور رستے میں ایک چار پائی کو الٹا کر کے اس پر الجبرے۔ ارتھمیٹک اور ٹریگنومیٹری وغیرہ کے رسالہ لاد دیئے۔ اور یوں ریاضی کا جنازہ تمام کالج میں پھرایا گیا۔

قطرب صاحب کی کھچڑی

ایک دفعہ ایک سندھی طالب علم نے کسی اور ساحر سے قطرب کے معنی پوچھے اس نے بتایا۔ کہ وہ ایک سندھی جانور ہوتا ہے۔ سائل نے کہا۔ کہ میں نے اسکو اپنے وطن میں کبھی نہیں دیکھا۔ دوسرے لڑکے نے اس سندھی ساحر کے آگے آئینہ رکھکر بتایا۔ کہ یہی تو قطرب ہے۔ جس سے تمام طلبا اس سندھی لڑکے کو قطرب ہی کے نام سے پکارنے لگے۔ وہ ذرا حکام رس اور خوشامد پسند بہت تھا۔ پرنسپل آرچ بولڈ کی والدہ نے قضا کی تو لڑکوں کے مشورے سے اس نے تعزیت کی کھچڑی پکائی۔ جسکو کہ وہ پرنسپل صاحب موصوف کے نذر کرنا چاہتا تھا۔ مگر کالج کے لڑکے ہی اسے چھین جھپٹ کر کھا گئے۔ جو اب تک قطرب صاحب کی کھچڑی کہلاتی ہے۔

انگریزی مسہل ۔ علیگڈھ کالج کی یادگار خاص تھا ایک نامی کھلنڈرا رہ چکا ہے

ایک دفعہ کلی بارک کے پراکٹر نے رات کو مسہل لیا۔ اور سو رہا۔ دِن کو اٹھا۔ تو تقضائے حاجت کیلئے پاٸخانہ کیطرف دوڑا۔ لیکن ٹامی کو یہ بات کسی طرح معلوم ہو چکی تھی۔ اُس نے بڑی احتیاط سے علی الصبح تمام بارکوں کے پاٸخانوں کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ غریب پراکٹر کچھ دیر اِدھر اُدھر مارا پھرا۔ کہیں جگہ نہ پائی۔ تو سب کے سامنے نالی ہی پر بیٹھ گیا۔ یہ انگریزی مسہل کی برکت تھی۔

ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب بالقابہ

سے

شرارت

ڈاکٹر صاحب موصوف جرمنی اور لندن سے بڑی بڑی ڈگریاں حساب میں لیکر اپنے کالج مالوف کو واپس آئے۔ تو ایک شریر لڑکے نے ان پر بھی فقرہ بازی کی اور یہ منظوم پھبتی اڑائی ہے ؎

دعوےٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپکو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجیے۔

ساحرانِ علیگڈھ کی موجودہ طرازی

چونکہ علیگڈھ کالج اپنے کھلنڈروں کی شوخیوں کے باعث چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اِس کالج کے طلبہ کی ذہانت وطباعی اور شوخی وشرارت بیان کی محتاج نہیں بعض زندہ دلوں نے تو ظرافت کو فن کے درجہ تک پہنچا کر اسکو مدون کر دیا ہے کچھ عرصہ گذرا علیگڈھ میں ایک خاص قسم کی شاعری شروع ہوئی جس میں ہر شعر کا پہلا مصرعہ نظم میں اور دوسرا نثر میں ہوا کرتا تھا مثلاً شعر سنئے

؎ قاصد لفظ بہر ادب سے کہ بہ زبانی کہیو — کہ تمہیں بلایا ہے۔
؎ جو مجھکو دیکھا ہے بولو تو جب بہکا کہا — کبھول بسے گے گا؟
؎ عرضی وصل پہ ہر بار رد لکھ دیتے ہیں — نامنظور۔ نامنظور

قابل دید کتابوں کی فہرست

اعجاز سخن حصہ اوّل: شعرائے قدیم میں امیر خسرو سے غالب و مومن تک اور شعرائے جدید میں مولانا حالی، شبلی و اکبر وغیرہ کا تنقیدی تذکرہ قیمت ۸ عہ

۱) جام مشرق:۔ ایک دلچسپ نظم۔ قیمت ۴ر

۲) طبابت کے چٹکلے:۔ حصہ اول جسمیں اشتہاری طبیبوں کے طرز عمل کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ قیمت ۴ر

۴) مضحکات و مطائبات سرسید حصہ اوّل:۔ یعنی قومی لطائف و ظرائف کا نادر مجموعہ . . . . قیمت ۱۲ر

نوٹ:۔ جو اصحاب چاروں کتابیں ایک ساتھ خرید فرمائیں۔ ان سے صرف ۲ دو روپیہ قیمت لیجائیگی:

مینیجر شمیم ظریف بک ڈپو لاہور
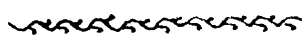
سید کی روح:- کیا علیگڈھ کالج مسلم یونیورسٹی بنایا گیا؟

جی ہاں، بلکہ اسکا ایک پنجاہ سالہ جشن جوبلی بھی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا

روحِ مرحوم:- وہاں کیا کیا کارگذاریاں ہوئیں؟

اجی آپکو اور آپکے قابل وقعت کارناموں کو پیٹ بھر کے سراہا گیا۔

روحِ سرسید:- آہاہا - آہاہا - اہو - ہو - ہو ـــــ جزاک اللہ!

معاً ایک نظر صاحبزادہ آفتاب احمد صاحب کیطرف اُٹھا کر ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند
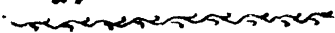
قومی لطائف و ظرائف کے سلسلے میں

مضحکات و مطائباتِ سیّد

حصّۂ دوم

مُرتبۂ

جناب شیر علیخاں صاحب سرخوشؔ مؤلف تذکرۂ اعجازِ سخن وغیرہ

مزنگ لاہور

رسالہ مضحکات و مطائباتِ سرسید

حصۂ دوم

فہرست مضامین

مضحکات و مطائبات سرسیّد

حصّۂ دوم

دیباچہ

اِس کتاب کے پہلے حصّے میں زیادہ تر سرسید مرحوم و مغفور کے حالات۔ ان کے مختلف النوع لطائف و ظرائف۔ اور علیگڈھ کالج یا اس کی تحریک کی بدولت جو مضحک کوائف قوم میں پیدا ہو گئے ہیں اور جن سے ہمارے موجودہ قومی لٹریچر میں کچھ زندگی و زندہ دلی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ قلمبند کئے گئے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ دل خوش کن۔ ظریفانہ مضامین سرسید کے ایسے قابل وقعت دشمن کے مخالف تھے یا مؤید۔ یہ نیوٹریلٹی اور غیر جانب داری کی پالیسی صرف اسلئے ہم اختیار کرتے ہیں کہ ایک ایسا مصنف جو اپنی قوم کے علم و ادب کا کوئی خاص شائبہ پیش کرنا چاہے اس کو شایاں نہیں ہے کہ وہ اس امر میں کوئی لگی لپٹی بھی باقی رکھے بقول حضرتِ غالب ؎

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

اگر سرسید نے بعض مواقع پر مزاح و ظرافت سے کام لیا تھا تو پھر ان کے مخالفین بھی انہی کی تقلید میں اکثر حدِ اعتدال سے بڑھ گئے تھے۔ اور یہ مثل آخر سید مرحوم ہی پر صادق آئی تھی ؎

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اُردوئے جدید میں میرزا غالب کے بعد مسلمانوں میں جب قومی لٹریچر نے نشوونما پایا ہے

اس میں سرسید۔ حالی۔ شبلی۔ نواب محسن الملک۔ وقار الملک اور مولوی نذیر احمد خاں صاحب سب ایک دوسرے کے برابر شریک رہے ہیں اور وہ اپنی قوم سے گالیاں کھانے میں بھی یکساں ہیں۔ تاہم اس نعمت عظمےٰ سے زیادہ تر سرسید ہی کو حصہ ملا تھا جن کے متعلق اس کتاب کے اولین جزو میں کافی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے اب اس رسالہ میں نواب محسن الملک وغیرہ کے لطائف و ظرائف کے علاوہ مقدماتِ مولوی نذیر احمد دہلوی مولوی محرم علی چشتی کے عنوان سے وہ مضحک مضامین بھی درج کئے گئے ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳۳) جو واضح کرتے ہیں کہ بعض اہل قوم نے سرسید اور خصوصاً مولوی نذیر احمد خاں کو جو ان کے خاص حواری تھے (جہاں تک کہ اصلاح قوم کا تعلق ہے) کس درجہ ذلیل اور بدنام کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آخر یہ دونوں قومی ریفارمر ہی کامیاب ہوئے۔ اور ان کے وہ مخالف خود بخود ہی ٹل گئے۔

اقوام مغرب میں بعض اوقات ایک کارٹون ہی ساری قوم کے خیالات منقلب کر سکتا ہے۔ یہ علم و فنِ ظرافت کا بہترین استعمال ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تاحال یہ باتیں محض ابتدائی حالت میں ہیں۔ اگر وہ اصحاب جو نوجوانان قوم میں کچھ قومی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ ان رسایل سے خاص خاص لطائف اخذ کر کے اپنے حافظہ میں محفوظ کریں اور ان سے مناسب موقعوں پر کام لیا کریں۔ تو ہم خرما و ہم ثواب۔

گویا وہ تو اپنی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچائیں گے اور اہل قوم اُن سے یہ قومی لطائف سُن کر کچھ اپنی اصلاح حالت میں مدد لینگے۔

اس مجموعہ میں شمس العلماء ـــ مولوی حافظ نذیر احمد خاں صاحب ایل ایل ڈی وغیرہ کے کثیر التعداد لطائف قصداً اس لئے انتخاب نہیں کئے گئے۔ کہ ان کے لئے ہم اس سلسلے کا تیسرا حصہ سارے کا سارا

وقف کر چکے ہیں۔ اور وہ حصّہ عنقریب شائع ہو کر یہ قومی لطائف وظرائف کی بیاض بالکل مکمل ہو جائے گی۔

قوی امید ہے کہ اہل قوم ان لطائف و نوادر کو اپنی روزانہ گفتگو میں دوستانہ مجلسوں میں لیکچروں میں اور مساجد و تعلیم گاہوں وغیرہ میں اسی طرح استعمال کریں گے۔ جیسے کہ اور فضول سے فضول نکمے۔ مبالغہ آمیز اور بے سروپا لطیفے عموماً کہے سنے جاتے ہیں۔ اور ان سے پہلے اپنی اور پھر دوسروں کی طبیعت کو خوش کیا جاتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا کیا گیا تو ہم سمجھیں گے۔ کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ اور یہ مثل گویا ہمیں پر عاید ہونے کو ایجاد ہوئی تھی یعنی ؎

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی   (سرخوش)

تحریک علیگڈھ کالج

اس قومی تحریک سے جن بزرگان قوم کو خاص تعلق رہا ہے۔ وہ یہ ہیں سرسید احمد خاں بہادر۔ نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ مولوی سمیع اللہ خاں۔ سیّد محمود۔ مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ اور مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ اوّل الذکر کے مفصل حالات زندگی تو مضحکات و مطائبات سرسید حصہ اول میں ہم درج کر چکے ہیں۔ باقی ماندہ مندرج ذیل ہیں۔ نواب محسن الملک نام سید مہدی علی تھا۔ ۱۸۳۷ء میں اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم پا کر اٹاوہ کی کلکٹری میں دس روپیہ ماہوار کے محرر ہوئے۔ اور پھر ۱۸۶۱ء میں ترقی پا کر تحصیلدار بن گئے۔ صیغہ مال و فوجداری میں بخوبی کام کیا اور نام پایا۔ حتےٰ کہ ڈپٹی کلکٹری

نصیب ہوئی۔ لیکن سرکاری ملازمت چھوڑ کر ۱۸۷۴ء میں ۸۰۰ روپیہ ماہوار پر حیدر آباد دکن میں نوکر ہوگئے۔ وہیں نواب کا خطاب پایا۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق میں خوب آرٹیکل لکھے۔ اور انکی وفات کے بعد علیگڈھ کالج کا گویا چارج لے لیا۔ تمام اطراف ہند میں پھر کر علیگڈھ کالج اور یونیورسٹی کے لئے چندہ تحصیلا اور آخر بہت عزت و نامیوری کے بعد جناب نواب محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ مولوی سید مہدی علی صاحب نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ستر برس کی عمر پاکر وفات پائی۔ ؎

پیری میں جوانوں کو کیا مات اس نے
آرام پہ اپنے ماردی لات اس نے
تدبیر سے محنت سے دکھادی سب کو
کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

شمس العلما مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ ایل ایل ڈی۔ ولادت ۱۸۳۱ء اور سن وفات ۱۹۱۲ء۔ آپ نے ریہڑ بجنور میں جنم لیا۔ چودہ برس کی عمر میں کچھ عربی فارسی پڑھ کر ایک مسجد کے مولوی کے ساتھ ختم کی روٹیوں پر گذر کرتے تھے۔ پھر دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں عربی فارسی وریاضی کی تکمیل کی۔ بعد ازاں بیس پچیس روپیہ ماہوار کے سرکاری ملازم ہوکر پنجاب آئے۔ اور ۱۸۵۷ء میں غدر کی خدمات کی وجہ سے انسپکٹر مدارس بنادئے گئے۔ تعزیرات ہند کے اردو ترجمے میں مدد کی۔ پھر محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر تحصیلدار بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ بندوبست کے محکمہ کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ وہاں سے حیدر آباد دکن چلے گئے اور سترہ سو روپیہ ماہوار تک ترقی پائی۔ انکا ترجمہ قرآن مجید بہت مشہور ہے۔ مراۃ العروس توبتہ النصوح۔ محصنات اور ابن الوقت وغیرہ لکھ کر ادب اردو کی بڑی خدمت کی۔ لیکن مولانا کی طبیعت انتہا درجہ کی ظرافت پسند تھی۔ چنانچہ انکے لیکچر اس فن میں ایک خصوصیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو وفات پائی۔ انکے مکمل حالات

حیات النذیر میں درج کئے گئے ہیں۔ چونکہ انکی مضحک تحریروں کا ایک انتخاب ہم مضحکات النذیر کے عنوان سے شایع کرینگے! اسلئے اور لکھنا فضول ہے۔ یہ مضحکات النذیر اس سلسلہ کی تیسری کتاب ہوگی جو زیر طبع ہے۔

نواب وقار الملک ۱۸۳۹ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں نائب مدرس مقرر ہوئے تھے۔ بتدریج علیگڈھ کے صدر الصدور کے عہدے تک ترقی پائی۔ پھر حیدر آباد میں عہدۂ جلیل پر فایز ہوئے۔ بڑے متدین و دلیر آدمی تھے۔ علیگڈھ کالج کے خاص ٹرسٹی تھے۔ قومی کاموں میں خوب حصہ لیا۔ ۱۹۱۷ء میں انتقال کیا۔ مولوی سمیع اللہ خاں ولادت ۱۸۳۴ء وفات ۱۹۰۸ء امتحان وکالت پاس کرکے سشن ججی تک ترقی کی۔ علیگڈھ کالج کے ٹرسٹی رہے۔ لیکن سرسید سے اکثر بگڑتی ہی رہی۔ سید محمود (فرزند سرسید احمد خاں مرحوم) ولادت ۱۸۵۰ء وفات ۱۹۰۳ء بیرسٹری پاس کرکے کلکتہ میں جج مقرر ہوئے۔ ابتدا میں سرسید کو بہت مدد دی۔ آخر مختل الحواس ہوکر وفات پائی۔ بڑے قابل آدمی تھے۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی ولادت پانی پت ۱۸۳۷ء وفات ۱۹۱۴ء عربی فارسی پڑھ کر مدرسی کرنے لگے۔ پنجاب یونیورسٹی میں بھی رہے۔ لیکن عمر کا زیادہ حصہ شاعری میں صرف ہوا۔ سرسید کے لئے مسدس حالی لکھ کر گویا بقائے دوام کا انعام پایا۔ شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی۔ اعظم گڈھ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مدرسی کی پھر وکیل بنے۔ اسے چھوڑکر کچھ دنوں بعد علیگڈھ کالج میں آئے۔ بتدریج پروفیسر بن گئے۔ مجلس ندوۃ العلماء کے سکرٹری رہے۔ اُردو میں قابل شاعر اور ایک بڑے مورخ اور مضمون نگار تھے۔ تالیف سیرت نبوی انکا بڑا کارنامہ ہے۔ یہی لکھتے وقت وفات پائی اور ان کا یہ قول پورا اترا ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مسلمانوں کے افلاس کی ایک مثال

محمڈن کانفرنس کے جلسہ میں نواب محسن الملک نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اے بھائیو۔ علم طبیعات کا یہ مسئلہ ہے۔ کہ جو چیز اوپر سے گرتی ہے۔ وہ جس قدر نیچے آتی جاتی ہے۔ اسی قدر اُس کے گرنے اور زمین پر پہنچنے کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور تیز بھی اضعافاً مضاعفاً یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ کہ اب اس کے زوال کی چال بہت تیز ہوتی جاتی ہے۔

قومی طب اور اُس کے ایک نسخے کا پلایا جانا

سرسید کے دلی دوست نواب محسن الملک نے ایک موقع پر لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اے حضرات اب کہاں تک قوم کی تباہ حالت کا ذکر کیا جائے۔ یہ عورتوں کی طرح رونے کا وقت نہیں ہے۔ بلکہ کام کرنے کا وقت ہے۔ قوم بیمار ہے۔ اور اُس کو ایک طب قومی یعنی علاج کرنے کی حاجت ہے۔ ہم لوگ جو ایک علیگڈھ پارٹی کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی واسطے یہاں آئے ہیں۔ کہ اس بیمار قوم کا علاج کریں۔ نسخہ لکھیں۔ لیکن نسخہ اگر لکھ دیا جائے۔ تو تعویذ کی طرح گلے میں لٹکانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ سخت ضرورت ہے دوا لانے کی۔ لیکن دوا کے لئے چاہیئے روپیہ۔ اگر کسی نے کسی طرح دوا کے اجزا بہم پہنچائے جائیں۔ تو یہ اور مصیبت ہے کہ بیمار ضدی ہے۔ اور ایسا کہ جہاں دوا پلانی چاہی۔ اس نے تڑسے لات ماری۔ اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ علیگڈھی ڈاکٹر پھوڑے کو چیر کر عام جہالت اور اوہام فاسد کا جو مواد قوم میں بھرا پڑا ہے۔ اس کو یک لخت خارج کردینگے۔ اور پھوڑے کو چیرنے کے وقت بیمار ضرور چیخیگا چلائیگا۔ لیکن جب مواد سب خارج ہوجائیگا۔ تو وہ زمانہ عنقریب آئیگا۔ کہ بیمار کو راحت ہوجائیگی۔ اور تمہیں لوگ کہوگے۔ کہ خاص علیگڈھ سے

سے جو ڈاکٹر آئے تھے۔ ان کو ہمارا سلام!

ہندوستانیوں کی بزدلانہ عادات

سنہ ۱۸۶۶ء میں سر سید نے ایک پولیٹیکل تقریر علیگڈھ میں کی جس میں آپ فرماتے ہیں۔ کہ صاحبو۔ آپ مجھ کو معاف کیجئے گا۔ میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی رعایا کی یہ عام عادت ہو گئی ہے۔ کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر گورنمنٹ کی ہزار ہا شکایتیں کریں گے۔ اور انتظام حکام پر ہزاروں طرح کے عیب لگائینگے مگر جب انگریزوں سے ملیں گے۔ تو صاف منہ پر کہیں گے۔ کہ ہم تو انگریزی گورنمنٹ کے بڑے خیر خواہ ہیں۔ اور حکام انگریزی کا انتظام حد توصیف سے بھی بڑھ کر ہے۔ بہت اچھا ہے۔ خوب ہے۔ چناں ہے۔ چنیں ہے۔

کیا کوئی عقلمند حاکم ایسی رعایا کو اپنا خیر خواہ سمجھیگا؟

میونسپل کمشنروں کی بزدلی

سید ایک مرتبہ پنجاب میں تشریف رکھتے تھے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ میں یہاں کی (امرت سر کی) میونسپل کمیٹی کے ذی مرتبہ اور عالی درجہ ممبروں کا حال تو نہیں جانتا مگر اکثر جگہ یہی دیکھا ہے۔ کہ بجز حضور اور ہاں میں ہاں ملانے کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا کرتے۔ مگر کمیٹی گھر کے کمروں سے باہر جا کر بہت ڈینگ مارتے اور اکثر کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا۔ اور وہ کیا۔ مگر چونکہ وہ تجویز ہی بہت خراب تھی۔ ہم کیا کرتے۔ اس کے علاوہ کلکٹر صاحب کی بھی مرضی یہی تھی۔ کہ ایسا ہو۔ ہمارا کیا قصور۔

غرض یہ نتیجہ ہماری قوم کی خراب تربیت کا ہے۔ اگر سچی آزادی کی تعلیم ہوتی۔ تو کلکٹر کیا وائسرائے کے سامنے بھی ہم صاف کہدیتے۔ دی مائی لارڈ

رسم ورواج کا جکڑبند

۱۸۷۳ء میں سرسید نے رسم ورواج کی قیود کے متعلق ایک زبردست لیکچر دیا تھا۔ جس میں آپ کہتے ہیں۔ کہ رسم ورواج کی حکومت انسانوں کے دلوں میں نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ہر شخص غلام سے زیادہ اس کی تابعداری کرتا ہے۔ آقا کو اپنے غلام پر کبھی کبھی نافرمانی کرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر رسم و رواج کو اپنے غلاموں کی نسبت نافرمانی کا کبھی اندیشہ نہیں ہوتا۔

(خوب)

سنندرو ناتھ ٹگور

بھائیو۔ ہمارے سب سے پہلے ہندوستانی سویلین سنندرو ناتھ ٹگور کا واقعہ ہے کہ وہ ذات پات کی بھاری بیڑی کو توڑ کر سمندر پار گئے تھے۔ پھر کسی نواب نے ان کو دوستانہ طور پر دعوت میں بلوایا۔ مگر کھایا نہیں۔ اس پر بھی اس کی قوم کے لوگوں نے کہا۔ کہ کھانے کی خوشبو سونگھنا آدھے کھانے کے برابر ہے۔ اور اسی سبب سے اس کو ذات برادری سے خارج کر دیا تھا۔

عزّت کا مفہوم

سرسید فرماتے ہیں۔ کہ بڑا افسوس ہے۔ ہمارے زمانہ کے لوگوں نے عزت کا مفہوم سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ انہوں نے عزت کو چند ظاہری باتوں پر منحصر سمجھ

رکھا ہے۔ خانگی امور میں تو ان کے نزدیک عزت بس اسی کا نام ہے۔ کہ دو چار خدمتگار ہر وقت دست لبستہ ان کے سامنے کھڑے رہیں۔ اور حضور و جناب عالی کہہ کر۔ ہاتھ جوڑ کر کچھ عرض کیا کریں۔ سواری کے جلو میں دو چار عصا بردار و خاص بردار ان کے آگے دوڑتے پھریں۔ اور دو تین خواص پانی کا ڈبہ اور پیک تھوکنے کا ایک بڑا سا پیکدان اٹھائے ہوئے حاضر رہیں۔

اسی طرح برادری اور قوم میں انہوں نے اپنی عزت اس میں سمجھ رکھی ہے۔ کہ بیٹے کی بسم اللہ۔ اور اس کے ختنہ کی شادی میں وہ کچھ کیا۔ کہ آج تک کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کوئی دوست نہیں رہا جس کو بلایا نہ ہو۔ کوئی رقاصہ نہیں رہی۔ جو مجرے میں نہ آئی ہو۔ بھانڈوں نے ایسا سماں باندھا ہو۔ کہ کسی کے ہاں آج تک نہ باندھا ہو۔

حاکموں کے دربار کی عزت اس میں منحصر ہے۔ کہ صاحب بہادر ہم سے ہنس کر بولے شاید دو چار قدم استقبال کیا۔ یہ تو نہایت خوشی خوشی کرسی اعزاز پر بیٹھتے ہیں مگر وہ صاحب بہادر اس فکر میں ہیں۔ کہ میں ان سے بات کیا کروں۔ کسی ملک کے حال سے یہ واقف نہیں۔ تاریخ کے دلچسپ واقعات کی ان کو خبر نہیں۔ انتظام ملکی اور انسان کی بھلائی و بہتری کے اصول تو ان کے خیال ہی سے نہیں گذرے۔ میں بولوں تو ان سے کیا بولوں۔ اتنے میں صاحب موصوف کے دل کو اس خیال نے گدگدایا۔ کہ میں مزاج و دل خوش کن دو چار باتیں ان سے کروں۔ اب اس خیال سے دوہری مصیبت پیش آئی۔ ادھر تو صاحب بہادر کو ہماری زبان میں لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی نہیں آتی۔ ادھر دو رئیس ان کی انگریزی نما اردو نہیں سمجھتے۔ تاہم صاحب زیادہ اخلاق برتنا چاہتا ہے۔ اور ایک ہندوستانی سے اپنی ملاقات کے چند خشک و بدمزا لمحوں کو خوش و ناخوش گذار دینا چاہتا ہے۔

اس لئے وہ اب اپنے فوٹوگراف کی نہایت عمدہ تصویر جو اسی دن تیار ہو کے آئی

ہے۔ ان کو دکھلاتا ہے۔ اس پر وہ رئیس صاحب بے اختیار پوچھتے ہیں۔ کہ صاحب یہ کس کی تصویر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ ایک ولایتی بیل کی۔ اس سے خوب ہنسی پیدا ہوتی ہے۔ غرض جوں توں کرکے وہ تھوڑی سی مدت ملاقات کی گزر جاتی ہے۔ اور صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو کمرہ کے باہر چھوڑ جاتے ہیں۔ اور یہ خوش خوش اپنے گھر چلے آتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں۔ کہ آج حاکموں میں ہماری خوب عزت ہوئی۔ اور درحقیقت ان کی جو عزت ہوئی۔ یا حاکموں کے نزدیک ان کی جو عزت ہے۔ وہ وہی خوب جانتے ہیں۔ جن سے وہ ملتے ہیں۔

ہاف میجر

سرسید انگریزی نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ۱۸۶۳ء میں ایک لیکچر گورکھپور میں آپ کا ہوا۔ تو آپ نے ہاف میثرز کے عوض ہاف میجر کا لفظ جیسے کہ مرغی میجر من بولتے ہیں۔ استعمال کیا تھا۔ یعنی Half measures کو Half major کہہ گئے تھے۔

علیگڑھ پارٹی کی قدر و منزلت اور اس پر تکفیر کا فتویٰ!!!

بمبئی میں نواب محسن الملک بہادر نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ صاحبو۔ مختلف خیال و عقائد کے لوگ سب جگہ پائے جاتے ہیں۔ کچھ علیگڑھ پر ہی منحصر نہیں ہے۔ چنانچہ اس تمہارے شہر بمبئی میں بھی ہزاروں آدمی ایسے ملیں گے۔ جن میں اکثر لامذہب ہوں گے۔ اور سینکڑوں نیچری "تارک الصلوٰۃ"۔ لیکن ان واقعات و حالات پر تو کوئی کبھی نظر نہیں کرتا۔ جہاں علیگڑھی پارٹی کا نام آیا۔ تو بلا سوچے سمجھے اور بغیر حقیقت حال دریافت کئے۔ کفر کے فتووں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ بقول شاعر ؎

ہر بلائے کز آسمان آید۔ گرچہ بر دیگرے قضا باشد٭ بر زمیں نارسیدہ می پرسد۔ خانۂ نیچری کجا باشد

علیگڈھ مسلم کانفرنس کے جلسہ میں شریک ہونے کے سبب بی بی پر طلاق کا جواز

نواب محسن الملک ایک مرتبہ کانفرنس مذکور کے ساتھ بمبئی گئے۔ تو آپ نے اپنے لیکچر میں فرمایا۔ کہ صاحبو۔ ملحد۔ بیدین۔ نیچری اور دشمن اسلام کے معزز خطاب بمبئی سے ہم کو نہ ملے۔ لیلیٰ پر عاشق ہونا۔ اور مجنون ہونا ذرا مشکل کام ہے۔ ہمیں ایک زمانہ سر پر پتھر کھاتے اور زخم پر زخم اٹھاتے گذرا ہے۔ تب کہیں یہ خطاب پائے ہیں۔ وہ کون مقام ہے۔ کہ جہاں یہ مسلم کانفرنس گئی۔ اور ہم نعوذ باللہ مسلمانوں کے دشمن قرار نہ دیئے گئے۔ ایک مرتبہ کانفرنس سے تین ماہ پیشتر میں نے شمالی ہند کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا تھا جب دہلی پہنچا۔ اور ٹاؤن ہال جلنے لگا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ دو منکر نکیر دروازہ پر کھڑے وعظ فرما رہے ہیں۔ اور یہ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں۔ کہ دیکھو مسلمانو۔ جو اس مجمع میں شریک ہوگا۔ وہ اسلام سے خارج ہوگا۔ اور جب اسلام ہی باقی نہ رہا۔ تو تمہاری بیبیوں کو بھی طلاق ہو جائیگی[۱]۔ یہ سنکر میں نے اپنے دل میں کہا کہ نوجوان تو اس فتوے کو سن کر خوش ہوں گے۔ کہ چلو چھٹی ہوئی۔ کوئی دوسری اچھی سے اچھی بیوی اپنی پسند کے لائق تلاش کرلیں گے۔

پس اس وقت تو میں چپکا نکل گیا۔ لیکن جب ہال میں پہنچا۔ اور تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ تو سب سے پہلے اپنے مہربانوں کا کفر کے فتووں کے صلہ میں شکریہ ادا کیا۔ اور ان سے کہا کہ کیا کفر کے فتوے پتنگ کے کاغذ سے بھی زیادہ ارزاں ہوگئے۔ ہم کو جو چاہو سو کہو لیکن اے مہربانو۔ خدا کے لئے جھوٹ تو نہ بولو۔

سچ کہو کہ آتا تو ہے "مہدی" اور تم کہتے ہو کہ دجال آیا۔ دجال آیا۔ لاحول ولا قوۃ۔

---

[۱] حال میں کسی لاہوری مولوی نے اخبار زمیندار کے متعلق بھی یہی فتویٰ دیا تھا۔ کہ جو اس کو پڑھیگا۔ اس کی بی بی پر طلاق جائز ہو جائیگی۔

یونیورسٹیوں کی تعلیم کے متعلق مولوی نذیر احمد کا ایک چٹکلہ

یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جو ٹکڑا ایٹرا علم کا وہ دیتی ہے اسی کو ہم کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو۔ ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی۔ جبکہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائینگے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا تاج سر پر یونیورسٹیوں کی تعلیم ہم کو صرف ٹھپی بناتی ہے۔ اے دوستو۔ میں خود بھی انہی میں ہوں۔ کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی جائے۔

خدا ہم کو ایسا نیچری بنائے

نواب محسن الملک ایک جگہ فرماتے ہیں۔ کہ انگریزی قوم جو آج کل اتنی ترقی کر گئی ہے۔ کچھ زمانہ پہلے وہ بالکل وحشی تھی۔ اور ہم مسلمان علم و تمدن میں ان پر فائق تھے۔ چنانچہ ہم نے پانسو برس تک انہی عیسائیوں کو تعلیم دی ہے۔ لیکن جب آج ہم اپنی قوم کو انگریزی پڑھانے کی طرف ارادہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں یہ الزام دیا جاتا ہے۔ کہ ہم مسلمانوں کو نیچری بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ الزام کچھ نیا نہیں ہے۔ جب کبھی کسی قوم میں علم کی روشنی پھیلائی جاتی ہے۔ تو ایسا کرنے والوں پر یہ الزام ضرور تھوپا جاتا ہے۔ انگریزوں سے دریافت کرو۔ کہ ان کے ہاں کیا حال تھا۔ پیرس کی سب جگہوں اور سڑکوں پر جو غلاظت پڑی رہتی تھی۔ اس کو واجب قرار دیا جاتا تھا۔ اور ان کے پادریوں کی یہ عادت تھی۔ کہ مہینوں اور ہفتوں

کبھی نہانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اگر کوئی تیسرے چوتھے اتفاقیہ نہا لیتا تو اُسے مسلمان کہا جاتا تھا!! اور جس وقت اٹلی کے باشندے مسلمانوں سے عربی زبان کے علوم کی تعلیم پاکر اپنے ملک کو واپس جاتے۔ تو پادری کہتے کہ وہ شیطان ہو گیا۔ کافر ہو گیا۔ مسلمان ہو گیا۔ اسی جرم میں بہت سے آدمی جلا وطن کئے گئے۔ تاکہ ان کے فاسد عقائد کا اثر اور عیسائیوں پر نہ پڑے۔ آہ یہ کیا انقلاب کا زمانہ ہے۔ کہ اب ہمارے لئے انگریزی کا پڑھنا ضروری ہے۔ مگر جو مسلمان انگریزی پڑھتا ہے۔ اس کو کافر اور نیچری کہا جاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا سب کو ایسا کافر اور نیچری بنائے جس کے معنی ہیں۔ غیر متعصب روشن خیال مسلمان!!

رسومِ بد کی مذمّت

نواب محسن الملک نے محمڈن کانفرنس کے ایک لیکچر میں فرمایا کہ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے دستورات نہایت ہی نامعقول ہیں۔ اوّل تو بڑا مقصود نکاح کا یعنے رضامندی طرفین یہ کبھی حاصل ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ نہ مرد عورت کو دیکھنے پاتا ہے۔ نہ عورت مرد کو۔ محض لیؤمنون بالغیب پر نکاح کا دارومدار ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ مرد عورت دونوں نکاح سے ناراض ہیں۔ مگر شرم و خوف سے کچھ بول نہیں سکتے۔

علین نکاح کے وقت جو نامعقول رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ وہ تو ذکر کرنے ہی کے لائق نہیں ہیں۔ اگر ہندوستان کا دولہا پھولوں کا سہرا سر پر ڈالے۔ سرخ جوڑا پہنے۔ آنکھوں میں کاجل لگائے۔ اور ہاتھ پاؤں میں مہندی ملے ہوئے ایک ٹٹو پر سوار ولایت کے کسی تھیٹر میں کھڑا کر دیا جائے۔ تو غالباً سارا شہر اس کو ایک عجیب تماشہ سمجھ کر دیکھنے کو جمع ہو۔

پھر فضول اخراجات شادی کے اور کھانا بانٹنا یا عام گروہ کو بھیڑ بکریوں

کے ریوڑ کی طرح اکٹھا کر کے کھانا کھلانا کیسی نامعقول رسم ہے۔ اس پر قصبات و دیہات کی رسمیں تو اور بھی زیادہ وبال جان ہیں۔ شرم اس کا نام ہے کہ عورت مرجائے پر کسی کے سامنے اپنے خاوند سے نہ بولے۔ وہ بوڑھی ہو جائے۔ مگر ماں باپ کے ہوتے کبھی گھر کا انتظام نہ کرے۔ اگر بھولے سے وہ کبھی خاوند کا نام لے لیتی ہے۔ تو نکاح ہی ٹوٹ جاتا ہے!!

وہ قوم کو ایک گالیاں دینے والا نہ رہا

ایک لیکچر میں نواب سید مہدی علی خاں فرماتے ہیں۔ کہ سر سید مرحوم توجہ کرتا رہا۔ مرثیہ پڑھتا رہا۔ چیختا چلاتا رہا۔ اور بہت فریاد و زاری کی جب کبھی قوم کچھ متوجہ ہوئی۔ اور اس کی مدد کی۔ مگر صرف چند ایک لوگوں نے۔ ہم لوگ جو اس کے متبع۔ مقلد اور دوست کہلاتے ہیں۔ ہم نے بھی اس کے جیتے جی کسی قدر اعانت کی۔ مگر جیسے کہ چاہئے تھی۔ ویسی ہم سے بھی اس کی اعانت نہ ہو سکی۔ اب وہ اٹھ گیا۔ جو ہماری راہ نمائی کیا کرتا تھا۔ جس کی تحریک سے ہم رفاہ کے کاموں میں سرگرمی ظاہر کرتے تھے۔ اور بہت جوش دکھایا کرتے تھے۔ اس کی تمنا جس سے قوم کی ترقی وابستہ تھی۔ آہ وہ ناتمام رہ گئی کوئی قوم کا لیڈر۔ کوئی مسلمانوں کا رہنما۔ کوئی قوم کا دردخواہ۔ اور اس میں درد پیدا کرنے والا نہ رہا۔ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ کوئی قوم کو گالیاں دینے والا نہ رہا!!

شائستگی و تہذیب کے کیا معنی ہیں

مسٹر سید محمود کا ایک اردو رسالہ تہذیب و شائستگی کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ آپ اس میں تہذیب کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ آج کل شائستگی و تہذیب پر بہت بحث ہو رہی ہے۔ اور عام مسلمانوں میں اس کی نسبت ایک گرم مباحثہ قائم ہے۔ کوئی طرز لباس کو شائستگی پر بہت مؤثر سمجھتا ہے۔ اور کوئی کھانا کھانے کے طریقوں میں تبدیلی

کئے جانے کا خواہاں ہے۔ کسی کو ایک بات مہذب و شائستہ معلوم ہوتی ہے۔ دوسرا اُس کو غیر مہذب و ناشائستہ ٹھیراتا ہے۔ کوئی اپنی گھیتلی جوتی اور جبہ و دستار میں خوش ہے۔ کہ شائستگی راہ یہی ہے شاید۔ اور کوئی فُل بوٹ (انگریزی ڈریس) کا چڑھائے اپنے کوٹ پتلون پر غرا کر رہا ہے۔ کہ اصل سولیزیشن (تہذیب و شائستگی) یہی ہے۔ مگر میری دانست میں یہ سب نکمے اور فضول جھگڑے ہیں۔ "اصل شائستگی محض خیال کی شائستگی ہے"۔ یعنی جس کے خیالات مہذب و آراستہ و پیراستہ ہیں۔ وہی ایک شائستہ انسان ہے۔ خواہ وہ کھانا کسی طرح سے کھائے۔ یا ایک مشرقی لباس میں ہو۔ یا مغربی پوشاک میں۔

میرا خیال ہے۔ کہ سید محمود صاحب شاید اس اعتقاد کے مطابق تمام عمر مکمل جنٹلمین بنے رہے۔ اور محض اپنے خیالات ہی کی شائستگی پر نازاں رہے حسن عمل سے انھیں چنداں سروکار نہ تھا۔ اگر یہی نکتہ نظر سرسید کا بھی ہوتا۔ تو یقین رکھو۔ کہ علیگڈھ کالج اور حال کی اسلامی تحریکوں کا مسلمانوں میں وجود تک بھی نہ ہوتا۔ یعنی سب کے سب کوٹ اور پتلون پہنے اپنی شائستہ خیالی پر ہی کرتے پھرتے ؎

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

حضرت بسمل کی شاعری کی داد

۱۸۹۵ء میں شاہجہان پور کی محمڈن کانفرنس میں مولوی رضی الدین صاحب بسمل نے ایک دردانگیز نظم پڑھ کر سنائی۔ تو اس پر نواب محسن الملک نے یہ ریمارک کیا۔ کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت نے اپنا تخلص تو بسمل رکھا ہے۔ مگر نظم ایسی پڑھی کہ گویا دوسروں کو بسمل کر دیا۔

ایک مرشد صاحب کی کہانی نواب محسن الملک کی زبانی

ایک شہر میں کسی نادان آدمی کو جو ذرا شاندار اور متین بھی تھا۔ کئی شخصوں نے ملکر اپنا

مرشد بنالیا۔ ایک جگہ لیجاکر بٹھادیا۔ اور لگے اس کی خدمت و اطاعت کرنے۔ یہاں تک کہ اس کی بزرگی و خدارسی کا شہرہ بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا۔ اور اس کو شاہ صاحب کی قدمبوسی کا اشتیاق پیدا ہُوا۔ جب ان مریدوں کو معلوم ہُوا۔ تو انہوں نے اپنے سادہ لوح پیر کو یہ سمجھانا شروع کیا۔ کہ جب بادشاہ آئیں تو خبردار ان کی تعظیم کے لئے کھڑے مت ہونا۔ جو کچھ ہو گا۔ ہم سب دیکھ لینگے۔ صرف تم خاموش بیٹھے رہنا۔ اور قُل کہہ دینا۔ غرضکہ اس کو سمجھابجھاکر بادشاہ کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ جب بادشاہ سلامت تشریف لائے تو سطوت وجلال شاہی سے درویش کا بدن کانپنے لگا۔ بادشاہ نے کہا۔ اللہ اکبر شاہ صاحب تو بڑے بزرگ اور خدارسیدہ ہیں۔ جب درویش صاحب کو کسی قدر افاقہ ہُوا۔ تو قُل کہنا بھی بھول گئے۔ بجائے اس کے بُل بول اُٹھے۔ بادشاہ نے مریدوں سے دریافت کیا۔ کہ شاہ صاحب کیا فرماتے ہیں۔ بُل علی الدنیا یعنی بول (پیشاب) ہے دنیا پر۔ غرض کانفرنس کا پریزیڈنٹ بھی ایک قسم کا پتلا ہوتا ہے۔ کہ جس کے بنانے اور چلانے والے اور ہوتے ہیں اور وہ خود کچھ نہیں ہوتا

خطاب بہ مسلمانانِ ہندوستان

ایک دفعہ نواب محسن الملک نے مسلمانوں سے یوں خطاب کیا۔ اے مسلمانو۔ تم بھی ہٹے کٹے ہو۔ اور مضبوط ہاتھ رکھتے ہو۔ جیسے ہندو۔ آنکھیں رکھتے ہو مثل عیسائیوں کے اور کان بھی رکھتے ہو جیسے کہ پارسی۔ پھر اگر تم ہاتھ پاؤں نہ ہلاؤ۔ آنکھوں کو خود ہی بند کرلو۔ کانوں میں روئی ٹھونس لو۔ اور ایک بے حس وحرکت لاش کی طرح پڑے رہو۔ تو کوئی تمہاری لاش کو کیوں اُٹھانے لگا۔ البتہ تمہارا دم نکل جانے پر تم کو کسی قریب کے قبرستان میں لے جاکر دفن کردیا جائے گا۔ تمہاری تو وہ مثال ہے۔ کہ ایک آرام طلب آدمی کسی درخت کے نیچے لیٹا تھا۔ مکھیاں منہ پر بھنک رہی تھیں۔ ایک سوار ادھر سے گذر رہا تھا۔ آواز دی۔ کہ اللہ میرے حال پر رحم کرو

اور میرے پاس آؤ۔ جب سوار گھوڑے سے اُتر کر آیا۔ اور اس کی حالت پر ترس کھا کر کہا۔ جو خدمت مجھ سے لینا چاہو۔ میں حاضر ہوں۔ تو اس آرام طلب آدمی نے گڑگڑا کر کہا۔ کہ ذرا میرے منہ پر کی مکھیاں ہٹا دو۔ سوار نے سنا اور دیکھا۔ کہ نہ کوئی زخم ہے۔ نہ گہاؤ نہ اور کوئی صدمہ بلکہ حد درجے کی کاہلی ہے تو اپنی جوتی پیر سے نکال کر اس مردار کے سینکڑوں رسید کیں اور پھر اپنی راہ لی۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ قریبًا یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ کہ جس کو بغیر کاہلی اور سستی کے اور کوئی روگ نہیں ہے۔

سر سیّد مرحوم کے فرزند ارجمند سید محمود اسکوائر بیرسٹر ایٹ لا کا تعلیمی لیکچر

یہ معرکۃ الآرا لیکچر ۱۸۹۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آٹھویں اجلاس میں سنایا گیا تھا۔ اس میں حاضرین کو ہنسانے اور رلانے ان دونوں باتوں کا بخوبی اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم اس کا ایک اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔ لیکچرار صاحب کی تقریر یوں شروع ہوتی ہے اے صاحبو۔ جبکہ ممالک بنگال و مدراس و بمبئی میں ہندوؤں کے شرفا اپنی اولاد کو انگریزی علوم و فنون کی تعلیم دینے کے لیے گرم جوشی سے سعی کر رہے تھے۔ ہماری قوم کے لیں ماندہ نواب زادوں اور امیر زادوں کی یہ حالت تھی۔ کہ تحصیل علوم دینی و دنیوی کو محض روٹی مانگنے والے طالب علموں کا کام سمجھتے تھے۔ اور یہ بات اپنی شان کے منافی خیال کرتے تھے۔ کہ وہ بھی طلب علوم کریں۔ حالانکہ ان کی تمدنی و اخلاقی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ کہ الامان۔ وہ بہبودئی قوم سے ناآشنا۔ زمانہ کے انقلاب سے اور آثار روزگار سے بالکل بے خبر۔ جو کچھ بچا کھچا تمول رہ گیا تھا۔ وہ اپنے باپ دادا کی اس کمائی ہوئی دولت کے گھمنڈ پر اس قدر نازاں تھے۔ کہ گویا یہ شعر ان کے حسب حال تھا۔

مارا بجہاں خوشتر ازیں یکدم نیست + کز نیک و بد اندیشہ و از کس غم نیست

امیر تو امیر متوسط الحال مسلمان بھی اس وقت ایسے مردہ دل اور خستہ جان ہو رہے تھے کہ کسی کو کسی کے حال کی خبر نہ تھی۔ نحوست اور کاہلی سب پر طاری تھی۔ اور اس کا نام انہوں نے بزعم خود قناعت رکھ چھوڑا تھا۔ اور مفلوک الحالی کو وہ لوگ درویش منشی سمجھنے لگے تھے۔ تحصیل زبان انگریزی کو خلاف مذہب اسلام بتایا کرتے۔ اور اس کے ذریعہ سے روٹی کمانا گویا ایک سفلہ پن تھا۔ اور اس شعر پر ان کا دار و مدار تھا ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

اس زمانے میں ہمارے بزرگوں کے خیالات کیا تھے۔ اور وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے کیا کیا کرتے تھے۔ وہ ان کے بچوں کی زبانی اسی دعا ہی سے ظاہر ہے ؎

کریما بہ بخشا بر حال ما ۔ کہ ہستیم اسیر کمند ہوا

یہی بچے اپنے مربیوں اور سرپرستوں کی اپنی طرف سے بیحد لاپروائی دیکھ کر کہا کرتے تھے ؎

نداریم غیر از تو فریاد رس ۔ توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

مگر جو لڑکے عم کا پارہ پڑھ کر ذرا ہوشیار ہوتے۔ اور آمد نامہ کی رٹ لگایا کرتے۔ اور اپنے عنفوان شباب کی آمد سے بھی کچھ آگاہ ہوتے تو وہ اپنے حسب حال یوں پڑھا کرتے ؎

ما مقیمان کوئے دلداریم ۔ رخ بدنیا و دین نمے آریم

یا جو بچہ ذرا سیانا ہوا۔ تو وہ طباع و شاعر ہوا۔ رباعیں جمع کر کے یوں گنگنانے لگا ؎

اے داغ بر دل از غم حال تو لالہ را ۔ شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را
از انفعال لعل لبت لالہ در چمن ۔ دیگر بدست خویش نگیرد پیالہ را
آگاہ نگشت شاید گل گرچہ صد ہزار ۔ بلبل ز روئے درد کشید آہ و نالہ را

ان بیچارے معصوم و خستہ حال اطفال کو نہ یہ معلوم تھا کہ یہ باتیں کس سے خطاب کی جاتی ہیں۔ اور نہ یہ معلوم کہ لالہ کیا اور چمن کیا۔ ان کے سامنے تو اپنی ہی قوم کے افلاس اور

اور پریشانی کی وجہ سے جو منظر دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک ایسا ویرانہ تھا۔ کہ جس کو چمنستان سے تعبیر کیا گیا تھا۔ لیکن وہ کیسا چمنستان اس کا نقشہ مولانا حالی نے اپنے مسدس میں اُتارا ہے ؎

پھر اک باغ دیکھیگا اجڑا سراسر ۔ جہاں خاک اڑتی ہے ہرسو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ۔ ہری ٹہنیاں جھڑ گئی جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے رُکھ جس کے جلانے کے قابل

مگر تعجب ہے کہ جوں جوں تباہی بڑھتی جاتی تھی۔ ہم میں سہل انگاری کا مرض بھی بڑھتا جاتا تھا۔ اور ہم نے اس کی تشخیص میں اتنی غلطی کی۔ کہ اپنی بیماری کو آخر عشق کا سا ایک پرانا روگ بنالیا بقول شاعر ؎

مریض عشق پر رحمت خدا کی ۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

سوائے حضرات ایک طرف تو ہماری یہ حالت تھی۔ دوسری طرف وہ لوگ جو کسی قدر سن رسیدہ تجربہ کار اور بڈھے گھاگ تھے۔ جن سے ہمیں اپنے مرض کے دور کرانے کی اُمیدیں تھیں۔ انہوں نے ایک اور ہی وطیرہ اختیار کر رکھا تھا۔ اور وہ اپنے فلسفۂ حیات کی گتھی یوں سلجھایا کرتے تھے ؎

مکن تکیہ بر عمر ناپائیدار ۔ مباش ایمن از بازیٔ روزگار

جب ہماری قومی زندگی کا پیمانہ یوں لبریز ہوگیا۔ تو آخر قضا کار فلک کے ترکش میں ایک تیر باقی تھا۔ وہ بھی اُس نے چلادیا۔ یعنی ۱۸۵۷ء کا غدر بپا کردیا۔ ہماری جو رہی سہی کچھ طاقت تھی۔ وہ سب خاک میں مل گئی۔ اور مرے کو مارے شاہ مدار۔ ہم زمانہ کے ہاتھوں بالکل چکنا چور ہو کے رہ گئے۔ اور ہمارے وہ آسودہ حال شہزادے جن کا ذکر اس مضمون کی ابتدا میں ہُوا۔ ان کی اولاد کوڑیوں تک کی محتاج ہوگئی۔ اور بقول حالی ؎

بہت آگ چلموں کی سلگانے والے ۔ بہت گھانس کی گٹھریاں لانے والے
بہت در بدر مانگ کر کھانے والے ۔ بہت فاقہ کر کرکے مرجانے والے

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر
تو نکلینگے نسل ملوک ان میں اکثر

سرسید کی عالی حوصلگی

ایک دن ایک مولوی صاحب سرسید کے پاس آکر کہنے لگے۔ کہ میں گذشتہ ایام میں اکثر آپ کے خلاف یاوہ گوئی کرتا رہا۔ اور حال میں بھی کئی مرتبہ اسی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں۔ لیکن میں نے جھک مارا۔ گوہ کھایا۔ اب آپ میرے اس گناہ کو معاف فرمائیے۔ سرسید یہ عذر گناہ سنکر متبسم ہوئے۔ اور فرمایا۔ کہ جناب مولوی صاحب میں نے آپکی نہ صرف وہ گالیاں ہی بخشدیں۔ جو گذشتہ ایام میں مجھے آپنے دیں۔ بلکہ وہ بھی جو اب دیچکے۔ یا جو گالیاں آیندہ تم مجھے دوگے

سید محمود کا سرسید و محسن الملک کی تعلیمی ہنڈیا پکانے پر ایک لیکچر

صاحبان۔ نواب محسن الملک کے سے عالی خاندان سیّد۔ ذی علم۔ ذی وجاہت۔ ذی ہمت سوختہ جانِ قوم نے میرے باپ سرسید احمد کے ساتھ ملکر اپنی قوم کی تباہ حالت کی نسبت وہ شور و شغب مچایا تھا کہ جس سے ہماری قوم خواب غفلت سے ذرا چونک کر سوچنے لگی۔ کہ یہ کیسے کیا ہیں۔ ان کا مقصد کیا ہے۔ ان کی غرض کیا ہے۔ یہ ہمارے مراسم قدیمہ اور خیالات دیرینہ پر نکتہ چینی اور کیوں عیب جوئی کرتے ہیں۔ ان کا کسی نے کیا بگاڑا ہے۔ کہ یہ درپے جان ہوگئے ہیں۔ ان دونوں سیّدوں کو یاد الٰہی میں مصروف ہونا چاہیئے۔ اور نہ یہ کہ اس قوم کو کہ جس کا لقب سلف سے خیر الامم چلا آتا ہے۔ اُس کو غیر ضروری بحثوں کے

پیش کرنے اور نکتہ چینی کرنے سے دق کرتے ہیں۔ اور یہ جرأت کر رکھی ہے کہ

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

خواہ مخواہ کے مجمعے کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ کی تقاریر پیش کرتے ہیں۔ مولوی سید مہدی علی کا یہ حال ہے کہ بیٹھے بٹھائے اور کچھ کرنے کو نہ ہُوا۔ تو ہاتھ میں قلم لے۔ میز کرسی پر بیٹھ تہذیب الاخلاق کے لئے ایک آرٹکل دے مارا۔ اور اُس میں کیا؟ یہ مسلمانوں کی مذمت۔ مسلمان بچوں کی ذلت۔ اشرافوں کو ملامت۔ اور ہماری قوم کو ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ کا مصداق ٹھہراتے ہیں۔ یہ کیا سید احمد اور سید مہدی چانول اور مونگ کی طرح سے ملکر پانی ڈال بے نون و نمک کی سیٹھی کھچڑی پکا رہے ہیں؟ اور اپنی مٹی کی ہنڈیا کو کہہ بدا کر بریانی اور مزعفر کی دیگ قرار دیتے ہیں؟ اور پوچھو کہ صاحب اس میں کیا کہہ بدا رہا ہے اور کیا پک رہا ہے؟ تو جواب دیتے ہیں۔ کہ یہ سامان اُس خوانِ نعمت کی طیاری کا ہے۔ کہ جس کو علمائے قدیم اور حکمائے سلف روحانی نعمت قرار دیتے آئے ہیں۔ یہ وہ طعام لاکلام ہے۔ کہ جس کے نوش کرنے سے مسلمانانِ خستہ جان کی رگ و پے میں قوت آ دے گی۔ اُن کے دل و جان تر و تازہ ہوں گے۔ ان کے دماغ میں روشنی اور کمر میں ہمت آ دیگی۔ اور جو اس خوان نعمت کی دعوت میں شریک ہوں گے۔ وہ ایسے تنعم کی حالت میں ہو جاویں گے۔ کہ جس سے قوم اسلام پھر بلند پایہ اور فرخندہ حال قوموں میں شمار ہو گی۔ ان دونوں سیدوں نے اس مٹی کی ہنڈیہ کی طیاری کا ظاہری سامان یہ کیا۔ کہ ایک تو اُس کے نیچے آگ جلائے۔ اور دوسرا ہے۔ کہ دھونکنی لے کر اُس کو پھونکتا چلا جاتا ہے۔ اور آگ سے کہ گوسیلے ایندھن ہونے کی وجہ سے ایسا دھواں دیتا ہے۔ کہ دونوں کارستانیوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے

جاتے ہیں۔ تاہم کیمیاگر کی طرح سے آگ کو سلگائے جاتے ہیں۔ اور مٹی کی ہنڈیہ دن بدن زور شور سے کھد بداتی جاتی ہے۔ اور ہنڈیہ کے کھلنے سے پہلے ہی ہمارے علمائے کبار نے اس متعلق مسئلہ پر از روے علوم فقہ و معقولات و منقولات توجہ فرمانی شروع کی کہ آیا وہ طعام لاکلام جو اس مٹی کی ہنڈیہ کے شکم کے اندر کے درمیان کی بیچ میں متمکن ہو کر کھد بدا رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ان دونوں سیدوں نے شور و غل مچا رکھا ہے۔ وہ از روے فقہ احاطہ حلت میں داخل ہے۔ یا اُسکی حرمت کا فتویٰ دینا چاہئے۔ حکمائے روزگار اس فکر میں پڑے۔ کہ آیا اس طعام لاکلام کا لو فرضا کہ کھانا حلال بھی ہو تاہم یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ آیا اس کے نوش کرنے سے پیٹ میں درد ہوگا یا کہ نفاخی کرے گا۔ غرضیکہ جبکہ ہماری قوم کے علما اور حکما انہیں مسائل دقیقہ کے حل کرنے پر متوجہ تھے۔ اس مٹی کی ہنڈیہ کھد بدانے والے اپنی کارستانی سے باز نہ آئے۔ اوہر تو مٹی کی ہنڈیہ کو کھد بدائے جاتے ہیں۔ اور ادہر بچارے مسلمانوں کی قوم میں کھلبلی ڈالے جاتے ہیں پس ہرگاہ کہ اکابر قوم۔ علماء و فضلاے ملت۔ عقلا و حکماے روزگار اس مٹی کی ہنڈیہ کے طعام لاکلام کی حقیقت آموزی میں مصروف تھے۔ اور ہماری قوم کے طباع و منشیانِ بے بدل اپنی بلاغت کو طعنہ زنی اور حقارت آمیز کلمات سے سخن آرائی کر کے کام میں لا رہے تھے۔ ہم سے وال بچارے سیدہے سادے مسلمان ان بحثوں اور تقریروں اور ہنگاموں کو سنکر اور دیکھکر صرف حسب ذیل یہ کہتے تھے کہ ؎

این چہ شور یست کہ در دورِ قمر مے بینم ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

اور بعضے دیرینہ سال اور کار آزمودہ بزرگ ان دونوں سیدوں کی کارستانی کو سنکر یہ کہتے تھے۔ کہ سچ کہا ہے کسی نے جسنے کہ یہ کہا ہے کہ ؎

ہر جا کہ جمع آمد قوم سادات فساد است فساد است فساد است

اور سنیے کہ جب با این ہمہ ساز و سامان وہ مٹی کی کھدبداتی ہوئی ہنڈیہ تیار ہوئی۔ اور اس دعوت کے مہمان اُس خوانِ نعمت کے گرد ہاتھ دھو کر بامید بریانی و مزعفر بیٹھے

تو ہنڈیا پکی۔ اور کیا نکلا؟ وہی مونگ کی اُبلی بے نون نمک سیٹی پھیکی کھچڑی کہ جس کے ساتھ دہی اور نہ نمکین۔ نہ چٹنی نہ اچار۔ بیماریوں کا سا پرہیزی کھانا پیش نظر کیا گیا۔ کہ یہی سب سے بہتر قوم کی آئندہ صحت کے لئے عمدہ غذا ہے۔ **اے صاحب** اِس کا نام کیا ہے؟

جواب یہ اعلیٰ تعلیم علوم وفنون انگریزی ہے۔

یہ سننا تھا۔ کہ ہماری قوم کے گرسنہ موعودین نے اور شور و شغب مچایا۔ کہ واہ واہ واہ! یہ کیا طعام ہے! اور یہ کیا کلام ہے۔ یہ کیا دعوت ہے۔ اور یہ کیا سخاوت ہے۔ اور اس سے متنفر ہو کر منہ موڑا۔ مگر مسلمانوں کی تعلیم کی کمیٹی ۱۸۷۰ء والی نے اور شور اپنا دوبالا کیا۔ بقول شاعر ؎

صبحدم چون در دہد دل صور شیون زاے من آسمان صحن قیامت گردد از غوغاے من

اور اپنے مقصود دلی اور محبوب قلبی یعنی اپنی قوم کی بہتری کے عشق کو اپنے دل سے نہ بھلایا اور اُسکے فراق میں اور گریہ وزاری کی آواز کو بلند کیا۔ بقول شاعر ؎

عُرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن

ادھر تو تکفیر اور الحاد کے فتوے اُدھر اپنی قوم کے ہاتھ سے ملامت اٹھاتے جاتے تھے مگر اپنے نوحہ اور گریہ وزاری سے باز نہ آتے تھے۔ اور رونے کے ساتھ یہ چلاتے تھے ؎

دست از طلب ندارم تا کارِ من برآید یا تن رسد بہ جاناں یا جان ز تن برآید

اور جب کہ دیکھا۔ کہ قوم نے بہت شور و غل مچایا۔ اور مبادا ہمارے دردِ دل کی شنوائی نہ ہو انہوں نے خود ہی یہ استادی کی۔ کہ ہماری تو کچھ شنوائی ہوتی نہیں ہے۔ قوم خوابِ غفلت میں پھر گرفتار نہ ہو لے پا جھے۔ خود اپنی نوحہ سرائی کے ساتھ اُس کی ڈیوڑھی پر ایک نقارخانہ قائم کیا کہ ؎

ز نقارہ آواز آید بروں + کہ دون ست دون ست گردونِ دون

تا کہ اس کی آواز دور دور تک پہنچے۔ اور لوگ پوچھیں۔ کہ یہ کس کی برات ہے؟

(سید محمود)

سرسید کی فارسی شاعری

سرسید کا تخلص آہی تھا۔ جیسے کہ ان کی اردو شاعری کے بیان میں اوپر بتایا جا چکا ہے۔ اب ...رہ گلستان میں ان کی دو ایک فارسی غزلیں بھی نظر سے گذری ہیں۔ جو درج کی جاتی ہیں۔ ...غزلوں کو نقل کرنے سے پیشتر تذکرہ مذکور کا مولف لکھتا ہے۔ کہ سرسید جس وقت صدر امین تھے ...پ نے ایک رسالہ رد ابطال حرکت زمین ایسا لکھا تھا۔ کہ اگر بزعم اہل فرنگ زمین متحرک ...ی ہو۔ تو آپ کی متانت براہین و استحکام دلائل کی وجہ سے نقش پا کی طرح حرکت کرنے ...سے باز رہے گی۔ نہ معلوم مرزا صاحب مولف گلستان سخن نے یہ جملہ کس بنا پر لکھا تھا۔ کیونکہ ...سید بیچارے کا کیا مقدور تھا۔ کہ اس کی اثابت رائے کی وجہ ہی سے زمین اپنی حرکت ...سے باز آ جاتی۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں۔ کہ وہ خود ہی اپنے اس غلط خیال سے باز آ گئے تھے۔ ...در اخیر میں اپنی اس غلطی کو تسلیم کر لیا تھا۔

غزلیات فارسی سرسید

...شاہد رعنائے دہر ہا نہت دیگر گرفت | دلبر زیبائے باغ چہرہ زیور گرفت

...ل ز بالیدگی میکدہ مینا و کرد | ساقی ما از نشاط جام بہ کف در گرفت

...ہم ز پے شاہدان جملہ بر آراست باغ | ہم پے سودائے مے غنچہ بہ کف زر گرفت

...شب بہ خرد زندگی طعنہ بر روز زد | شام بہ تابندگی خردہ بہ سحر گرفت

...آہی خستہ جگر گشت چوں مداح شاہ | جا بہ سر ماہ اش تاج ز عنبر گرفت

...اختر بختم نگر چوں ز نحوست رہا | گرہ یکے عقدہ است عقدہ دیگر گرفت

...دو تو وقف سخن بزل تو صرف ہنر | ہر چہ گفتہ برفشاند جملہ سخنور گرفت

ولہ

...ل در خم گیسوئے پریشان تو پابند | جانہائے دو عالم ہمہ خواہان تو پابند

گر راز بجو بیند نہ سرشتہ جانہا   موئے ز سر طرہ پیچاں تو یابند
طومار شفاعت چوں دم حشر کشایند   حرفے است کہ از دفتر دیوان تو یابند
باشند بہ جمعیت خاطر بدم حشر   آنانکہ سر زلف پریشان تو یابند
خاکم چو بجویند بہ میدان قیامت   افتادہ بہر گوشہ داماں تو یابند

سحرے کہ برد غیرت اعجاز مسیحا
رمزے است کہ در نرگس فتان تو یابند

سرسید کے ایک اعتراض کا جواب

ایک موقع سر سید نے بطور تجاہل عارفانہ رپورٹ کی تھی۔ کہ ہماری محمدن کانفرنس نے آج تک کچھ نہیں کیا۔ اور جو کچھ کیا بھی ہے۔ وہ بالکل بے حقیقت ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں نواب محسن الملک بول اُٹھے۔ کہ آپ نے یہ جو فرمایا ہے۔ کہ کانفرنس کچھ نہیں کرتی۔ اور ہر سال قوم کی برسی کو جمع ہوتے ہیں۔ گویا ایک مردہ قوم کی خاتمہ پڑھنے کو آتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عظیم الشان انسٹیٹیوٹ جو علیگڈھ میں قائم ہوا ہے۔ وہ اسی کانفرنس کی بدولت قائم ہوا ہے۔ اگر اس کانفرنس کی کوشش اور قوم نے مدد نہیں کی۔ تو کیا یہ کارخانہ (علیگڈھ کالج) آپ کی دعا سے قائم ہو گیا۔ حالانکہ آپ کو اس سے بھی انکار ہے (یعنی سر سید تاثیر دعا کے چنداں قائل نہ تھے۔) اور کیا یہ عظیم الشان کارخانہ کوئی وجود حقیقی بھی رکھتا ہے؟ یا بالکل طلسم و جادو و نظر بندی کا ہے؟ حالانکہ آپ نہ طلسم و جادو کے قائل ہیں۔ نہ نظر بندی کے (قہقہہ) جس وقت یہ خیال کیا جائے۔ کہ جو کام آپ نے قوم سے لیا۔ قوم کی عادت قوم کی رسم و رواج اور قوم کے مذاق سے کچھ بھی مناسب نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ شدید تعصب شدید جہالت اس کی مانع و مزاحم تھی۔ تو اتنی کامیابی پر بھی مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔ اور میں ایسی منطق کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ کہ جس منطق کو استعمال کر کے آپ نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ کانفرنس کچھ نہیں کرتی ہے۔ شاید آپ کی رپورٹ جو اس امر کے متعلق ہے۔ کچھ مخالفانہ

معلوم ہو۔ مگر دراصل وہ ایسی نہیں ہے۔ اور جس طرح کسی نسخہ میں کوئی حکیم گرم دوا لکھدے اور دوسرا حکیم اس کے معتدل بنانے کے لئے سرد دوا ملاتے۔ کہ اس کی حدت کو کم کرے اسی طرح میں ان گرم دواؤں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہ سنکر سر سید نے ستم ظریفانہ فرمایا۔ کہ حضور کہیں معاملہ ہی سرد نہ ہو جائے۔ (قہقہہ) معاً نواب صاحب نے پھر بیان کیا۔ کہ سر سید کہتے ہیں۔ کہ قوم مر گئی ہے اور سڑ گئی ہے۔ اس داغ کو اپنے دامن سے دور کرنے کے لئے آپ کوشش کریں۔ اور اگر آپ اس کے لئے دس روپیہ ماہوار بھی نہ دے سکینگے۔ تو قوم فی الواقع مر چکی ہے۔ اور اس کی لاش سڑ رہی ہے۔ مگر مسلمانوں میں نماز جنازہ پڑھنا فرض ہے۔ اگر تم قوم کے مردہ کو کفنانے اور دفنانے کے لئے دس روپیہ بھی نہیں دے سکتے۔ تو آپ چاہیئے۔ اس کی تجہیز و تکفین تمہیں اس کی کیا پرواہ پارسیوں کے مردوں کو جیسے گدھ کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری قوم کی لاش کو بھی اگر گدھ کھا لیں۔ تو کچھ مضائقہ نہیں !!

محمدن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء

یہ کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ تو اس کے پریزیڈنشل ایڈریس میں مسلمانان سندھ کے تعلیم حالات کو پیش کرکے بتایا گیا۔ کہ شاید سب سے زیادہ جاہل اور کندہ ناتراش سندھ کے مسلمان ہیں۔ کہ جو الف کے نام لٹھ بھی نہیں جانتے۔ اور جن کی تعلیمی پستی اس حد تک پہنچ چکی ہے۔ کہ ایک دفعہ ہمارے معتبر و ثقہ دوست نے بیان کیا۔ کہ ایک دن کسی مقام پر تین سندھی نوجوان موجود تھے۔ میں نے ان کی اسلام روایات سے انتہا درجے کی ناواقفیت دیکھی تو امتحاناً ان سے یہ سوال کیا کہ تمہارا نبی کون ہے۔ ایک نے کہا امام حسین۔ دوسرے نے کہا فیض محمد خان میر خیرپور سندھ اور تیسرے نے کہا۔ کہ پیر پگارا !!

آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اس وقت سندھ کے مسلمانوں میں مذہبی تعلیم کا

کیا حال ہوگا۔

علیگڈھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز

ایک دفعہ صاحبزادہ آفتاب احمد کو یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ اس کالج کو ضرور بالضرور یونیورسٹی بنا دیا جائے۔ اس منصوبے سے وہ مسٹر بیگ کو اپنے ساتھ لے کر نواب محسن الملک کے پاس گئے آپ نے اس تجویز پر مسکرا دیا۔ اور ان سے کہا۔ کہ یہاں کالج ہی کے قیام کے لالے پڑے ہیں۔ تم دونو محمڈن یونیورسٹی بنانے کی ہنڈیا پکاتے ہو۔ اجی یہ کیسی شیخ چلی کی سی باتیں ہیں۔ کہیں کچھ جنون تو نہیں ہوگیا۔ سرسید کو زمانہ موافق آیا۔ وہ اپنی لگاتار کی کوشش سے صرف سات لاکھ جمع کر سکے۔ کیا ایسے نازک وقت میں تم سے دس لاکھ جمع ہو سکیگا؟

این خیال است و محال است و جنون

یہی ملیوہی مولوی نذیر احمد کو بھی ہوئی تھی۔ لیکن آخر کار مسلم یونیورسٹی بن گئی۔ قوام نہ سرسید نے دیکھا۔ اور نہ نواب محسن الملک نے کہ جن کی یہ خاص تمنا تھی ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

نواب محسن الملک کا اعتراف الحاد

ایک مرتبہ سید مہدی علی نے فرمایا۔ کہ محمڈن کانفرنس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ تو نیچری ملحدوں اور لامذہبوں کا جلسہ ہے۔ اگر نیچریت والحاد اسی کا نام ہے۔ اور کہ لامذہبی اسی کو کہتے ہیں کہ خدا کو ایک جانیں۔ رسول کو اس کا پیغمبر مانیں۔ تمام مسلمانوں کو بھائی۔ اور عام مسلمان بھائیوں کی حالت زار پر آٹھ آٹھ آنسو بہائیں۔ اپنی قوم کو زمانہ کی اختیار کے مطابق چلنے پر آمادہ کریں جو عزت و درجہ و کمال اگلے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ اس کے حاصل کرنے کی انہیں ترغیب دلائیں۔ اور آپ کی موجودہ پست حالت پر زار زار روئیں۔ اگر ایسے لوگ ملحد ہیں۔ تو میں ہانکے پکارے کہتا ہوں۔ کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں۔ اور میں بھی ایک ایسا ہی ملحد ہوں

سرسید اور عربی زبان دانی کی مخالفت

سنہ ۱۸۹۳ء میں عربی زبان دانی کے رواج کے متعلق رزولیوشن پیش ہوا۔ تو سرسید نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور نہایت وغصے میں بھر کر کہا۔ کہ جب عمل کچھ نہیں ہے۔ تو دین دین پکارنے اور مذہبی جوش ظاہر کرنے سے فائدہ کیا"۔ یہ بات اہل محفل پر بہت گران گذری۔ تو عوام کی ناراضی دور کرنے کے لیے سید محسن الملک کھڑے ہوئے۔ اور حاضرین سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ کہ اگر کوئی اور شخص ایسی گفتگو کرتا۔ تو میں بہ حیثیت پریزیڈنٹ کانفرنس اس کو خاموش کرانے کی کوشش کرتا۔ مگر چونکہ سرسید اس کے کہنے والے ہیں۔ میں اس کے جواب میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے۔ جیسے کوئی بزرگ اپنے سے چھوٹوں کو نصیحت کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی خفا بھی ہوجاتا ہے۔ اور وہ اس امر کا ہرگز برا نہیں مناتے۔ بلکہ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ بزرگوں کا ایسا کرنا ہمارے ہی فائدہ کے لئے ہوتا ہے جیسے کہ ایک مرتبہ لوئی چہارم بادشاہ فرانس نے اپنے ایک درباری کے لاتیں ماریں۔ تو وہ اس پر فخر کیا کرتا تھا۔ اور اس نے اپنے دیوانخانہ میں اس کی ایک تصویر آویزان کر رکھی تھی۔ یا جس طرح بنارس میں کسی راجہ کے ہاں ایک تصویر تھی۔ جس میں نواب شجاع الدولہ اپنے ہاتھ سے راجہ موصوف کے خاندان کے کسی بزرگ کو کوڑے مار رہا تھا۔ وہ راجہ اس تصویر کو ہمیشہ فخر سے رکھا کرتا تھا۔ تاکہ اس سے یہ امر ثابت کرسکے۔ کہ اس کے بڑے نواب اس تھے بس آپ کو بھی سرسید اپنے قومی بزرگ کی خفگی کا کچھ برا نہیں منانا چاہیئے۔ بلکہ ان کی نصیحت کو نہایت صبر سے سننا چاہیئے۔ غرض سرسید کے مشن کو نواب محسن الملک ہی نے تا بہ تکمیل پہنچایا تھا بقولِ اشہری ؎

مہدی کے گئی دل سے نہ کالج کی لگن ... یہاں تک کہ ہوا اس کے کفن زیب بدن
پورا کیا جیسے پال نے دین مسیح ... اس نے یونہی پورا کیا سید کا مشن

علیگڈھ کانفرنس گزٹ ستمبر ۱۹۲۴ء

سرکاری ملازمت کے واسطے کشمکش

تعلیم یافتہ جماعت غالباً اس خبر کو نہایت دلچسپی اور شوق کے ساتھ دیکھے گی۔ کہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی پولیس سروس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹی کے (عہدہ) کے واسطے (جس کی تنخواہ کا آغاز غالباً دو سو روپیہ ماہوار سے ہوتا ہے)۔ حال میں تین امیدواروں کی ضرورت تھی۔ انتخاب کے واسطے ساڑھے چار سو امیدواروں نے درخواست ملازمت پیش کی۔ یہ امیدوار کس قابلیت اور اوصاف کے تھے۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ اور یقین کے ساتھ جواب دیا جاسکتا ہے۔ کہ تمام امیدوار الا ماشاء اللہ ایسے تھے۔ جو ڈ یونیورسٹی ہے کے مایۂ ناز سپوت اور قابل عزت خطاب بی اے، ایم اے ایل ایل بی سے سرفراز ہیں۔ اور اگر بالفرض ان میں سے تھوڑے ایسے ہیں۔ جو اعلیٰ تعلیم کی ڈگری نہیں لے سکے۔ تاہم ان کی تربیت اور تعلیم انہیں اعلیٰ تربیت و تعلیم یافتوں سے جدا نہیں کرسکتی۔

امیدواروں کی یہ کھیپ نہ صرف صوبہ مذکور کی جان تعلیم و تربیت ہے۔ بلکہ ان کا بیشتر حصہ رئیسوں، زمینداروں، تعلقہ داروں خطاب یافتوں اور شریف اقوام کی نسل سے روایتاً اور درایتاً زمانہ قدیم سے تعلق رکھتا چلا آتا ہے۔ غرض ان ساڑھے چار سو گل ہائے رنگارنگ میں سے (۱۲۶) کا انتخاب ہوا۔ گل چینی یہیں تک ختم نہ ہونے پائی تھی۔ کہ ان میں سے پھر تیس کا انتخاب الانتخاب ہوا۔ اور وہ وقت اب قریب ہے۔ کہ سہ آتشہ کرنے کے بعد ان میں سے (۳) قطرے دیکھئے۔ کس کس قوم کے مشام حیات کو زندگی بخشنے والے ہیں۔ کیونکہ عہدوں کے توازن و تناسب کو برقرار رکھنے کے لئے ظاہر ہے۔ کہ دو قطرے ہندوؤں کے اور ایک مسلمانوں کے حصے میں آئیں گے۔

علم کی پستی اور ذلت کا ثبوت کیا موجودہ زمانہ سے بڑھ کر کوئی اور زمانہ دے سکے گا۔ اقتصادی حالات کے لحاظ سے دولت اور دماغی طاقت کا جو ذخیرہ اس وقت ان بیکار

امید واران ملازمت پر ملک اور قوم کا صرف ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ کم سے کم مسلمانوں کی غریب قوم کے رہنما اور ماہرین تعلیم ان حالات پر بھی کبھی توجہ کریں گے۔ اور دیکھیں گے۔ کہ قومی زندگی کو ڈھالنے کے لئے جو سانچہ ان کے پاس چلا آتا ہے۔ آیا وہی سانچہ ہمیشہ کام دیتا رہے گا۔ یا اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت بھی ہے۔ کہ نہیں اور اگر ہے۔ تو انہوں نے اس کے لئے عملاً کیا تدبیر اور فکر کی ہے۔

بالخصوص ہماری (مسلم یونیورسٹی) جو مسلمانوں کا واحد مرکز تعلیم ہے۔ ان خوفناک نتائج اور حالات پر غور کرے! کہیں اور کسی زمانہ میں حکومت کی نوکریوں نے ملک کی شکم پری نہیں کی۔ یہ امر اس کی قدرت اور امکان سے باہر ہے۔ جب تک گوناگوں فنون اور پیشوں کے قابل تعلیم نہ حاصل ہوگی۔ اور بے روزگاروں کے لئے روزی کمانے کا دروازہ نہ کھولا جاوے گا۔ ملک کی فلاح اور اس کی بہبودی کبھی خطرے سے نہیں نکل سکتی۔ تعلیم جدید کا مقصد معروف یہ ہے۔ کہ تعلیم پاکر آدمی دولت حاصل کرو۔ اور خوش رہو۔ لیکن ہندوستان میں نتیجہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ تعلیم حاصل کرو۔ اور بھوکے مرو

(مولوی انوار احمد صاحب)

مسلمانوں کی موجودہ تہذیب اور اس کا خاکہ

نواب محسن الملک اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں۔ کہ ہمارے زمانہ میں امامت کی یہ کیفیت ہے۔ کہ ہر فرقے ہر گروہ کا جدا جدا امام ہے جس کو وہ روما کے پوپ سے بھی کچھ زیادہ معصوم خیال کرتے ہیں۔ اور قرآن تو صرف تعویذ بنا کر بازو پر باندھ لینے یا مردوں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے اب رہ گیا ہے۔

آج کل کے جوگی پنے۔ شجرہ دار رہبانیت کا یہ حال ہے۔ کہ صدہا جوگی مسلمان خیالی دنیا چھوڑے ہوئے جزیہ تحصیل کرتے اور اپنی جھولیوں کو گول گول ابیض نورانی سے بھرے ہوئے دنیا داروں کو برا بھلا کہتے پھرتے ہیں۔ اور جاہل مسلمان بھی ان کو

ولی اور خدا رسیدہ سمجھ کر ان کے ہاتھوں گویا خدا کو رشوت بھیجتے ہیں۔

تبرکات اور رسوم اور تیوہاروں کا حال کسی سے کچھ چھپا نہیں۔ کہ ہر شہر میں قدم رسول۔ مولا علی کی درگاہ۔ امام حسن کی کربلا۔ حضرت عباس کا روضہ۔ اور بی بی فاطمہ کی زیارت موجود ہے۔ اور سینکڑوں مرے ہوئے ولیوں کے مزاروں پر عید گاہوں سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ ان کے تبرکات کی زیارت ہی نجات کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اور ان کے مٹی کے ڈھیروں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ اب علوم کے جاننے والا اور ان کی تحقیق کرنے والا تو ایک بھی نہیں رہا۔ چند مسائل کا بیان اس زمانے کے عالم اس طرح پر کرتے ہیں کہ عناصر چار ہیں۔ خاک۔ باد۔ آب۔ آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں۔ خاک کے اوپر آب آب کے اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے۔ اور وہ بہت بڑا کرہ ہے ناری۔ جو آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے۔ مگر چونکہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے۔ اس لئے وہاں مشتعل بھی کم ہے۔ اور اس سبب سے اس کی شکل ایلچی ہو گئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے۔ کہ ایلچی کیا شکل ہے۔ تو استاد اپنی سر سے دانی نکال کر دکھا دیتا ہے اور کہتا ہے ایسی بیچ میں سے موٹی۔ اور دونوں طرف سے پتلی پس اسی زمانہ کے عالموں کی یہ طبیعات رہ گئی ہے جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔

سرسید کی پالٹیکل پالیسی

سرسید مرحوم مسلمانوں کی سیاسی ترقی کے ہرگز خلاف نہ تھے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ گورنمنٹ سے کوئی مطالبہ اگر کیا جائے۔ تو پہلے اس کے لئے اہل قوم مسلمانوں میں قابلیت بھی پیدا کرنی چاہیئے۔ مثلاً اعلےٰ عہدوں کے لئے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ہونا لازمی امر ہے۔ اور وہ اس وقت تک عام مسلمانوں میں مفقود تھی۔ دوسرے موڈریٹ لوگوں یعنی بالمقابل گرم فریق کے ایک نرم فریق کی طرح سرکار سے بہ التجا مانگنے کی

عادت ڈالی جائے۔ نہ کہ بنگالیوں کی مانند کائیں کائیں کرنے لگیں۔ اور سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ہلچل مچا کر گویا گورنمنٹ کو پہلے مرعوب کرنے کی کوشش کریں۔ اور پھر کچھ زبردستی چھین جھپٹ کرنی چاہیں اور ملک کے بعض ناخواندہ لوگوں کو مشتعل کر کے گورنمنٹ سے اپنا حق مانگیں پھر اسی مضمون کو سرسید نے اپنی ایک سیاسی تقریر میں یوں ادا کیا ہے۔ ہم کو ایسی راہ چلنی چاہیئے۔ کہ اگر بالفرض گورنمنٹ کو ہماری طرف سے کچھ خیال ہو۔ تو اُس کو دور کریں۔ اور آپس میں پہلے دوستی پیدا کریں اور پھر جو کچھ بھی مانگیں۔ دوستی سے مانگیں۔ اور اگر کچھ کدورت ہے۔ تو پہلے اس کو صاف کریں۔ اس وقت مجھ کو امید ہے۔ کہ ہمارے شمال و مغرب اور اودھ کے کچھ ٹھ یہاں موجود ہونگے۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ ہندو راجپوت بھی موجود ہوں۔ ہمارے دوست یوسف شاہ پنجاب کے بیٹھے ہیں۔ اور پنجاب کے لوگوں کا اور وہاں کے سکھوں کا اور پٹھانوں اور مسلمانوں کا خوب حال جانتے ہیں۔ فرض کیا جائے کہ جو جوش بنگالہ میں ہوا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس سے کوئی ڈر نہیں ہے طرف سے صدا پہنچی۔ کہ حاشا وکلا نہیں ہے لیکن وہی جوش ان ملکوں میں اور راجپوتوں یا پشاور کے پٹھانوں میں پیدا کر دو۔ تو وہ لوگ کیا صرف قلم کی گھس گھس اور زبانی بک بک پر بس کرینگے نہیں اس وقت گورنمنٹ کو یہ کرنا ہوگا۔ کہ بھیجے۔ اور سنگینوں کی نوک سے تبلادے۔ کہ ان لوگوں کی اس شورش کا کیا علاج ہے۔!!

اب میں اپنی رائے بیان کرتا ہوں۔ کہ جس وقت گورنمنٹ کو یہ معلوم ہوگا بے جا شورش بعض جوشیلے مسلمانوں اور بہادر قوموں میں بھی آگئی۔ تو اس کو ا

لہ ملاحظہ فرمائیں لیکچر سرسید جو دسمبر ۲۸ء ۱۸۸۷ء میں بمقام لکھنو دیا گیا تھا۔ بعنوان قوم کو پالیٹیکل امور سلطنت میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

ت ضرور ایک قانون پاس کرنا ہوگا۔ (یعنی مارشل لاء) کہ جس سے ملک کے تمام
ں خانے بھر جاوینگے۔ اے بھائیو۔ اے میرے جگر گوشو۔ یہ حال گورنمنٹ
ور تمہارا ہے۔ تم کو سیدھے طور پر مانگنا چاہئے۔ نہ اس طرح شور و غل سے
لوے جمع ہوگئے اور اس کے کائیں کائیں کرنے۔
ا اور لطیف بات یہ ہے۔ کہ ان لوگوں کی یہ خواہش ہے۔ کہ بجٹ ہندوستان کا ہمارے
منے پیش ہو۔ اور اس میں ہماری منظوری بھی لی جائے۔ یعنی پولٹیکل کے خرچ کو ہمارے
منے مت آنے دو۔ مگر فوج کے خرچ میں ہم سے رائے لوکہ اس قدر فوج کیوں رکھی ہے۔
ئی اور مدراس میں کیوں گورنر مقرر کیا ہے۔ ان کو تو موقوف کر دینا چاہئے۔
بھی رائے دونگا۔ کہ ان کی ضرور سنی جائے۔ مگر یہ پوچھونگا۔ کہ صرف انہیں میں سے
ب بلکہ تمام ہندوستان میں سے کون بتا سکتا ہے۔ کہ نئی قسم کی جو توپیں ایجاد ہوئی
۔ ان کی دم کدھر ہے۔ اور منہ کدھر ہے۔ کوئی بتا سکتا ہے۔ کہ ایک فیر میں کیا خرچ
ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپ خیال کر سکتے ہیں۔ کہ جن لوگوں نے لڑائی کا میدان
ں دیکھا۔ اور نہ توپ کا منہ کبھی دیکھا ہے۔ کیا وہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ فوج کا بجٹ ہم
کرینگے۔ اس سے بھی لطیف تر ایک اور امر یہ ہے۔ کہ جس وقت بعض لوگوں
اخبار میں آرٹیکل پر آرٹیکل لکھے۔ کہ ریپرزنٹیٹو گورنمنٹ کا ہندوستان میں قائم
غیر ممکن ہے۔ اور ان کے وجوہ بھی نہایت قوی تھے۔ تو ان لوگوں کو اپنی بلند
ذہی سے نیچے اتر پڑتا۔ اور یہ کہنا پڑا۔ ہم کو کونسل میں بیٹھنے دو۔ چائیں۔ چائیں۔
بں کائیں۔ کرنے دو۔ چاہے ووٹ نہ لو۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں۔
س کا مطلب کیا۔ اور اس نادانی کا فائدہ کیا؟
ایک بڑی ہنسی کی بات یہ ہے۔ کہ اس پر زور دیا جاتا ہے۔ کہ ہتھیاروں کا
ن منسوخ کیا جائے۔ اور ہندوستانی والنٹیر ہوں۔ فوجی اسکول ملک میں
ہوں۔ مگر جانتے ہو۔ کہ یہ کون قوم کہتی ہے۔ اگر مسلمان اور راجپوت بھائی جن

کے باپ دادا ہمیشہ تلوار باندھتے ہیں۔ اور وہ ان کی کمر سے گو اب کھل گئی۔ لیکن ان کے دل سے اس وقت تک نہیں کھلی۔ اگر ایسی درخواست وہ کرتے۔ مناسب بھی تھا۔ لیکن یہ کون قوم درخواست کرتی ہے۔

(ایک آواز آئی۔ کہ بنگالی بزدل!) میں خود طرف دار ہوں۔ اور قبول کرتا ہوں۔ کہ گورنمنٹ کی دو عظیم غلطیاں ہیں۔ ایک ہندوستانیوں کا اعتبار نہ کر ان کے والنٹیر ہونے کی اجازت نہ دینا۔ دوسرے گورنمنٹ کی بہت بڑی غلطی ہے۔ کہ ان بہادر لوگوں کو جن کے باپ دادا لکھنے کا قلم استعمال نہیں کرتے تھے۔ بلکہ دوسرے قلم کا کام کرتے تھے۔ جس کی روشنائی سیاہی کی نہیں تھی۔ بلکہ انسان کے جسم سے جو لال روشنائی نکلتی ہے۔ وہ ان کے لکھنے کی سیاہی تھی۔ ان کو فوجی عہدے نہیں دیتی؟ (زور سے چیرز) اے بھائیو میں نے گورنمنٹ ایسے سخت لفظوں میں الزام دیا ہے۔ لیکن وہ وقت آرہا ہے کہ ہمارے بھائی پٹھان سادات۔ ہاشمی اور قریشی جن کے خون میں ابراہیم کے خون کی بو آتی ہے۔ وہ ایک دفعہ زرق برق وردیاں پہنے۔ کرنیل جرنیل اور میجر بنے ہوتے۔ انگریزی فوج میں ہونگے لیکن اس وقت تک کا انتظار کرنا چاہئیے

واقع اوہام

رسالہ اردوئے معلٰے (حسرت موہانی) انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت میں نومبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ تو اس میں سرسید کے وہ اوہام جو کانگرس کو کے متعلق تھے۔ بخوبی رفع کئے گئے۔ یہ بحث اگرچہ بہت طولانی ہے۔ لیکن ہم سرسید کے سیاسی عقائد اور ان کے خلاف جو کچھ حسرت موہانی صاحب نے لکھا ہے۔ یہاں درج کئے دیتے ہیں۔

فہرست اوہام سرسید

(۱) کانگریس کے بانی مبانی بنگالی ہیں۔ جنہوں نے اپنے ذاتی اغراض کے لئے یہ کھڑاگ گورنمنٹ کے خلاف کھڑا کیا ہے۔

(۲) بنگالی چونکہ مشرک ہیں۔ اور انگریز اہل کتاب ہیں۔ تاہم ان دونو میں فیصلہ کرنا چاہئے کہ ہم کس کے موید ہوں۔

ازالہ اوہام سرسید

(۱) نیشنل کانگریس کا بانی دیوان رگھوناتھ مرہٹہ برہمن تھا۔ اس کانگریس کا پہلا اجلاس سنہ ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ تو اس کے ۸۷ ممبروں میں صرف تین بنگالی اور دو مسلمان ممبر بھی تھے جب ہندو۔ پارسی۔ مسلمان اب اس کے ممبر ہیں۔ تو یہ بنگالیوں کی ذاتی اغراض کی ایک کمپنی نہیں ٹھیر سکتی۔ بلکہ صحیح مضمون میں ہندوستان کی ایک نیشنل کانگریس ہے۔ خود سرسید ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ تعلیم یافتہ لوگ اگرچہ تعلیم پاکر زیادہ امیر ہو گئے ہیں۔ اور گورنمنٹ پر بعض اوقات نہایت بے جا و ناواجب نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مگر ممبروں سے یقین رکھتے ہیں۔ کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چین اصحاب جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدردان ہیں شائد کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ اب سرسید ہی فرمائیں کہ کانگریس ممبر سرکار کے خلاف کیسے ہوئے؟

(۲) سرسید کا قول ہے۔ کہ میں نے مذہب ہی سے پوچھا۔ کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی اور میل جول اور رکھنا پینا دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے۔ یا نہیں؟ مذہب نے جواب دیا۔ کہ موافق ہے۔ کیونکہ اسلام نفاق سے نفرت کرتا ہے۔ اس لئے میں نے انگریزوں اور غیر مذہب قوموں سے ہمیشہ میل جول اور اتفاق رکھا۔

(۳) انگریز اپنی کونسلوں میں ان کی قدر کرتے اور انہی سے ملتے ہیں۔ جو کہ اشراف و اشرفی دکھتے ہوں۔ یعنی خاندانی اور باعزت باوجاہت ہوں۔ غریبوں سے ان کا کیا تعلق ہے۔

(۳) یہ بات صریحاً غلط ہے۔ ہندوستان میں ہزاروں بنئے۔ وحشئے۔ جولاہے۔ کنجڑے بھٹیارے اعلیٰ تعلیم پاکر علی عہدوں پر فائض ہو چکے ہیں۔ اور سرکار دربار میں انکا رسوخ ہے۔ اور اعلیٰ اعلیٰ خدمات بھی پا چکے ہیں۔ پس ان کو کونسلوں سے اب کون روک سکتا ہے۔

(۴) بنگالی یا ہندوؤں چونکہ مسلمانوں سے بہت زیادہ انگریزی دان ہیں۔ تعداد میں بھی زیادہ اس لئے تمام سرکاری عہدوں پر بنگالیوں یا ہندوؤں ہی کا تقرر و تسلط ہو جائے گا۔

بواسطت

(نیشنل کانگریس)

(۴) یہ خدشہ بھی بالکل فضول ہے۔ اول تو گورنمنٹ خود ہی مختلف اقوام کے لوگ ہر جگہ ملازم رکھتی ہے۔ تاکہ یہ اتفاق کرکے انگریزوں کے برخلاف نہ اٹھیں۔ پھر مسلمان آج کل کیا ایسے کم ہمت و نالائق ہیں جو اپنے حریفوں کا مقابلہ نہ کرینگے۔ زمانہ انکو مجبور کریگا۔ کہ وہ

(۵) سرسید کا خیال تھا۔ کہ مسلمان عام طور پر نیشنل کانگریس کے برخلاف ہیں۔ اور جو دو ایک مسلمان ممبر بھی ہوئے۔ وہ دباؤ ڈال کر یا ان کو لالچ دلا کر ہوئے ہیں۔

بھی اب اٹھیں۔ اور کچھ اپنی خبریں۔ بشرطیکہ وہ کانگریس کی آب وہوا سے متاثر ہوں

۵۔ یہ بات بھی بالکل ہوائی ہے کیونکہ کانگریس کے مسلمان ممبروں میں حیدرآباد کے سرہمایوں جاہ بہادر۔ مدراس کے آنریبل سید محمد۔ بمبئی کے آنریبل بدرالدین طیب جی۔ رحمت اللہ سیانی قاضی کبیرالدین احمد بیرسٹر۔ اور سید شرف الدین وغیرہ بیرسٹر ایسے مسلمان ملخر شمولیت رکھتے ہیں۔ کہ جو کسی کے دبائے دب نہیں سکتے۔ (کیا یہ بھی کوئی روئی یا گھاس کا پلندہ ہیں۔ کہ ان کو دبایا جا سکتا ہے؟ اور نہ ان کو کوئی ایسے مفت کے کاموں کو روپیہ پیسہ کا لالچ دلا سکتا ہے غرض سے

از قول سید کردیم توبہ
وز فعل او ہم استغفراللہ
مارا بر ندی افسانہ کردند
پیران جاہل شیخان گمراہ

مقدمات مولوی نذیر احمد دہلوی و مولوی محرم علی چشتی

۱۹ راپریل ۱۸۹۳ء کے اخبار رفیق ہند میں ان مقدمات کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ در اصل سرسید کے نیچری عقائد کی لپیٹ میں مولوی صاحب موصوف کو بھی قدیم وضع کے مسلمانوں نے کچھ پچھاڑنا چاہا۔ تو اس میں ان کے حمائتی حضرت چشتی صاحب چاروں شانے چت گرے۔ تاہم اس وقت ان مقدموں کا عوام میں بہت چرچا ہوا تھا۔ جیسے کہ آج کل وہابی اور حنفی مذاہب کے تصادم سے مسلمان کے مردہ دل ذرا گرمائے ہوئے ہیں۔ راقم مؤلف ان دلچسپ مقدمات کو اپنی آنکھوں دیکھ چکا ہے۔ جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ایک مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی کا مولوی نذیر احمد صاحب کی طرف سے مولانا چشتی پر۔ اس میں ۵۲ گواہ بلائے گئے۔ (۲) مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی مولوی چشتی کی طرف سے مولانا نذیر احمد پر۔ (۳) مقدمہ توہین مذہب منجانب چشتی بر مولوی نذیر احمد (۴) استغاثہ فحش گوئی از مولوی چشتی بر نذیر احمد (۵) استغاثہ ازالہ حیثیت عرفی من جانب چشتی صاحب بر ڈپٹی برکت علی دوست سرسید احمد۔ ان کے علاوہ مولوی نذیر احمد صاحب نے لاہور کے بعض اور اخبار نویسوں پر بھی استغاثے دائر کیے تھے۔ جن کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

سنہ ۱۸۹۳ء

مولانا نذیر احمد خان مرحوم ورسز مولوی محرم علی چشتی

مولوی محرم علی صاحب چشتی ایک قدیم وضع کے پنجابی بزرگ ہیں۔ جو کسی زمانے میں اخبار رفیق ہند کے نامور اڈیٹر اور اس کے پروپرائٹر رہ چکے ہیں۔

آج کل آپ صوبہ پنجاب کی کونسل کے ممبر اور شہر لاہور کے ایک مقتدر رئیس ہیں۔ ایک عرصے سے آپ حنفی عقائد کے پابند اور فقرا و صوفیا کے معتقد بن کر جہاں ضرورت ہو۔ ان کی وکالت بھی کیا کرتے ہیں۔ خدا سلامت رکھے۔ آپ ایک اردو گوشاعر بھی ہیں۔ جس کا حال ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔ لیکن شاید مولوی ممتاز علی صاحب (مالک اخبار تہذیب نسواں) سے باتوں باتوں میں یہ راز کھلا کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک قصیدہ بنام قصیدہ الغیاثیہ چشتیہ بھی فی البدیہہ تصنیف فرمایا تھا۔ جس کے یہ چند ایک اشعار نذر احباب کئے جاتے ہیں۔

قصیدہ الغیاثیہ بحضور مستطاب شیخ المشائخ خواجہ خواجگان حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین اجمیری

عجائب شان رکھتی ہے تیری سرکار یا خواجہ
ہزاروں کوس سے حاضر ہوئے زوار یا خواجہ

مجھے لاہور سے تونے بلایا عین شفقت ہے
ہوا آنکھوں کے بل حاضر تیرے دربار یا خواجہ

حضور پاک میں گر ہو اجازت یہ تمنا ہے
کہ اپنے درد دل کا کچھ کروں اظہار یا خواجہ

تجھے مردہ جو کہتے ہیں وہ خود مردہ طبیعت ہیں
تو سویا بھی نہیں ہر دم ہے تو بیدار یا خواجہ

قدم پاک سے تیرے ہوا ہندوستان روشن
مرے والی مرے آقا۔ میرے سردار یا خواجہ

خدا کے واسطے چشم توجہ اب دوبارہ ہو
یہ تیرہ خاک ہند اب ہو گئی ہے بار یا خواجہ

وغیرہ وغیرہ

ایک خاص واقعہ

مولوی محرم علی صاحب چشتی اول سرسید کے گاڑھے دوستوں میں سے تھے۔ اور اپنے

اخبار میں ان کی مدح و قصیدہ خوانیاں کیا کرتے تھے۔ مگر پھر یکایک ان کی نیت میں کچھ فتور پیدا ہو گیا۔ اور وہ ان سے سخت بگڑ گئے۔ جس سے ان لوگوں کو ایک قابل و بارسوخ اخبار نویس اور اس کا اخبار فی الفور ہاتھ آیا۔ جو کہ پنجاب میں سرسید اور اس کے رفقا میں سے مولوی نذیر احمد خان مرحوم کے دینی عقائد کے اکثر خلاف رہا کرتے تھے۔ یہ موقع دیکھ کر چشتی صاحب بھی ایک جاہل پبلک کے طرف دار بن گئے۔ اور خم ٹھونک کے میدان میں آ دھمکے۔ اور لگے آرٹیکل پر آرٹیکل سرسید اور اس کے بڑے حواری مولوی نذیر احمد خان کے برخلاف لکھنے۔ اب سرسید تو کسی چشتی وشتی کی مخالفت کی ہرگز پرواہ نہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر مولوی نذیر احمد خان کو یہ بات نہایت ناگوار گذری۔ اور وہ معاً خم ٹھونک کر چشتی صاحب کے مقابل میدان میں نکلے۔ دونوں طرف سے بڑے بڑے معرکے اور ہنگامے ہوئے۔ آخر نوبت بہ عدالت رسید۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس عدالتی کارگذاری کا کچھ حال لکھیں۔ یہ مناسب ہوگا۔ کہ ہم وہ مضحک مضامین یہاں درج کر دیں۔ کہ جس سے جل بھن کر مولوی نذیر احمد خانصاحب مرحوم نے آخر مالک و اڈیٹر رفیق ہند پر استغاثہ دائر کیا تھا ادھر مولوی محرم علی چشتی نے بھی ان کے نیچری عقائد پر ایک پبلک کیس یعنی مقدمہ بربنائے حمایت عقاید عمومیہ اسلامیہ دائر کیا۔ مگر انکو شکست ہوئی۔ اور مولوی نذیر احمد سے معافی مانگ کر خلاصی کروائی۔

اظہار حق

مولوی محرم علی صاحب چشتی نے ۸ر فروری ۱۸۹۳ء کے اخبار رفیق ہند میں یہ لکھا تھا۔ کہ سرسید احمد خان دہلوی کے دینی عقائد سے انتہا درجہ

تک بیزار ہو کر جو تازہ جوش عام مسلمانان پنجاب و ہند میں پھیل گیا ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان کے برخلاف جس قدر کثرت سے خطوط اور تحریریں ہمارے پاس اب تک پہنچی ہیں۔ اگر وہ سب کی سب چھاپ دی جائیں۔ تو کم از کم ایک سال کے لئے رفیق ہند کو انہی مضامین کے لئے وقف کر دینا پڑے گا۔ مگر چونکہ سرسید کے ناپاک مذہبی عقائد کے تذکرہ کے لئے۔ ہم یہ پورا اخبار یا اس کا کوئی حصہ ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ آئندہ ہم صرف ایک تھوڑی سی جگہ اخبار رفیق ہند میں سرسید کے نجدی و نیچری خیالات کے لئے لے لیا کریں گے۔ اور اس مضمون کو اظہار حق کے عنوان سے شائع کرتے رہیں گے۔ چنانچہ کچھ ایسے آرٹیکل ہر ہفتہ اخبار رفیق ہند میں طبع ہونے لگے۔ اور ۲۶ فروری ۱۸۹۳ء کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں جو لیکچر بعنوان فطرۃ اللہ مولوی نذیر احمد خاں مرحوم کا توحید کے متعلق ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مولوی محرم علی صاحب چشتی اور ان کے حامی چراغ پا ہو گئے۔ علاوہ ازیں دسمبر ۱۸۹۲ء کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ میں جو قومی قصیدہ مولوی نذیر احمد خاں صاحب نے پڑھ کر سنایا تھا۔ اور جس کا یہ مطلع ہے ؎

مسلمانوں اگر تم میں ہے کچھ فکر سا باقی — تو بول اٹھو کہ ہے اسلام کے ٹنٹے میں کیا باقی

رفیق ہند میں اس کی خوب دھجیاں اڑائیں گئیں۔ اور مولوی محرم علی صاحب اور ان کے رفقانے فروری ۱۸۹۳ء سے جون ۱۸۹۲ء تک سرسید احمد خاں اور مولوی نذیر احمد خاں کی مخالفت میں ایسے ایسے ہتک آمیز اور بالکل بچپانہ مضامین لکھے۔ کہ اخبار رفیق ہند کے وہ پرچے جن میں یہ معرکے درج ہوتے تھے۔ سید انشا و مصحفی یا سودا کی ہجوؤں سے بھی زیادہ پر لطف و بامزہ معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا ہم ان مضامین میں سے کچھ رطب و یابس

یہاں درج کرتے ہیں۔ کتاب حیات النذیر میں لکھا ہے۔ کہ مولوی نذیر احمد خان کا اس مقدمہ میں جو مولوی محرم علی صاحب چشتی پر محض سرسید کے مذہبی عقائد کی وجہ سے چلایا گیا تھا۔ پورا دس ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ ادھر اس کے ڈیفنس میں غریب چشتی کو بھی تین ہزار کے قریب اپنی گاڑھی کمائی سے خرچ کرنا پڑا تھا۔ تب جا کے گلو خلاصی ہوئی تھی۔

اخبار رفیق ہند مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۸۹۳ء (اقتباس)

مولوی نذیر احمد صاحب کا مدحیہ قصیدہ

اور

قدسی صاحب ایڈیٹر صادق الاخبار بہاولپور کا حاشیہ

(مولوی نذیر احمد) مسلمانوں اگر تم میں ہے کچھ فکر رسا باقی / تو بول اٹھو کہ ہے اسلام کے مٹنے میں کیا باقی

وہ بیمار قریب مرگ ہے اسلام واویلا / مسیحا کو نہیں ہے جس کی امید شفا باقی

(قدسی صاحب) مسیحا خود نہوں بیمار شک ہے تو لو یصاحب / ہوا پرپشن تو جانیں وضع کیا ہوتا ہے کیا باقی

(مولوی صاحب) مسیحا کون؟ سر سید پکاریں سب میں کہتا ہوں / صد و سی سال اسکو اور رکھیو اے خدا باقی

(قدسی صاحب) تو یوں کہیے کہ حضرت بر ملا اب آ گئے رجل میں / یہی تھا آپکے ترکش میں اک تیر دعا باقی

اکیلا جی کے سرسید کریگا سو برس تک کیا؟ / بڑھا وا دینے والا بھی تو کوئی رکھیے گا باقی

نذیر احمد بھی نفخ صور تک یا رب جئیں جاگیں / سمیٹیں اور نہ رکھیں حشر کا اک بوریا باقی

(مولوی صاحب) بھلا ہے یا برا یہ جانے یا اس کا خدا جانے / مگر ہے کوئی اس کی شان کا اس کے سوا باقی

(قدسی صاحب) خدا کی شان اسکی شان پر ہے آپ کو حسرت / نہ جس نے شان میں اسلام کو رہنے دیا باقی

"بھلا ہے یا بُرا یہ جانے" کہدو پر یہ کہدینا — رہیگا نامۂ اعمال میں لکھا ہوا باقی

خوشامد میں یہ بھولاپن تملق میں ذہول ایسا — نہ رکھا آپ نے انجان بن کر کچھ لگا باقی

خدا نے آپ کو معیارِ علم و فضل بخشا ہے — نہیں رہتا ہے آگرہ ٹھ میں کھوٹا کھرا باقی

تو ایسی شمع جمع زر کے کیوں پروانہ بنتے ہو — جلا کر راکھ کر ڈُلے گر رہے اک کوئلا باقی

ابھی سے ڈگ گئے یارب ہمارے مولویصاحب — ابھی دو چار جلسوں تک تو رکھتے حوصلا باقی

(مولویصاحب) عقائد میں کسی کے دخل دینے کی ضرورت کیا؟ — قیامت کو بھی رہنے دوگے کوئی فیصلہ باقی

(قدسی صاحب) عقائد میں دیا ہے دخل کسنے خود ہی فرمائیں؟ — رکھا تفسیر میں کوئی دقیقہ بھی بھلا باقی

مفسر اور اماموں کی کہو تضحیک کسنے کی؟ — نہ چھوڑا انبیاء کے پاس کسنے معجزہ باقی؟

کہا کسنے کہ ہیں احیائے موتیٰ کا نہیں قائل؟ — کہا کسنے نہیں رکھتا اجابت اور دعا باقی؟

کہا کسنے. اگر جیتے رسول اللہؐ کچھ دن اور؟ — نہ رکھتے خانۂ کعبہ کا جہاں میں پھر پتا باقی؟

کہا کسنے ـ نہیں ہے آسمان پر اک فرشتہ بھی؟ — کہا کسنے نہیں جنات ـ ہے اک وہم سا باقی؟

کہا کسنے کہ روح اللہ بیشک باپ والے ہیں — کہا کسنے کہ ہے گردن مروڑی میں مزا باقی؟

ذرا ان سے تو بے باکی کرائی ہوتی حضرت نے — جبھی کہتے کہ خود سر ہو تمہیں پر ہے خطا باقی

(مولویصاحب) یہی اک فرد اکمل ہے کہ جس کو دیکھ کر جانا — ہماری ناؤ کا اب تک ہے بارے ناخدا باقی

(قدسی صاحب) چلا کر ناؤ کاغذ کی یہ فرماؤ تو فرماؤ — "ہماری ناؤ کا اب تک ہے بارے ناخدا باقی"

مگر وہ ناؤ جس کو نوحؑ کی کشتی سے نسبت ہے — حوادث سے بچا کر اُس کو رکھنا یا خدا باقی

(مولویصاحب) جزاک اللہ خیرا. قوم کی اصلاح حالت میں — دقیقہ ایک بھی تو نے نہیں رکھا اُٹھا باقی

(قدسی صاحب) بٹھایا قوم کی گدی پر اُس نے اپنے بیٹے کو — دقیقہ ایک بھی اُس نے نہیں رکھا اُٹھا باقی

ہمیں ترغیب دے دے کر سگِ دنیا بنا ڈالا — نہیں رکھی ہمارے دل میں حب کبریا باقی

اگر کچھ مال و زر تھا جیب میں کالج میں کھو بیٹھے — نچھوڑا اس کو بھی ـ ہے لب پر جو لفظ مرحبا باقی

(مولویصاحب) خدا نے تجھ کو پہنچایا ہے کیا اعلیٰ مراتب پر — فزوں تر جس سے اب کوئی نہیں ہے مرتبہ باقی

طریق مختصر یہ گر ترے القاب یک جا ہوں — تو مشکل ہے کہ ابجد میں رہے حرف ہجا باقی

(قدسی صاحب[1]) دکھائی یاں تو ایسی شاعری کا کب ثنا گر نے … کہ مضمون ہند عالم اب ہیں بے برگ و نوا باقی
اڑایا حضرت حالی کا حصہ بھی قیامت کی … حساب اپنا وہ دکھلائیں گے کیا نکلا ہوا باقی

(مولوی صاحب) مگر معلوم ہے تجھ کو مسرت کچھ نہیں اسکی … کہ تو ہے دردمند قوم اور تیرا گلہ باقی

(قدسی صاحب) مسرت گر نہ ہوتی تو وہ بھی ایڈیٹری میں آتے کیوں … کہ ہے اسٹیج پہ گانے کی اُن کے اک صدا باقی

(مولوی صاحب) محال عقل ہے تجھ کو ہو اس دنیائے فانی میں … سوائے قوم کوئی آرزو یا التجا باقی

(قدسی صاحب) محال عقل ہے چھٹ جائے اُس سے زال دنیا کی … ہے بلغ زندگی میں اُس کے جبتک کچھ ہوا باقی

(مولوی صاحب) نہ ہو بیدل اور اپنی ہی کئے جا صرف ہمت بس … کہ سب کے سر پہ اب تو ہی ہے اک بوڑھا باقی

(قدسی صاحب) گلیڈسٹون صاحب کو بھی گن جاتے تو اچھا تھا … کہ وہ بوڑھوں کے سر پہ بھی ہے اک بوڑھا باقی

(مولوی صاحب) اگر انعام کی تجھ کو توقع ہے تو باور رکھ … خدا کے پاس ہے تیری جزا تیرا صلہ باقی

(قدسی صاحب) "خدا کا پاس کچھ تو نہیں اُٹھ کے دیدو گے … نہیں حصہ وہاں دنیا پرستوں کا ذرا باقی[2]

(مولوی صاحب) تجھے روئیگی سر پر ہاتھ رکھ کر قوم بد قسمت … اور اس کو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

(قدسی صاحب) "تمہاری جان کو روئیگی" یوں کہنا مناسب تھا … مگر کنبے سے تو اتنا یہ تم سے رہ گیا باقی

(مولوی صاحب) نہ ہو دیں کارگر گر لاکھ تدبیریں تو کیا پروا … ابھی سب سے بڑی باقی ہے تدبیر دعا باقی

(قدسی صاحب) اُٹھا رکھئے دعا کو آنریبل اس کے منکر ہیں
مگر لاؤ شفا خانہ سے گر ہو کچھ دوا باقی۔

---

[1] مولوی حافظ عبدالقدوس صاحب قدسی اخبار صادق الاخبار بہاولپور کے ایڈیٹر تھے۔ جو اپنے وقت میں بہت قابل ناظم و ناشر تھے۔
(مؤلف)

---

[2] من کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منہا وما لہ فی الآخرۃ من نصیب ۔۱۲

مولوی نذیر احمد صاحب کا قصیدہ

اور

حضرت قدسی کا حاشیہ

رفیق ہند ۸ - مارچ ۱۸۹۲ء

ڈپٹیشتی - آپ کے اخبار گوہر بار میں قصیدۂ مدحیہ مولوی نذیر احمد صاحب کا اور اس پر حضرت قدسی کا حاشیہ میں نے بھی دیکھا - اللہ اللہ اس قصیدہ میں حاشیہ نے جان ڈال دی - اور ایک خیالی ہیولا میں حقیقت کی صورت بنا کر اصلیت کی روح پھونک دی ہے - جس سے قصیدہ کا حسن دو چند نہیں ہزار چند بڑھ گیا اس سے ثابت ہوتا ہے - کہ ابھی دنیا باکمالوں سے خالی نہیں - اور ایک سے ایک بڑھ کر اہل کمال موجود ہے - مولوی صاحب نے اظہار مدحت میں اور حضرت قدسی نے انکشاف حقیقت میں کمال دکھایا ہے - متن نری مدحت ہے - اور حاشیہ اصلیت - یا یوں کہو کہ ایک سے محض خوشامد ٹپکتی ہے - اور دوسرے سے حقیقت کھلتی ہے - مولوی صاحب نے گو اس سے پہلے اس طرح کھلے بندوں کبھی مدح سرائی نہ کی ہو - مگر ان کے لکچروں سے ثابت ہوتا ہے - کہ وہ اس خدمت کو ایک مدت سے ادا کر رہے تھے - میں نے مولوی صاحب کا کوئی لکچر ایسا نہیں سنا - اور نہیں پڑھا - جو سرسید کے روبرو دیا گیا ہو اور اس میں سرسید کی بے انتہا تعریف نہ کی گئی ہو - مولوی صاحب نے جو لکچر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۸ء کو بمقام لاہور دیا - اس میں سرسید کی بارہا تعریف کے بعد فرمایا تھا کہ:-

"بار بار سرسید کا نام لیتے ہوئے میری طبیعت مضائقہ کرتی ہے - کہ مبادا کوئی کریم النفس خیال کرے - کہ جس طرح لکھنؤ کے مرثیہ خوان بناتے ہوئے

لبسورنے والوں کو مجلسوں میں ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ کہیں اسی طرح سرسید احمد خان مجھ کو تو اپنے ساتھ نہیں لائے۔" الخ

مجھے اُسی وقت یہ خیال پیدا ہوا تھا۔ کہ کجا تعلیمی لکچر۔ کجا سرسید کی بغایت تعریف اور کجا یہ بے ساختہ الفاظ۔ کہیں از کوزہ ہماں تراود کا مسئلہ یا "چور کی داڑھی میں تنکا" کا معاملہ تو نہیں۔ مگر میں نے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ آخر سرسید جو مولوی صاحب کو اتنی دُور سے اُٹھا لائے۔ اس کا اتنا بھی حق ادا نہ کریں۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ پھر ۱۸۸۹ء کا لکچر پڑھ کر جو علیگڈھ میں دیا گیا تھا جس میں ٹوکروں سرسید کی تعریف تھی۔ وہ الفاظ یاد آ گئے۔ جو مولوی صاحب کی زبان سے بیساختہ نکلے تھے۔ اور مجھے اپنے اُس خیال کی تائید اور تصدیق ہوئی۔ لکچر کی ابتدا کچھ شعروں سے کی گئی تھی۔ جس کے تین شعر مجھے اس وقت یاد ہیں وھو ھذا۔

(۱) مہرِ خاموشی تھی مدت سے مرے منہ پر لگی ہر برس لکچر کے دینے سے یہ کیسی کر لگی

(۲) سید احمد خان کی خاطر سے وگرنہ میں کہاں اور کہاں یہ بھیڑ۔ جو ہے اندر اور باہر لگی

(۳) پھر خدا جانے ملے کب موقعِ اظہارِ حال بات اب کوئی نہ رکھیو اے دلِ مضطر لگی

مولوی صاحب کی مدح سرائی پر خیال کر کے مجھے یہ سُوجھا۔ کہ اگر یہ شعر یوں ہوتے تو حسبِ حال ہوتے۔

(۱) مُہرِ خاموشی تھی مدت سے مرے منہ پر لگی ہر برس مدحت سرائی کی یہ کیسی کر لگی

(۲) یا الٰہی یہ ہمارے کان میں سید نے کیا پھُونک ڈالا۔ جستے بھاٹوں کی سی یہ پھِر لگی

(۳) پھر خدا جانے ملے کب موقعِ اظہارِ مدح بات اب کوئی نہ رکھیو اے دلِ مضطر لگی

اُس وقت تک یہ مدح بازی ایک خاص پیرایہ میں تھی۔ مگر اب تو مدح سرائی کے میدان میں کھُلم کھلا یکہ تازی ہونے لگی۔ یہ بات کچھ وہی لوگ جانتے ہیں۔ کہ اشعار اور اشعار میں بھی مدحیہ قصائد میں کتنی جان کاہی اور تضییع اوقات اور تکلیفِ مالا یطاق برداشت کرنی پڑتی ہے۔ "سخن گفتن بکرِ جان سفتن است"

اور یہ تو ظاہر ہے۔ کہ کوئی تکلیف اور مصیبت بجز کسی غرض اور مطلب کے کوئی نہیں اُٹھاتا۔ دنیاداروں کے قصائد مدحیہ عموماً دنیا کے لالچ سے لکھے گئے ہیں۔ دینداروں کے فرطِ جوشِ عقیدت اور ارادت سے بطمع صلۂ اُخروی تحریر ہوئے ہیں۔ پس لامحالہ مولویصاحب جیسے خاموش کے لئے کوئی بھاری غرض اس کی محرک ہوئی ہوگی۔ یہ تو قیاس میں نہیں آتا۔ کہ سرسید کے الفاظ آنریبل سر ڈاکٹر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی اس کے متقاضی ہوئے ہوں۔ یا یہ خیال کہ سرسید کے دوست بڑے جلیل القدر پتلون پوش ہیں۔ اور اُس کی شہرت یورپ اور ایشیا میں ہوچکی ہے۔ اُس کی مداحی ایسی صورت میں مداح کے لئے بھی موجب اشتہار ہو۔ یا یہ وہم کہ حضراتِ نیچر اپنے ہادی کا مدح گو سمجھ کر خدمت اور تعظیم کرنے لگیں۔ بہرحال کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو۔ مگر سبب ضروری اور بھاری ہے۔ ہم کو سرسید کی مدح سرائی سے کچھ تعرض نہیں۔ مولوی صاحب ایک نہیں ہزار قصیدہ کہیں۔ ہر سال نہیں ہر روز نیا قصیدہ لکھیں۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ مگر ہم کو اندیشہ یہ ہے۔ کہ مبادا ان حرکات سے اہلِ ایمان جو سرسید کے اعتقادات سے بیزار ہیں۔ مولوی صاحب سے بھی بدظن نہ ہو جاویں۔ اور جیسے کہ مومنین کے دلوں سے سرسید کی عظمت اور محبت جاتی رہی ہے۔ کہیں مولوی صاحب سے بھی وہی حال نہ ہو۔ لیکن یہ عوام کو معلوم رہنا چاہئے۔ کہ مولوی صاحب سرسید کے عقائد سے مجامع عام میں نفرت اور برئیت ظاہر کر چکے ہیں۔ چنانچہ لاہور کے جلسہ منعقدہ ۸ دسمبر ۱۸۸۸ء میں مولوی صاحب نے باآواز بلند فرمایا تھا۔

"لیکن اگر فالورز سے مراد ہوں۔ بلا تحقیقات ان کے تمام خیالات کے تسلیم کر لینے والے اگرچہ وہ خیالات مذہبی کیوں نہ ہوں۔ تو میں اس بھرے مجمع میں پکارے کہتا ہوں کہ (انی برا٫)"

پس اس سے ثابت ہے۔ کہ مولوی صاحب پر سرسید کے ہم عقیدہ یا سرسید کے متبع ہونے کا الزام نہیں آسکتا۔ اس سے یہ ظاہر ہے۔ کہ سرسید کی مدح سرائی کسی مذہبی وجہ سے نہیں۔ ہو نہو اس کا باعث کوئی دُنیوی سبب ہے۔ میں نے یہاں اہل ایمان اور مومنین کی قید لگائی ہے۔ یہ اس لئے کہ اہل اسلام اور مسلمان ہونے کا تو ہر ایک مدعی ہو سکتا ہے۔ مگر ایمان ایک خاص صفت ہے جو ہر ایک کے نصیب نہیں۔ خداوند کریم فرماتا ہے۔

قالت الاعراب اٰمنّا قل لم تؤمنوا و لٰکن قولوا اسلمنا و لما یدخل الایمان فی قلوبکم و ان یطیعوا اللّٰہ و رسولہ لا یلتکم من اعمالکم شیئًا ان اللّٰہ غفور الرحیم اس سے روشن ہے کہ ایمان اور اسلام میں بڑا فرق ہے۔

ڈیر چشتی۔ میں اپنے اصلی مطلب سے بہت دُور جا رہا۔ مقصد تو یہ تھا۔ کہ وہ قصیدہ اور وہ حاشیہ بہت ہی دلچسپ ہیں۔ افسوس یہ ہے۔ کہ حضرت قدسی نے سارے قصیدہ پر حاشیہ نہیں چڑھایا۔ اور نہ کسی ترتیب سے اُسے مرتب کیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو شعر اُن کو تشریح کے قابل معلوم ہُوا اُس پر حسب ضرورت حاشیہ لکھدیا۔ کسی شعر پر ایک ہی شعر اور کسی پر زیادہ۔ دراصل حاشیہ کا قاعدہ بھی یہی ہے۔ مگر اب ان اشعار کا دلچسپ اور دلکش ہونا مجبور کرتا ہے۔ کہ آپ سے یہ درخواست کی جاوے کہ آپ حضرت قدسی کو مجبور کریں۔ کہ وہ اس سارے قصیدہ پر ایک ایک شعر کے بعد بطور تضمین مقررہ تعداد کے اشعار لکھیں۔ اس طرح سے وہ مکمل ہو جائیگا۔ پھر بصورت رسالہ چھپوایا جاوے۔ اُمید ہے۔ کہ اس رسالہ کی بڑی قدر ہوگی۔ اور شائقین نہایت شوق سے اسے پڑھیں گے۔ اور واقعی یہ رسالہ قابل دید ہوگا۔ میں اُمید کرتا ہوں۔ کہ آپ میری اس درخواست کو حضرت قدسی سے منظور کرا دینگے

اور بہت جلد یہ رسالہ چھپ کر ہدیۂ شائقین ہوگا۔ آخر میں حضرت قدسی سے بھی التماس ہے۔ کہ اس درخواست کو منظور فرماکر مشتاقوں کو مشکور کریں۔

راقــــــــــم

ایم۔ نذیر۔ پنجابی تحصیلدار

نیچری بھانڈ کے قصیدہ کی دُرگت

مسٹر نذیر احمد نے جو قصیدہ سرسید کی تعریف میں پڑھا تھا۔ اور جس سے بالکل بھانڈپن ظاہر ہوتا تھا۔ اُس کی دُرگت بہت کچھ ہوچکی ہے۔ اب جناب محمد سردار خان صاحب کیفی دہلوی نے گویا "موئے پر سو دُرّے" لگائے ہیں۔ اور اُس کے جواب میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ جو صادق الاخبار بہاول پور سے نقل کیے جاتے ہیں:۔

مسلمانو اگر تم میں ہے کچھ خوفِ خدا باقی
مسلمانو اگر صدیقِ اکبرؓ یاد ہیں تم کو
مسلمانو اگر فاروقؓ پر تم جان دیتے ہو
مسلمانو اگر ہو مرتضیٰ ؑ کے دل سے شیدائی
مسلمانو جو تم کو سبطِ اصغر سے علاقہ ہے
مسلمانو اگر تم حجِ کعبہ فرض سمجھے ہو
مسلمانو اگر ہے پاس تم کو دین و مذہب کا
تو سمجھو یہ بھی خواہانِ ظاہر خصمِ باطن ہیں
انہیں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا ہی
خلافِ دین و ملت ہیں نرے سطحی جہالت میں

مسلمانو اگر تم میں ہے حبِّ مصطفیٰ باقی
مسلمانو اگر اُن کا سا ہے صدق و صفا باقی
مسلمانو ہے گر عثمانؓ کی تم میں حیا باقی
مسلمانو حسنؓ کی ہے اگر تم میں ولا باقی
مسلمانو جو تم کو ہے خیالِ کربلا باقی
مسلمانو مدینہ کی ہے گر تم میں ہوا باقی
مسلمانو بزرگوں کا ہے گر کچھ حوصلہ باقی
نہ ان میں پاس ملت ہے نہ ان میں اتقا باقی
انہیں کی سعیٔ باطل پر ہے اُمیدِ بقا باقی
اگر باقی ہے کچھ ان میں تو جھوٹا فلسفہ باقی

پہنا وا ہے اُنہیں کا سا چلن ہے کچھ اُنہیں کا سا
بنے گا ہند بھی یورپ جو ہیں یہ فتنہ زا باقی

اِدہر اسلام میں داخل اُدہر شامل نصاریٰ ہیں
زمانہ سازی کی رکھی نہ کوئی انتہا باقی

نہ ہے اب سامری باقی نہ ہے زردشت ہی زندہ
رہا پھر شان کا ان کی کہاں ان کے سوا باقی

لگا کر میز کُرسی جس گھڑی اجلاس کرتے ہیں
نہ کرسی چھوڑتے ہیں اور نہ عرش کبریا باقی

کبھی دہاوا فرشتوں پر کبھی یورش بہشتوں پر
نہ چھوٹے جبرائیل ان سے نہ سدرالمنتہیٰ باقی

انہیں منجدار میں چھوڑ یگا روتا دیکھ لینا تم
رہا گر ناؤ کا ان کی یہ بوڑہا ناخدا باقی

چلے کیوں اور رستے پر وہ بیشک حق بجانب ہیں
مسیحا سا ہے جس اُمت کا آپ ہی پیشوا باقی

نہیں جب قائلِ جنّت تو پھر محروم جنّت ہیں
غضب ہے یاں بھی گر رہ جائے کوئی مرتبہ باقی

بُتِ دنیا کا ہے نقش و نگارِ حسن پہلا سا
وہی تیغِ نگہ قاتل وہی زلفِ دوتا باقی

وہی حسنِ مذاہب کُش وہی ایمان ربا باتیں
وہی دلکش صدائیں اور وہی آن وادا باقی

بہت بوبک ابھی اس بیسوا پر جان دیتے ہیں
ہے بازار جہاں میں اس کا اب تک اشترا باقی

غریب اپنی لنگوٹی میں جو کھیلے پھاگ بہتر ہے
ہے درویشوں کی گدڑی میں ہی لعل بے بہا باقی

مسلمانو کرو الفقر فخری پر سدا نازش
تمہارے پاس ہے میراثِ ختم الانبیا باقی

یہ محتاجی یہ بے برگی وہاں پھل لائیگی حضرت
جہاں رہنا ہے ثمرہ نیک و بد اعمال کا باقی

نگر اغنیا رکے نزدیک ہے یہ زیست کا حاصل
کہ مر کر چھوڑ جائے نقد یا گھوڑا گدہا باقی

لبیِ مردن جنازہ پر ہو یہ چرچا محبوں میں
گیا ہے چھوڑ صدہا پر ہزاروں سود کا باقی

ہے سیونگ بنک میں لاکھوں ہی داخل اس مسافر کا
مسلمانوں میں تھا یہ ایک قارون کا چچا باقی

دیا منہ پھیر دولتمند یوں نے اسکی بیٹھوں کا
ہے سودی امین دین اس کا جہاں میں جابجا باقی

نہ کلمہ کی طرف تھا دھیان نے فکر مآل اس کو
مگر تھا مال کی تشویش کا اک خرخشہ باقی

بہی کھاتا لکھا ہے مرتے دم تک اس صفائی سے
کہ رکھا ہی نہیں اولاد پر جھنجھٹ لگا باقی

جو لندن تک گیا لیکن نہ دیکھا خانہ کعبہ کو
تو کیا سچی مسلمانی میں اب کچھ رہ گیا باقی

جہاں بعدِ فنا اس اس طرح کی یادگاریں ہوں
جہاں ہو مرنے والے کا یہ ذکرِ خیر سا باقی

بچا ان سے بچا ان سے بچا ان سے — نہ پرچھائیں بھی ڈال اُن کی مسلمانوں پہ یا باقی
ہمیں افلاس و محتاجی ملی ہے قدرِ نعمت کو — نہ ہو زحمت۔ تو رحمت کا نہیں رہتا مزا باقی
ہے جانے شکر اَب بھی اور قوموں سے نہیں پیچھے — کہ ہے اَب دلِ اعدا میں اپنا دغدغہ باقی
یہی اک دینِ اعظم تھا یہی اک دین محکم تھا — جو ان جھگڑوں فسادوں بھوٹ پر اُتارہا باقی
مسلمانوں پہ اس فرقہ کی اب تفضیح لازم ہے — کریگا سب کو گمرہ ایک دن گمراہ رہا باقی
الٰہی ہم کو نصرت دے انہیں رشد و ہدایت دے — ہے کیفی اس دعا کے بعد اور اک مدعا باقی

ترقی ہو مسلمانوں کی اور اسلام کی یارب
نہ اُکھڑے حشر تک اسلام کی جو ہے ہوا باقی

مولوی نذیر احمد صاحب اور گوز

ڈیر اڈیٹر۔

آپ کے گذشتہ پرچہ کا آرٹیکل پڑھ کر میں کیا اور بہت سے احباب حیران ہی رہ گئے۔ خصوصًا اس امر پر کہ لاہور کے اسلامی جلسہ میں گوز وغیرہ کے تذکرہ کا کیا موقع تھا۔ تعجب ہے۔ کہ مولوی نذیر احمد صاحب جیسے تجربہ کار اور سپید ریش شخص کو ایسے طفلانہ اور بازاری مذاق کی کون سی ضرورت لاحق ہوئی۔ اگر رفیقِ ہند جیسے معتبر اخبار میں مولوی صاحب کے منہ سے ایسے الفاظ نکلنے کا بیان نہ ہوتا۔ تو مجھے واقعی تامل ہوتا۔ کہ ایک ایسے بڈھے شخص کی زبان سے ایک مجلسِ وعظ میں ایسے الفاظ کا نکلنا باور کروں۔ جو واعظ اور حافظ اور مولوی کہلاتا ہو۔

ایک خیال یہ بھی ہے۔ کہ صاحبانِ اخبار نے مولوی صاحب کی اس قدر مخالفت کی تھی۔ کہ اگر اس کی وجہ سے مولوی صاحب کے پیٹ میں بھی باد

مخالف نے زور دیا ہو۔ تو تعجب کا مقام نہیں۔ اور جس حال میں بقول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ بڑے بڑے "صلحا" کی بھی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ "بادِ مخالف در شکم پیچید"۔ تو اگر بیچارے مولوی صاحب بھی مجبور ہو گئے۔ اور اُن کے منہ سے گوز کا آواز نکل گیا۔ تو ان کو کسی قدر معذور قرار دیا جاسکتا ہے اور اس میں تو آپ کو کلام ہی نہ ہوگا کہ۔ ع

چو باد اندر شکم پیچد فروہل

پس اگر مولوی صاحب نے بھی بحالتِ مجبوری "فروہل" پر عمل کیا۔ تو اس معاملہ کو زیادہ طوالت دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

راقم

معذوری اور مجبوری

رفیق ھند۔ صاحب راقم کو معلوم ہو۔ کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے "فروہل" پر عمل نہیں کیا۔ کیونکہ "فروہل" کے معنی یہ ہیں۔ کہ چپکے سے چھوڑ دے نہ اس زور شور اور بلند آواز کے ساتھ جیسا کہ مولوی صاحب چھوڑتے تھے۔ کیونکہ مولوی صاحب کے گوز کی آواز پر تو بعض لوگوں کو جلسہ کے سائبان کا نکر پڑ جاتا تھا۔

مولوی نذیر احمد صاحب اور بی بی تمیز!

جناب من۔

مجھ کو واقعی سخت افسوس ہے۔ کہ مولوی نذیر احمد صاحب کو اپنی گفتگو میں بی بی تمیز کے تذکرہ کی ضرورت تھی۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ بی بی تمیز کا تذکرہ نہایت ہی فحش تھا۔ اور بقول آپ کے ایسے ہی فحش الفاظ میں بیان کیا گیا۔ کہ بابھا مفتوحہ اور را جلھا مرفوعۃ والا شعر بھی سنا دیا۔ جس کے معنی نہایت ہی

غلیظ ہیں تو مولوی نذیر احمد صاحب کی یہ حرکت نہایت قابلِ نفرین ہے۔ جو حالات آپ کے اخبار سے نذیر احمد صاحب کی گندہ خیالی کے معلوم ہوئے ہیں وہ مجبور کرتے ہیں۔ کہ ہر ایک مسلمان اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو ایسے شخص کے برائے نام وعظ میں جانے سے روکے۔ کیا مولوی نذیر احمد صاحب کہہ سکتے ہیں۔ کہ اور کوئی الفاظ ان کو ادائے مطلب کے لئے نہ ملتے تھے ؟۔ کیا وہ اپنے بیٹے کے سامنے ایسے قصوں کو خود بیان کرنا جائز سمجھیں گے؟ بی بی تمیز کو مبارک باد دینی چاہیئے۔ کہ اُس کو صدہا سال کے بعد مولوی نذیر احمد صاحب نے کتنے ہزار مسلمانوں سے انٹروڈیوس کرانے کا فخر حاصل کیا۔ اور یقیناً اگر بی بی تمیز کا قصہ صحیح ہے۔ تو وہ معزز لیڈی اگر آج زندہ ہوتی۔ تو عجب نہیں۔ کہ حاضرینِ جلسہ میں سے کتنے اُس کی ملاقات کے شائق پیدا ہو جاتے۔ اور اس عمدہ سروس کے لئے وہ مولوی نذیر احمد صاحب کی کمال شکرگذار ہوتی۔ چودھویں صدی میں اگر ایسے ہی واعظ رہ گئے ہیں۔ تو ہمارا ایسے واعظوں کو سلام ہے ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد
وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

راقم
وزیر آبادی

سید کے لئے "کفن گھسوٹ" کا خطاب

کرم فرمائے بندہ جناب ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم۔ مسٹر نذیر احمد نے اپنے لکچر میں فرمایا تھا۔ کہ سر سید پہلا نباش یعنی کفن گھسوٹ ہے۔ اور انجمن حمایت اسلام دوسری نباش یعنی کفن گھسوٹ ہے۔ اور بعد ازاں یہ فقرہ فرمایا۔ کہ رحمۃ اللہ علی نباش الاول (یعنی رحمت ہو اللہ کی پہلے کفن گھسوٹ پر)

چونکہ تمام لوگوں کو یہ نباش یعنی کفن گھسوٹ والا قصہ پوری طرح معلوم نہ ہوگا۔ اس لئے نذیر احمد صاحب کے اس رحمۃ اللہ الخ کی شانِ نزول کا بتانا ضرور ہے۔ یہ قصہ یوں ہے۔ کہ کسی شہر میں ایک شخص نہایت موذی اور شریر النفس تھا۔ جو قبروں میں سے مردوں کے کفن اُتار لیا کرتا تھا۔ اور اس کی اس حرکت پر تمام لوگوں میں سخت ناراضی پھیلی ہوئی تھی۔ چونکہ ایسی حکمت عملی سے اُتارا کرتا تھا۔ کہ قانونی ثبوت بہم نہ پہنچ سکتا تھا۔ لہذا اس کی گرفتاری مشکل تھی۔ قضائے الٰہی سے وہ نامعقول فوت ہوگیا۔ اور اس کی موت سے عام لوگوں کو نہایت ہی مسرت ہوئی۔ کوئی مجلس نہ تھی۔ جہاں پر اُس کا ذکر نفرت اور حقارت اور نفرین کے ساتھ نہ آتا ہو۔ اور سب خاص و عام اس پر لعنت اور پھٹکار کرتے تھے۔ اُس متوفی کفن گھسوٹ کا ایک جوان بیٹا رہ گیا تھا۔ جس کو اپنے باپ کی نسبت ایسے ایسے الفاظ سُنکر سخت رنج ہوتا تھا۔ اور وہ شب و روز اس تدبیر میں غلطاں اور پیچاں رہتا تھا۔ کہ کسی طرح اپنے باپ کو نیک نام کرے۔ آخر کار بڑے غور و فکر کے بعد بیٹے نے بھی وہ ہی پیشہ نباشی (یعنی مُردوں کے کفن اُتارنے) کا شروع کر دیا۔ اور اس سعادت مند نے اس طرح کفن اُتارنے شروع کئے۔ کہ نہایت بے حرمتی کے ساتھ مُردہ کے جسم سے کفن اُتار کر مردہ کو باہر پھینک دیا کرتا۔ اور اس کے پیچھے ایک میخ بھی ٹھونک دیا

کرتا تھا - لوگوں نے جب مُردوں کی یہ بے عزتی دیکھی - تو بے اختیار کہنا شروع کیا - کہ رحمۃ اللہ علی نباش الاول یعنی اُس پہلے کفن گھسوٹ پر خدا تعالیٰ کی رحمت ہو کہ وہ بیچارہ مردوں کا صرف کفن اتارا کرتا تھا - اور اتنی بے عزتی اور بے حرمتی تو نہ کیا کرتا تھا - اور اس طرح اُس خلف الصدق نے آخر کار اپنی اس حرکت سے اپنے والدِ ماجد کو لوگوں میں نیک نام کر دیا -

آپ ذرا اس قصہ کو دیکھئے - کہ اس کی مناسبت قومی چندوں کے ساتھ دیکھئے ! اور ساتھ ہی یہ بھی خیال فرمایئے - کہ اس مثال دینے میں مسٹر نذیر احمد نے کس درجہ تک متانت اور ثقاہت کے جوہر دکھائے ہیں - اور سرسید کی کیا کچھ تعریف کی ہے - اور انجمن حمایت اسلام کی کیا کچھ توصیف کی ہے - اس کو کہتے ہیں "گود میں بیٹھ کر داڑھی نوچنا" یعنی انجمن کے آپ مہمان ہیں - اور انجمن پر یہ کچھ پھبتیاں سُنا رہے ہیں ع

این کار از تو آید و مردان چنین کنند

میں سچ کہتا ہوں - کہ میری آنکھوں میں تو اُس وقت خون اتر آیا تھا - اور اگر بعض پنجابی ڈھلمکے اپنی حماقت سے اس قسم کے مزخرفات پر دانت نکال کر خوش ہوں ! اور اس پھکڑ بازی کو نعوذ باللہ کلامِ الٰہی کا وعظ سمجھیں - تو وائے برحالِ شاں !

سرسید بھی یقیناً بہت خوش ہوئے ہوں گے - کہ اُن کے نیچری بھانڈ نے اُن کے لئے نہایت عمدہ خطاب نباشی کا تجویز کیا ہے - میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا - کہ مسٹر نذیر احمد اپنے الفاظ کا نتیجہ نہیں سمجھ سکتے تھے - بلکہ میں تو اُن کی اس تقریر سے یہی نتیجہ نکالتا ہوں - کہ وہ ان باتوں کو سمجھتے تھے ! اور خوب سمجھتے تھے - مگر بھانڈپن کا جذبہ اُن کی طبیعت پر اس قدر غالب ہے -

ا ڈھلمکے - بیل

مولوی نذیر احمد صاحب کے مدحیہ قصیدہ پر چند اور نوٹ

قدسی صاحب کے حاشیہ کو جو خلعت قبولیت عام کا ملا ہے۔ وہ اسی سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے اکثر اخبارات نے اس کو عزت کے ساتھ اپنے اخبارات میں شائع کیا لیکن قدسی صاحب نے مولوی نذیر احمد صاحب کے پورے قصیدہ پر حاشیہ نہیں دیا تھا جس کے دیکھنے کا پبلک کو نہایت شوق کے ساتھ انتظار رہے۔ اور اکثر احباب نے اپنے خطوط میں ہمیں بھی قدسی صاحب کو اسی طرف توجہ دلانے کے لئے لکھا ہے۔ خصوصاً پنجاب کے ایک لائق تحصیلدار صاحب نے تو ایک مفصل مراسلت اس بارہ میں قدسی صاحب کو توجہ دلانے کے لئے لکھی ہے۔ جو حسب موقع درج اخبار کی جائے گی۔ لیکن سردست ہم ان چند منظوم نوٹوں کا درج کرنا بھی خالی از ثواب نہیں سمجھتے۔ جو اخبار نہر نمبر ۷ بجنور میں **مؤید الاسلام** جناب مولوی محمد رحیم اللہ صاحب بجنوری کی طرف سے مولوی نذیر احمد صاحب کے مدحیہ قصیدہ کے دو تین اشعار کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔

اور وہ یہ ہیں :-

حسب مولویصاحب لٹے جاتے ہیں ہم سب کو بیٹے گھسیٹے قعر نکبت میں	اب ایسے رہ گئے ہیں مولوی اور پینٹھیا باقی
پڑھاتے ہیں سبق تحصیل حاصل زہد کا جب تاں	ہزار دل سے نہیں ہے ایک میں بسہر وغنا باقی

مؤید الاسلام صاحب تعجب ہے بنے ہیں جان کرانجان مولانا	یہ بھولا پن بھلا کب تک رہیگا آپکا باقی
نہیں زہد و قناعت اختراع عالمان ملت	وہ سمجھے عقل میں ہے جسکے کچھ نور ذکا باقی
احادیث صحیحہ اور قرآن منزل نے	دقیقہ ذم دنیا کا نہیں رکھا اٹھا باقی
صحابہ تابعین و اولیا جملہ اکابر کا	کتابوں میں سیر کی تذکرہ ہے جابجا باقی
نہ دنیائے دنی کی انکے دل میں تھی ذرا وقعت	دل و جان میں تھی انکے صرف حب کبریا باقی
اگر دنیائے فانی کو وہ دیتے دین پہ ترجیح	نہ رہتا آج تک اسلام کا ہرگز پتا باقی

لئے جاتے ہیں بہکائے مسلمانوں کو دوزخ میں
پڑھاتے ہیں سبق تحصیلِ دنیا کا وہ جس دن سے
عروسِ زالِ دنیا کے بنے ہیں اس قدر شیدا
دل و جان کیجئے پہلے نثارِ غمزۂ جانان
تعشق ہو تو ایسا ہو سخاوت ہو تو ایسی ہو

اب ایسے رہ گئے ہیں نیچری کے پیشوا باقی
ہزاروں سے نہیں ہے ایک میں خوفِ خدا باقی
کہ جس کے فرطِ الفت کی نہیں کچھ انتہا باقی
اب آمادہ ہیں دینے پر جو کچھ اسلام تھا باقی
رہے عالم میں جس کا ذکر تا روزِ جزا باقی

(مولوی حسب ضیا) یہ معیارِ لیاقت ہے، خدا شرمائے ہم سب کو
کہ دارالعلوم دہلی میں فضیلت اسکو کہتے ہیں

اگر علم و ہنر ہے بھی کہیں تھوڑا ذرا باقی
کہ میرے طرح ہیں دو چار یاں حرفِ آشنا باقی

(مولوی حسب الاسلام صاحب) لیاقت نام ہے اس دور میں تحصیلِ دنیا کا
نہ ایمان سے غرض اسکو نہ ہو اسلام سے مطلب
اور اسمیں وصف ہو یہ بھی کہ دے اس زور کا لکچر
سوا اسکے نہیں کچھ اور معیارِ لیاقت کے
یہاں تک نیچری فرقہ کو علمِ دین سے ضد ہے
تلے ہیں کہ اسکے مٹانے پر دل و جان سے ہیں آمادہ
مگر فضلِ خدائے پاک سے ہم کو یقین ہے یہ
جو باقی شعر ہیں تعریف تیرے سید میں - قدسی
دیا ہے طبعِ موزوں سے جواب باصواب ایسا
جزاک اللہ اے قدسی حمیت اس کو کہتے ہیں

بڑا لائق وہ ہے تیار ہو جس کے لکا باقی
زباں پر ہو خلافِ دل مگر صرف ادعا باقی
رہے جس سے نہ علمِ دین کا تسمہ لگا باقی
نہ ہو خوفِ خدا اسکو نہ ہو شرم و حیا باقی
کہ اس دورِ جہالت میں اگر ہے بھی تو ذرا باقی
خصوصاً اُن میں ہیں دو چار جو حرفِ آشنا باقی
رہے گا تا قیامت علمِ دینِ مصطفےٰ باقی
بہت... وہی سال عالم میں اسے رکھیو خدا باقی
نہیں ایسا رہا ہے اسمیں اب کسی کا حوصلہ باقی
دلِ پرنور میں ہے تیرے جوشِ اسلام کا باقی

کانفرنس دہلی ۱۹۰۲ء

فریضۂ نماز

ایک صاحب نے فرمایا۔ کیا خوب ہوتا۔ اگر یہ سب صاحب اس اتفاقی موقع پر عام مسلمانوں کے دکھانے کے ہی لئے شریک نماز جماعت ہو جاتے۔ کہ عوام کے دلوں سے بدگمانی رفع ہوتی۔ ورنہ محض کاغذی ہمدردی کبھی دلوں میں سچائی پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اگر دین سے آنکھیں بند کر کے صرف دنیاوی ترقی مقصود ہے۔ دنیاوی ترقی سلطانِ وقت کا طریق اختیار کرنے سے زیادہ دوسرے کسی کام میں نہیں ہو سکتی۔ حالی صاحب کا یہ شعر جو کانفرنس میں پڑھا تھا۔ نہایت مناسب وقت ہے ؎

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں

ایک روز جلسہ سہ پہر کے ختم ہوتے وقت اس مسجد میں عصر کی اذان ہوئی۔ جس کی سیڑھیوں کے پاس جلسہ کا مکان بنایا گیا تھا۔ اذان کے ختم ہوتے ہی جلسہ بھی برخاست ہوا۔ مگر مسجد میں بجز پانچ چھ ہمارے ہم سفر شہری معززین و چار پانچ اور اصحاب کے اس مرثیہ پڑھنے والے وفدائے قوم و مولوی کے گروہ سے برائے نام ایک بھی شریک نماز نہ ہوا۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ حق ہے۔ کسی نے نہایت افسوس سے کہا کہ "جو صاحب اسلام اسلام پکارتے ہیں۔ سلف کی زندہ مثال بنانے کے مدعی ہیں جلسہ کو اسلامی جلسہ بتاتے ہیں۔ اور نماز کے پاس تک نہیں جاتے۔ کیا جس قدر کارنامے جن کے بیان ہو کر جوش دلایا گیا۔ وہ سب تارک الصلوٰۃ تھے؟ دین نے فتح ان ہی لوگوں کے دست و بازو سے پائی ہے۔ ایک ظریف بول اٹھے یہ بابا قیام و قعود کوٹ پتلون سے نہیں ہو سکتا۔ اپنے اپنے کمروں میں جاویں۔ کپڑے اتاریں۔ جب نماز پڑھیں۔"

"وہی باقی" کا بقایا

اخبار رفیق ہند ۹ ۲ مارچ ۱۸۹۳ء

مسٹر نذیر احمد کی "باقی" والی نظم کا جواب تا حال اخبارات میں جاری ہے معلوم نہیں۔ کہ کب تک بے باقی ہو۔ ذیل میں ہم اپنے دہلوی ہمعصر شاعر نازک خیال مولوی محمد عبدالرحمٰن صاحب راسخ اڈیٹر اخبار بے مثال پنچ کی عمدہ نظم کو درج کرتے ہیں۔ جو واقعی داد کے قابل ہے۔ نظم مذکور تمام و کمال درج کئے جانے کے لائق تھی مگر عدم گنجائش کی وجہ سے ہم اس کا آخری حصہ درج اخبار کرتے ہیں۔

وہو ہذا

بڑی دولت ہے نیچر کی بڑی عزت ہے حضرت کی
کہ پاؤں میں کسی کے بوٹ ہی ٹوٹا پھٹا باقی

ہمیشہ سود لیتا ہے مقدم جن کی نیت میں
غضب ہے رہ گئے اب وہ ہمارے پیشوا باقی

مسلمانوں کو دیتے ہیں سبق یہ سود خواری کا
سمجھتے ہیں کہ اس سود خواری سے رہتا ہے غنا باقی

تمیز حلت و حرمت جو دنیا میں نہیں رکھتی
نہ ان میں دین باقی ہے نہ ایمان کا پتا باقی

الا یا ایہا الناس کلوا من طیبات الارض
رہے گا سود خواری کا یہ کب تک خرخشا باقی

نماز و روزہ ان کا سود ہے یا لاٹری بازی
رہا یہ نیچری بندوں میں شغل ناروا باقی

یہ مانا نزع کی حالت میں ہے اسلام بیچارہ
مگر ہے سائنس کے ہمراہ امید شفا باقی

علیگڈھ کے مسیحا ہیں اگر مایوس ہونے دو
مسلمانوں کو ہے امید رحمت اے خدا باقی

اگر شہرت پہ ہے موقوف ہمدردی تو یہ کہہ دو
کوئی شیطان کا ثانی ہے شیطان کے سوا باقی

مسلمانوں نے بلکہ دیدیئے ہیں کفر کے فتوے
قیامت کے لئے رکھا نہیں یہ فیصلہ باقی

ڈبوئی ناؤ سیکھنے ہے خضر نے! سچ تو کہتے ہیں
نہیں ڈوبی تو ڈوبے گی رہا گر ناخدا باقی

جز اک اعلیٰ مولانا۔ فصاحت کے یہ معنی ہیں
کہ ہے بجنور کی منطق بھلا باقی۔ اٹھا باقی

مراتب طے کئے سید نے سب دنیا پرستی کے
کسی کے واسطے رکھا نہ کوئی مرتبا باقی

ہجا میں ہجو کے معنی بھی ہیں یہ کیا کہا حضرت
نہیں اس شعر میں کوئی دقیقہ ہجو کا باقی

طریق مختصر پر گر ترے القاب یکجا ہوں
تو مشکل ہے کہ ابجد میں رہے حرف ہجا باقی

کوئی سمجھے تو سی ایس آئی ایل ایل ڈی ہی سی ہر طا ہے
کہ ہیں سید کے پڑھنے کو ابھی حرف ہجا باقی

یہ کیسی دردمندی ہے کہ لیکر نام چندہ کا
گلا کاٹیں ہمارا اور پھر ہم سے رگلا باقی

محال عقل ہے اب ہو گئی ہو دل میں سید کے
سوا چندہ کسے کوئی آرزو یا التجا باقی

یہ سچ ہے "ہر چہ باشد پیر حرص او جوان گردد"
کمانے کیلئے ہے نیچری بوڑھا بڑا باقی

ہوئیں پنجاب میں برگشتہ سید سے بہت قومیں
دکن میں کامیابی کا نہیں اب حوصلا باقی

کوئی دم میں مٹا ہندوستان سے نیچری فیشن
اور اسکو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

مسلمانوں اٹھاؤ ہاتھ للہ وقت ہمت ہے
تمہارے پاس کیا ہے غیر تدبیر دعا باقی

نمازیں پڑھ کے با عجز و نیاز و گریہ زاری
خدا سے یوں کہوں "یا قاضی الحاجات یا باقی"

طفیل شافع محشر بچالے نیچری شر سے
مسلمانوں کو تیری ذات کا ہے آسرا باقی

نصیب دشمنان دین احمد ذلت و خواری
"وقار و عزت اسلام تا روز جزا باقی"

مقدم دین پر دنیا کو جو رکھتا ہے نادان ہے
معاذ اللہ۔ توبہ ہے۔ کجا فانی۔ کجا باقی

زبان خامۂ راسخ نے یہ جو کچھ کہا کم ہے
ابھی دل میں بہت کچھ ہے ہمارے مدعا باقی

سرسید کا نیچری بھانڈ لاہور میں

جن لوگوں کو مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کے پبلک افعال و اقوال کو بخوبی دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اور خصوصاً جن صاحبوں نے پبلک جلسوں میں اُن کے لکچر۔ اُن کے انداز بیان۔ ہاتھ بنانے۔ منہ بنانے۔ اُچھلنے۔ کودنے۔ پھدکنے۔ پھبتیاں سنانے۔ نقالی کرنے۔ توہین مذہب کرنے تمسخر کرنے فحش قصے سنانے اور علی الخصوص سرسید کی بیہودہ اور کمینہ قسم کی مدح سرائی کرنے کا تماشا دیکھا ہے۔ اُن کی آگاہی کے لئے بہ مشکل یہ بتانے

کی ضرورت ہے کہ **نیچری بھانڈ** سے کون شخص مراد ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس دہلوی "جنٹلمین" نے بھانڈپن کے اعلےٰ سے اعلےٰ قابلیت کے ایسے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس خطاب کا مستحق ثابت کردکھایا ہے۔ اور اپنے اکٹ کو حتی الامکان اپنی پوری بھانڈپن کی لیاقت سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے اپنے پرچہ میں لکھدیا تھا۔ کہ نیچری بھانڈ صاحب بہتر ہو۔ اگر لاہور کے کسی اسلامی جلسہ میں تشریف نہ لائیں۔ کیونکہ مسلمانان لاہور غالباً اس ٹائپ کے آدمی کو اپنے کسی اسلامی جلسہ میں دیکھکر خوش نہ ہونگے۔ اُس کے بعد ہمیں یقین دلایا گیا۔ کہ نیچری بھانڈ صاحب اس دفعہ بھانڈپن کے جامہ میں تشریف نہ لائینگے۔ اور ہم سے درخواست کی گئی۔ کہ ہم اپنے نوٹ پر زیادہ زور دینے سے باز رہیں۔ چنانچہ اس اطمینان دلائے جانے پر ہم نے مندرجہ ذیل نوٹ نوٹ رفیق ہند مطبوعہ ۲۲ رفروری میں درج کردیا تھا

"اگر یہ سچ ہے۔ کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے آنے والے جلسہ میں مولوی نذیر احمد صاحب جو تقریر کرنا چاہتے ہیں۔ اُس میں قدیم مذہب اسلام کی اس قسم کی مخالفت نہ کی جائے گی۔ جو انہوں نے سرسید کی کونفرنس میں کی۔ اور نیز سرسید کی بیہودہ مدح سرائی سے بھی وہ اپنے لکچر کو پاک رکھیں گے۔ اور مسلمانان لاہور پر بھی کوئی نالایق حملہ نہ کرینگے۔ اور ان کا لکچر اسلامی حدود کے اندر ہوگا۔ تو مولوی نذیر احمد صاحب سے کوئی ذاتی دشمنی کسی شخص کی نہیں۔ اور اس صورت میں ان کی لاہور کی تشریف آوری ہرگز مورد اعتراض نہیں ہوسکتی۔ اس کے ساتھ ہی ضرور ہے۔ کہ مولوی صاحب اپنے لکچر کو تمسخر اور پھبتیوں اور ہنسی سے بہت کچھ پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ مہذبانہ ظرافت گفتگو میں کالملح فی الطعام سے نہ بڑھنی چاہئے۔ کیونکہ اسلامی وعظ کے جلسہ کی یہ کوئی بڑی خوبی نہیں ہے۔ کہ بار بار کمرہ ہنسی اور قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھے"

آخر کار معلوم ہو گیا۔ کہ وہ اطمینان محض دھوکا تھا۔ اور نیچری بھانڈ صاحب کی عادت جو قریباً سیکنڈ نیچر ہوگئی ہیں۔ باوجود فہمائش کے ذرہ بھی دُور نہیں ہوئیں۔ نیچری بھانڈ

نے اپنی بعض پبلک تقریروں میں اپنے کالج میں تعلیم پانے اور امتحان پاس کرنے اور تمغے حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن پبلک کے لئے اس بات کا معلوم ہونا خالی از لطف نہ ہوگا۔ کہ مسٹر نذیر احمد نے بھانڈپن کی تعلیم کون سے کالج میں حاصل کی ہے۔ اور کون کون سا امتحان اس میں پاس کر کے کس قدر تمغے حاصل کئے ہیں۔ اُن کی تقریر سُن کر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ اگر آپ نے بھانڈوں کے کسی کالج میں تعلیم پائی ہوگی۔ تو ضرور اعلےٰ سے اعلےٰ امتحان کریڈٹ کے ساتھ پاس کیا ہوگا۔ کیونکہ اس کی ذہانت اور قابلیت اس خاص فن میں ایسی اعلےٰ ہے۔ کہ کسی تجربہ کار سے تجربہ کار اور خرانٹ سے خرانٹ گرگ کہن پرانم بھانڈ کو بھی رشک دلانے کے لئے کافی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اتنا کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتے۔ کہ سر سید کے بد مشن کی سیہ بختی۔ تیرہ روزگاری۔ اور نحوست وادبار کے پیش خیمہ کا اس سے بڑھ کر کوئی اور نشان نہیں ہو سکتا۔ کہ آخر عمر میں اُن کو اپنی تائید کے لئے اس نیچری بھانڈ کی شمولیت کا فخر حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ سر سید کا رہا سہا اثر جو پنجاب میں باقی تھا۔ اُس کو بھی بہت کچھ مسٹر نذیر احمد صاحب کی اس تازہ تشریف آوری نے ملیامیٹ کر دیا۔ اور نیچری بھانڈ نے اپنی تقریر سے سر سید کی نسبت ایسی نفرت کے خیالات پیدا کر دیئے ہیں۔ جن کو سُن کر بیچارہ سر سید کو بے اختیار پکار کر کہنا پڑے گا۔ کہ "مجھے اپنے ایسے دوستوں سے بچاؤ" سر سید کو اگر چند ایسے نادان دوست میسر ہو جائیں۔ تو رفیق ہند کو اپنے کام سے بہت کچھ سبکدوشی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہی لوگ سر سید کے رسوخ کی بربادی کے لئے کافی ہیں۔ انگریزی میں ڈُون کوکسوٹ (Don Quixote) کی مشہور ناول ہے جس میں ڈون کوکسوٹ نامی ایک شخص کا قصہ درج ہے جس کو حالت جنون میں مہین سر کرنے اور معرکہ آرائیوں میں نام پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

اور اس کے ساتھ ایک پنچ یعنی خدمت گار بھی زیر کمان اور ہمرکاب تھا۔ ان دونوں بدبختوں نے اپنے اس خیالی جنون میں عجیب عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کیں اور کئی موقعوں پر مسٹر ڈون کو کسوٹ کی سخت درجہ کی خرابی کا باعث اس کا ساتھی یعنی وہی پنچ ہوا۔ غرضکہ عجیب عجیب قابل تمسخر حالات ان دونوں فرضی شجاعوں کے اس قصہ میں درج ہیں۔ اسی طرح سرسید نے اپنے ملحدانہ جنون میں جو اسلام کے مقابل معرکہ آرائی کا بیڑا اٹھا کر بزعم خود بڑی بڑی مضحکہ خیز حرکتیں کی ہیں۔ اس میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پنچ کا منصب حاصل کرنے کے لئے مسٹر نذیر احمد نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ چنانچہ لاہور کے اس تازہ لکچر میں جو اب ہمارے زیر بحث ہے۔ اس نیچری بھانڈ نے اپنے آپ کو نذیر (یعنی ڈرانے والا) قرار دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ کہ "اصل ہیرو اور بشیر تو سرسید ہے۔ اور میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا آدمی ہوں"۔ واقعی ایسے ہیرو کے ساتھ ایسا ہی پنچ ہونا چاہئے تھا۔ جیسی روح ویسے فرشتے ع:

وزیرے چنیں شہریارے چنان

اگر مسٹر نذیر احمد اپنے نیچری نذیر کا نظیر بننے پر آمادہ ہیں۔ تو ہم بھی ان کو اس حماقت میں بے نظیر سمجھنے پر تیار ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ نیچری سلطنت اپنے ایسے ارکان دولت کے ساتھ اگر آج نہ ڈوبے۔ تو کل ضرور ڈوبے گی۔ اور مسٹر ڈون کو کسوٹ اور اس کے ہمراہی خادم کی طرح اخیر میں انشاء اللہ تعالےٰ عنقریب خراب وخستہ دکھائی دینگے ؂

گربہ میر و سگ وزیر و موش ور بانی کنند
این چنین ارکانِ دولت خانہ ویرانی کنند

انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں لکچر دیتے وقت مسٹر نذیر احمد کی ہیئت اور حالت قابلِ دید تھی۔ اور واقعی بہت ہی واجب الرحم تھی جس کو دیکھ کر بے اختیار

عام لوگوں کی رائے یہی قرار پائی۔ کہ اس پیر کہن سال کے دماغ پر پبلک اور خصوصاً اخبارات کی مخالفت نے نہایت خوف ناک اثر کیا ہے مسٹر نذیر احمد کا جوشش اور غصہ پھٹا پڑتا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ اپنی بھانڈپن کی لیاقت کے ذریعہ تمسخر اور تضحیک کا کوئی وقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے۔ لیکن تاہم غیظ و غضب اور مایوسی اور ادبار کے آثار بار بار ان کے چہرہ اور تقریر سے پیدا ہو جاتے تھے۔ اور جھلاہٹ اور جھنجلاہٹ کی کوئی حد و انتہا نہ رہ جاتی تھی۔ اِس کھسیانے شخص کی یہ ابتر حالت دیکھ کر گو اکثر اشخاص ہنستے تھے۔ اور تالیاں بجا بجا کر چھیڑتے تھے۔ لیکن بعض رفیق القلب اشخاص کو نہایت درد پیدا ہوتا تھا۔ کہ ان کا پرانا نقل مجلس ایسی تکلیف اور درد میں مبتلا ہے۔ کہ اُس کا سلسلۂ سخن بالکل قائم نہیں رہتا۔ کہ ابھی دو منٹ ہوئے کیا کہ رہا تھا۔ اور اب کیا بک رہا ہے۔ غرضکہ پبلک مخالفت اور جوش کی وجہ سے دیوانہ ہو جانے کا ایک عجیب مجسم نمونہ مسٹر نذیر احمد اس جلسہ میں دکھائی دیتے تھے۔ مسٹر نذیر احمد کے اِس جنون اور وحشیانہ حالت کی کیفیت اُس وقت قابل دید ہوتی تھی۔ جبکہ وہ نہایت خونخوار چہرہ بنا کر سجدہ کرتے تھے۔ اور بہت بڑا اثر جلسہ پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اور اُن کی اُس کھسیانی صورت پر ناظرین قہقہہ مار کر اور بعض دفعہ اُن کے پیچھے تالیاں بجا کر اُن پر اور زیادہ تمسخر کرتے تھے۔ اُس وقت مسٹر نذیر احمد بڑے جوش و خروش کے ساتھ سرسید کے مخالفوں کو اور اپنے مخالفوں کو جل بھُن کر اور زیادہ ملاحیان ستاتے تھے۔ اور بڑے غصے میں آ کر کہتے تھے کہ "سرسید کی وجہ سے مجھے ذلیل کیا جاتا ہے"۔ اور ایسے ہی فقرات کہتے کہتے مسٹر نذیر احمد جوش غضب میں بچوں کی طرح بسور کر رونے لگ جاتے تھے۔ اور گو مسٹر نذیر احمد بزرگان اسلام کے پیرودل کے عقائد پر چھری چلانے میں بالکل ایک **بوڑھے فضائی** کا پارٹ ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے لیکن ان کی یہ

حرکات مذبوحی اور خصوصاً ہچکیاں لے کر رونے اور آنسوؤں کی طغیانی سے بعض اوقات لوگوں کو خیال پیدا ہو جاتا تھا۔ کہ اس آفتابِ لبِ بام کی صاحبان اخبار نے اس قدر گت کیوں بنائی ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت ایسی ابتر ہو گئی ہے۔ کسی پبلک جلسہ میں بیہودگی سے ہاتھ پھرانا۔ پاؤں چلانا۔ آنکھیں مٹکانا۔ چہرے کی عجیب عجیب ہیئت بنانا۔ اپنا ناک پکڑ کر کھینچنا۔ ایک آنکھ رونا ایک آنکھ ہنسنا۔ فحش باتیں بکنا۔ اور واہی تباہی بجواس کرنا۔ اگر کسی شخص کو مجنون اور فاترالعقل ثابت کرنے کے لئے کافی آثار ثابت ہو سکتے ہیں۔ تو اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ نیچریوں کا مشہور نقل مجلس اس جلسہ میں بالکل مخبوط الحواس ہو رہا تھا۔ اور حاضرین کی طرف سے مختلف قسم کی چھیڑ چھاڑ پر اس کو اور زیادہ جھلاہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس کی آواز بھرا اٹھتی تھی۔ اور اس وقت بیچارہ نذیر احمد اپنی بریت کے لئے یہ فقرات کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ کہ "صاحبو! میں سرسید کا بھانڈ نہیں۔ میں نیچری نہیں۔ میں نے سرسید کے سامنے اور خاص نیچر گڑھ میں بھی سرسید کی مخالفت کر دی تھی۔ اگر سرسید استاد ہے۔ تو میں شاگرد نہیں۔ اگر وہ پیر ہے۔ تو میں مرید نہیں۔ اگر وہ ہادی ہے۔ تو میں پیرو نہیں"۔ لیکن ان فقرات کے کہتے ہی اس فلک زدہ نیچری بھانڈ کے چہرہ سے پشیمانی کے آثار معلوم ہونے لگتے تھے! اور قیافہ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کو اپنے بھانڈپن کے عہدہ سے معزولی کا اس قدر خوف ہے۔ کہ پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد سرسید کی مدح سرائی میں مشغول ہو جاتا تھا۔ اور سرسید کو اپنا پیر اور اپنے آپ کو اس کا ہیچ ثابت کرنے میں یہاں تک بڑھ جاتا تھا۔ کہ سلف کے شاہانِ اسلام اور علمائے سلف و حال کو گالیاں دیکر اُن کے مقابلہ میں سرسید کو ترجیح دیتا تھا۔ اور اس طرح سے مصنفِ کتاب **ابن الوقت** کو سخت مشکل پیش آئی۔ کہ وہ کس طرح دونوں طرف سے اپنے آپ کو سرخرو کر سکے۔ اسی کشمکش اور ردوبدل میں اس نے کئی گھنٹے ضایع

کر دیئے ۔ اور کچھ پتہ نہ لگتا تھا ۔ کہ لکچر کا مضمون کیا ہے مسلمانوں کو تو یہ شخص گالیاں ہی دیتا تھا ۔ آخر کار ہندوؤں تک بھی نوبت پہنچا دی ۔ اُس جلسہ میں قریباً چوتھا حصہ نہایت معزز اور مقتدر اہل ہنود و صاحبان تھے ۔ مگر اُس جوشِ وحشت اور زور جنون میں آپ نے ہندوؤں کو مخاطب کر کے فرمایا ۔ کہ" او ہندوؤ ا ۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے ۔ تو پڑ و چولہے ہیں " اب ہندو بیچارے حیران تھے کہ ہم بنظرِ ہمدردی حمایت اسلام کے بلائے ہوئے اس جلسہ میں آئے ہیں اور یہ نالائق شخص اس طرح کا سلوک مہمانوں سے کرتا ہے ۔ کہ قریب تھا کہ کوئی ہندو مسٹر نذیر احمد کو ٹھیک بناتا ۔ مگر انجمن حمایت اسلام کے بعض ممبر بیچارے چاروں طرف لوگوں کو سمجھاتے تھے ۔ ورنہ ہندوؤں کے علاوہ قدیم عقائد کے مسلمانوں کو اس قدر جوش پیدا ہو رہا تھا ۔ کہ ان میں سے اکثر اس بات پر تیار تھے ۔ کہ مسٹر نذیر احمد کی ایسی تواضع اسی جلسہ میں کی جاتی ۔ کہ ان کو تمام عمر کے لئے پورا سبق مل جاتا ۔ اور پھر تمام عمر کے لئے پبلک جلسوں میں اپنا بھانڈ پن کا پارٹ ادا کرنے سے باز آ جاتے ۔ لیکن حمایت اسلام کے ممبروں کو یہی خیال تھا کہ جلسہ میں بدمزگی پیدا ہونے سے تمام لطف سالانہ جلسہ کا جاتا رہے گا ۔ اور انجمن حمایت اسلام جس کے ممبروں کے پہلے ہی باہمی نفاق پر پبلک کو اس قدر افسوس ہے ۔ اس کو اور زیادہ صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے ۔ اس لئے ان کی درخواست تھی ۔ کہ انجمن حمایت اسلام کی خاطر وہ اس نیچری بھانڈ کو اس موقع پر اس کے کیفر کردار کو پہنچانے سے باز رہیں لیکن نیچری بھانڈ کی بدقسمتی تھی ۔ کہ وہ بڑھتے بڑھتے اولیاء اللہ کی شان میں اور خصوصاً گستاخانہ حضرت شاہ بغداد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ معین الدین صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی شانِ عالی میں بھی کلمات ہتک بکنے سے باز نہ رہا ۔ اور خواجگان چشت اہل بہشت رحمۃ اللہ علیہ علیہم اجمعین کی محفلِ سماع پر پھبتیاں سنانے لگے علاوہ اُن کے مزارات پر انوا

اور عرس مبارک اور عقائد بزرگان سلسلہ فقرا پر بھی ایسے ناجیانہ طریق سے بحث شروع کی۔ کہ اس وقت مسلمانان ہا غیرت کو انتہا درجہ کا جوش پیدا ہو گیا۔ جس کو زیادہ عرصہ تک روکنا مشکل تھا۔ اور آخر کار مجبوراً کارکنان حمایت اسلام نے مسٹر نذیر احمد سے درخواست کی۔ کہ وہ اپنی تقریر کو ختم کریں مسٹر نذیر احمد جو اپنی مخالفت اور خصوصاً اس جلسہ میں حاضرین کی چھیڑ چھاڑ سے سخت جھلائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس روکنے پر بڑے سخت بگڑے۔ کہ "جب تم لوگوں نے مجھے تقریر کی اجازت دی ہے۔ تو مجھے اپنے خیالات کیوں نہیں ظاہر کرنے دیتے" یہ کہ کر پھر کچھ بولنا شروع کر دیا۔ اس وقت لوگوں نے پیچھے سے ان کے کپڑے کو کھینچا۔ اور خاموشی کی صلاح دی۔ اس کپڑا کھینچنے پر اکثر لوگوں کو "**حالا کشید بند**" والا لطیفہ یاد آگیا۔ جو یوں ہے۔ کہ ایک بادشاہ کی وفات پر اس کا ایک بدتمیز جوان لڑکا رہ گیا۔ جو نہایت بے وقوف اور بیہودہ اور بے موقع لغو گفتگو کر دیا کرتا تھا۔ وزرائے سلطنت نے سوچا۔ کہ اس کو تخت نشین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اور یہ سر دربار اپنی بیہودگی کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا اور ہر وقت سر دربار اس کو ٹوکنا خلاف ادب سلطنت ہے۔ لہذا سب نے تجویز کر کے بیہودہ گفتگو سے روکنے کے لئے شہزادہ کو یہ بات بنا کر سنائی۔ کہ آپ کے بزرگوں سے یہ دستور چلا آتا ہے۔ کہ جب کوئی نیا بادشاہ تخت نشین ہو۔ تو اس کے تخت کے نیچے ایک مخفی حجرہ بنایا جاتا ہے۔ تخت پر بادشاہ بیٹھتا ہے۔ اور پوشیدہ حجرہ میں ایک وزیر رہتا ہے۔ بادشاہ کی کمر میں کپڑوں کے اندر پوشیدہ ایک رسی ڈال کر اس کا سرا وزیر اس تخت کے نیچے والی مخفی حجرے میں پکڑے رکھتا ہے۔ اور جب وزیر اس رسی کو نیچے سے کھینچے۔ تو بادشاہ کا فرض ہوتا ہے۔ کہ فی الفور خاموش ہو جائے۔ شہزادہ نے کہا۔ کہ "جب

میرے بزرگوں سے یہ طریق چلا آتا ہے۔ تو اس کے ماننے میں کیا عذر ہے"۔ چنانچہ آپ کی تخت نشینی کے دن ایسا ہی کیا گیا۔ اور مختلف سلطنتوں کے سفیر مبارک باد کے لئے حاضر ہوئے۔ سب نے تحائف پیش کئے۔ شہزادہ صاحب خاموش تخت پر بیٹھے رہے۔ لیکن جب شاہِ ایران کا سفیر پیش ہوا۔ تو آپ کے سمندِ طبع نے بے اختیار جولانی دکھائی۔ اور سفیر سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ کہ "ملکِ شما ہم دستور است کہ چوں پادشاہِ نو بر تخت بنشیند۔ در کمر اور سن ــــــ" یہاں تک پہنچے ہی تھے۔ کہ نیچے سے وزیر نے بڑے زور کے ساتھ رسی کو کھینچا۔ اور پادشاہ سلامت خاموش ہو گئے۔ سفیرِ ایران نے حیران ہو کر پوچھا۔ کہ "قبلہ عالم۔ چہ فرمودند؟" اس کے جواب میں پادشاہ سلامت بولے کہ "**حالا کشیدند**" جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ اب وزیر نے نیچے سے رسی کھینچی ہے۔ لہذا میں نہیں بول سکتا۔ غرضکہ حمایت اسلام کے ممبروں کو یہ تو معلوم نہ تھا۔ کہ یہاں بھی "حالا کشیدند" کی ضرورت پڑے گی۔ ورنہ عجب نہ تھا۔ کہ مسٹر نذیر احمد کے ساتھ کوئی نشان ان کو لغو گفتگو سے روکنے کا مقرر کر لیتے۔ لہذا مجبوراً پیچھے سے ان کا کپڑا کھینچ کر ان کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ جس پر مسٹر نذیر احمد نے بھی دوسرے الفاظ میں حاضرین جلسہ کے سامنے یہ شکایت کی۔ کہ دیکھئے صاحبان!۔ یہ لوگ مجھے **حالا کشیدند** کرتے ہیں۔ اور اس فریاد کے بعد پھر اپنی بکواس شروع کر دی۔ نیچری بھانڈ کی اس ڈھٹائی سے مجبور ہو کر لوگوں نے پیچھے سے ان کو ہاتھ چبھونے شروع کئے۔ اور اس وقت مسٹر نذیر احمد نہایت غیظ و غضب میں آ کر بولے۔ کہ "دیکھو صاحبو! مجھے پیچھے سے بھالے چبھوئے جاتے ہیں۔ میری زبان بند کی جاتی ہے۔ مجھے بار بار اظہار خیالات سے روکا جاتا ہے"۔ نیچری بھانڈ کی اس بیہودگی پر آخر کار لوگوں میں ایک قسم کا غلغلہ سا پیدا ہو گیا۔ اور چاروں طرف عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کوئی کہتا تھا "میاں! لوگوں کو نماز پڑھنے دو"!

کوئی کہتا تھا" نماز کا وقت آ گیا۔ اور یہ اپنی بکواس بند نہیں کرتا" کوئی کہتا تھا" نماز سے روکنا شیطان کا کام ہے" کوئی کہتا تھا "جب خود سُو دکھاتا ہے تو نماز کی کیا پرواہ ہے" کوئی کہتا تھا" بیچارے کو اپنا دکھڑا تو رو لینے دو" کوئی کہتا تھا" پاگل کو چپ کراؤ" اور اس کے ساتھ ہی یہ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کہ" چندہ کا وقت اس نے ضائع کر دیا۔ اور مولوی حسن علی صاحب کی عمدہ تقریر سے محروم رکھا" اور عموماً لوگ یہ کہتے ہوئے سنائے دیتے تھے کہ" اس بے وقوف بڈھے نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کو اپنے ذاتی عناد اور دلی بخارات نکالنے کا موقع سمجھ لیا۔ اور رنگ میں بھنگ ڈال کر دماغوں کو منتشر کر دیا۔ اور بجائے اس کے کہ جو سابقہ تفرقہ انجمن میں موجود ہے۔ اُس کو دور کرنے کی سعی کرتا۔ یہ تازہ شوشہ فساد کا چھوڑ دیا ہے"۔ غرضکہ غنیمت ہوا مسٹر نذیر احمد صاحب آخر کار اپنے دریائے لغویت کو روک کر مجبوراً بیٹھ گئے ورنہ اگر زیادہ سبکی دکھاتے۔ تو جہاں تک لوگوں کے خیالات کا اندازہ کرنے کا ہمیں موقع ملا۔ نیچری بھانڈ صاحب نہایت بے عزتی کے ساتھ سختی سے بٹھائے جاتے۔ اور اگر اس پر بھی اپنی بیہودگی سے باز نہ آتے۔ تو فی الفور جلسہ سے نکال دیئے جاتے۔ ان کے بیٹھتے ہی مولوی حسن علی صاحب اٹھے۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ" صاحبان! جب رپورٹ سالانہ پڑھی گئی۔ تو میرے دل میں بڑے ہی جوش اور ولولے پیدا ہوئے۔ اور اگر اس کے بعد ہی مجھے بولنے کا موقع ملتا۔ تو میرے دل میں اتنا درد تھا۔ کہ سب صاحبان کو رونے کی ہچکی بندھ جاتی۔ لیکن مولوی نذیر احمد صاحب کی اس طول تقریر نے میرے خیالات کو بالکل منتشر کر دیا۔ اور طبیعت کی افسردگی کے باعث اب کچھ نہیں بول سکتا"۔ مولوی حسن علی صاحب نے یہ کہہ کر اور یہ جتا کر کہ نذیر احمد صاحب نے میری تقریر کے

ذلت کو بھی غصب کر لیا۔ چند مختصر اور مؤثر فقرات پر اپنی تقریر کو ختم کیا۔ اور پھر تو مجلس کا یہ رنگ دیکھ کر نذیر احمد صاحب کی آواز بھی اُس جلسہ میں سُنائی نہ دی۔ اس موقع پر اتنا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ اسی سالانہ جلسہ میں مولوی حسن علی صاحب نے جو تقریر مولوی نذیر احمد سے پہلے کی تھی۔ اُس میں مسلمانان لورپول کی انتہا درجہ کی حمایت کی تھی۔ اور گو اُس میں نذیر احمد صاحب کی اُس تقریر کا کوئی حوالہ نہ تھا۔ جو اُنہوں نے سر سید کی کونفرنس میں مسلمانانِ لورپول کے برخلاف کی تھی۔ لیکن ان ڈائرکٹلی وہ مسٹر نذیر احمد کے لغو اور پوچ اعتراضات کا ایک ایسا شافی جواب تھی۔ کہ اُس میں نذیر احمد صاحب کی بیہودہ مخالفت کی دھجیاں اور پرخچے اور پرزے اڑا کر دکھائے گئے تھے۔ اور ساتھ ہی مولوی حسن علی صاحب نے سر سید کے مذہبی خیالات کے متعلق فرمایا۔ کہ میں سر سید کے مذہبی خیالات کو غلط اور بالکل غلط سمجھتا ہوں۔ اور میں ان سے بالکل اور قطعی اختلاف رکھتا ہوں۔ اور بعض لوگوں کا خیال تھا۔ کہ مسٹر نذیر احمد جو اپنے لکچر میں اس درجہ تک کھسیانے اور جھلائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ زیادہ تر مولوی حسن علی صاحب کا وہ پہلا لکچر تھا۔ جس میں اُنہوں نے مسلمانانِ لورپول کی تائید میں ایک نہایت پُرجوش تقریر کی۔ اور اُن کی عالی ہمتی اور سچے اسلامی جوش کے متعلق مفصل حالات بیان کئے۔ مگر غنیمت ہے۔ کہ مسلمانانِ لورپول اس جلسہ میں نیچری بھانڈ کی زبان سے محفوظ رہے۔ خواہ اس کو رفیق ہند کے اُس نوٹ کا نتیجہ سمجھو۔ جس کو ہم اوپر پورا نقل کر چکے ہیں۔ اور خواہ اس کو کسی اور وجہ سے خیال کرو۔ لیکن افسوس ہے کہ سر سید جیسے مخرب اسلام کی مذہبی مدح سرائی اور بزرگانِ سلف کی ہتک سے نیچری بھانڈ صاحب اپنی طبیعت کو روک نہ سکے۔ جس کی وجہ اُنہوں نے اُسی جلسہ میں خود بیان کر دی۔ کہ بعض طبائع ہی ایسی نیش زن واقع ہوئی ہیں

کہ نیش زنی سے باز نہیں رہ سکتیں۔ حتیٰ کہ ؎

دود شوند از بد ماغے رسند
باد شوند از بچراغے رسند

نیچری بھانڈ باوجودیکہ اپنے نام کے ساتھ مولوی اور حافظ کا لقب بھی رکھتا ہے۔ با ایں ہمہ اُس کی طبیعت میں بھانڈ پن اور تمسخر ایسا کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا ہے۔ کہ جلسہ میں آتے ہی پہلے نہ بسم اللہ۔ نہ خدا کا نام۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام۔ نہ حمد۔ نہ نعت۔ نہ درود۔ نہ کوئی اسلامی مسئلہ۔ اور نہ کوئی عمدہ بات۔ اوّل اپنی وعظ کو شروع ہی یہاں سے کیا کہ "میں تمہیں ایک ہنسی کی بات سُناتا ہوں"۔ لعنت ہے تیری اس ہنسی پر۔ کمبخت! جوانی میں بہتیرا ہنس چکا۔ اب بڑھاپے میں بھی تمسخر اور ہنسی کو نہیں چھوڑتا۔ مولوی اور حافظ کہلاتا ہے۔ کلام الٰہی کو تو پڑھا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ تھوڑا ہنسو۔ اور بہت روؤ۔ مگر تجھے دنیاوی ثروت نے ایسا بیخود کر دیا ہے۔ اور سُود خواری نے ایسا بے باک کر دیا ہے۔ اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ کہ ہر موقع پر حتیٰ کہ اسلام کی مجلس وعظ میں بھی ہنسی سے نہیں چوکتا۔ ہنسی ہنسی ہنسی۔ آخر یہ ہنسی کہاں تک؟ بوڑھے منہ مہاسے۔ چٹی ڈاڑھی اور آٹا خراب۔ بھلا غور کا مقام ہے۔ کہ اتنی ہنسی اور اتنا تمسخر کس لئے؟ کیا اس بڑھاپے میں یہ کوئی عمدہ نمونہ ہے۔ جو تو ہمارے نوجوانوں کے سامنے پیش کرتا ہے؟ کیا تو نے عاقبت اور انجام کو بالکل بھلا دیا ہے۔ کہ اتنا تمسخر میں محو ہو گیا ہے؟ تیرے سے یہ کوئی ہنسی کے دن ہیں؟ ایک سفید بال کو پیام موت کہا جاتا ہے۔
تیری تو داڑھی کے سارے ہی بال سفید ہیں۔ اور سر بھی سفید ہو چکا ہے ؎

ترا برف بارید بر پرِ زاغ
نہ شاید چو بلبل تماشائے باغ

نزیبد ترا با جوانان چمید
کہ بر عارضت صبح پیری دمید
بباید ترا ہمچو طفلان گریست
ز شرم گناہاں - نہ طفلانہ زیست

مقام غور ہے - کہ اس پیرانہ سالی میں مولوی اور حافظ اور واعظ کا لقب لیکر وعظ کے منبر پر کھڑا ہوتا ہے - لوگوں کو نصیحت کرنے کا مدعی ہوتا ہے - اور کہیں لکھنؤ والوں کی نقلیں اُتار کر دکھاتا ہے - کہیں بنیوں کی نقلیں اُتارتا ہے - کہیں کچھ تماشا کرتا ہے - اور کہیں کچھ - غرضکہ بھانڈ پن کے کرتب دکھاتا ہے - اور دعوی لوگوں کی ہدایت اور ریفارم کا کرتا ہے - کیا غیر قوموں کے سامنے یہ کوئی عمدہ نمونہ ہمارے واعظوں کا ہو سکتا ہے؟ اور ایسے وعظ کو سُنکر وہ سوائے اس کے کیا کہہ سکتے ہیں - کہ نعوذ باللہ اسلام میں نقالی اور بھانڈپن کا نام وعظ اور نقالوں اور بھانڈوں کا نام واعظ ہے - حیف ہے اس مسلمانی پر اور لعنت ہے اس ریفارمری پر -

اس گندہ خیالی کی بھی کوئی حد ہے - کہ اس مجلس میں جہاں ہمارے خورد سال نوجوان بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے - مسٹر نذیر احمد نے حرصی ٹٹوؤں کی طرح **بی بی تمیز** کا قصہ سنانا شروع کر دیا - اور پھر بی بی تمیز کی بدچلنی کا مجمل حال بتانے پر ہی اکتفا نہیں کی - بلکہ بایں پیرانہ سالی اور ریش مقطع تفصیل سے اُس کی زناکاری کا حال گندہ الفاظ میں پوست کندہ بیان کرنا شروع کر دیا - اور پورا بیان کر کے چھوڑا - جس ذوق شوق سے نیچری بھانڈ نے اس قصہ کو ادا کیا - اُس سے معلوم ہوتا تھا - کہ اُس کو اس گندہ قصہ میں کوئی خاص لطف آتا ہے - حتّٰے کہ باجھا مفتوحتہ اور رجلها مرفوعتہ والا شعر بھی پڑھ دیا - اس سے معلوم ہوتا ہے - کہ مدح چون پیر شود حرص جوان مے گردد والا مقولہ غلط نہیں - اور غالباً اس

بڑھاپے میں بابہا مفتوحۃ اور جلبہا مرفوعۃ کے تصور سے ہی اس پیر کہن سال کو کوئی ایسا خاص لطف آتا ہوگا۔ جس کے نشہ میں محو ہوکر وہ اتنا بھی نہ دیکھ سکا۔ کہ اس جلسہ میں نوجوان بچے جو اس کے بیٹوں اور پوتوں اور پڑپوتوں کی عمر کے تھے۔ اس کی اس فحش بیانی پر مارے شرم کے اپنی آنکھیں نیچے کئے ہوئے تھے۔ مگر آفرین ہے اس بوالہوس بڈھے کی بے حیائی پر کہ اس اپنی بی بی تمیز کی تمام کہانی میں ذرا بھی نہیں جھجکا۔ کیا کہنا ہے۔ عمر گرامی ہفتاد و شش۔ نازم بہ ایں ریش و فش با۔

ہم حیران ہیں۔ کہ اس گندہ خیال شخص کی گندہ خیالی کی تفصیل کہاں تک کریں۔ اس وعظ میں آپ نے یہ فقرہ بھی بتکرار بڑے زور شور سے لوگوں کو سنایا۔ کہ "گوز تو بند می شود" و "عقل تو گم می شود" اور پھر "گوز تو بند می شود و عقل تو گم می شود" گوز کے لفظ کو آپ نہایت چبا کر بڑے لطف سے اور بڑے مزے سے ادا فرماتے تھے۔ جیسے آپ کا منہ بھر جاتا تھا۔ اور جیسے معلوم ہوتا تھا۔ کہ آنجناب کو اسے بڑا ہی لطف آیا ہے۔ مولوی صاحب کے منہ سے گوز کی آواز بڑے زور سے نکلتی تھی۔ اور نہ معلوم یہ مقدس آواز کس زور کے ساتھ کہاں کہاں سے نکلتی تھی۔ کہ جس کی اتنی بڑی موٹی صدا حاضرین مجلس کو سنائی دیتی تھی۔ گوز کو آپ بڑی پیچیدگی اور زور کے ساتھ گوزہا کہکر پکارتے تھے۔ کہ "گوزہا تو بند می شود و عقل تو گم می شود" اور سچ تو یہ ہے۔ کہ مسٹر نذیر احمد اس توجہ اور سعت کے ساتھ اس لفظ کو ادا فرماتے تھے۔ کہ اس وقت خود مجسم گوز نظر آتے تھے۔ اور ان کے منہ سے ایسی صدائے بلند گوز کی نکلتی تھی۔ کہ باوجودیکہ اس وقت عین بارہ بجے کی توپ چلنے کا وقت تھا۔ مگر بہ مشکل حاضرین جلسہ میں سے کسی کے کانوں میں توپ کی آواز پہنچی ہوگی۔ اس کے ساتھ

ہی ہم اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ کہ اکثر لطیف طبع اور مہذب اشخاص مسٹر نذیر احمد کی اس گوز بازی کے سُننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور اس لئے اس مکروہ آواز اور مسٹر نذیر احمد کی گندہ خیالی کی بدبو نے اکثر حاضرینِ جلسہ کے دماغ کو پریشان کرنے کے علاوہ جلسہ کے چندہ پر بھی بہت بُرا اثر پیدا کیا۔ اور یقیناً یہ منحوس صدائے بے ہنگام ہندوستان کے جس جس کونے میں پہنچے گی۔ ضرور تمام لطیف طبع اشخاص کے دماغ کو تکلیف دینے کا باعث ہو گی۔ کاش۔ یہ گوز سرسید کی کونفرنس سے نکلتا۔ تو اتنا قابلِ اعتراض نہ تھا۔

مقام غور ہے۔ کہ وعظ کی مسند جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند ہے اُس پر کھڑا ہو کر کلام الٰہی کو ساتھ لیکر۔ واعظ کے پیرایہ میں مذہبی پندونصائح کے لئے مولوی اور حافظ بن کر ایک شخص کھڑا ہوتا ہے۔ اور ایسی بیہودگی کے ساتھ میراثیوں اور ڈوموں کی طرح اس قسم کے مزخرفات اور فحش باتیں اور گوز بازی کے بیہودہ لطیفے سُنانے کے علاوہ بھانڈوں کی طرح کبھی کسی کی نقلیں کرتا ہے۔ اور کبھی کسی پر پھبتیاں سُناتا ہے۔ کبھی منہ بناتا ہے۔ کبھی کودتا ہے۔ کبھی اُچھلتا ہے۔ اور کبھی پھدکتا ہے۔ غرضکہ عجیب عجیب طرح کے رنگ دکھاتا ہے۔ تو ایسے شخص کو جس قدر ذلیل کیا جائے۔ اور جس قدر اپنی سوسائٹی سے الگ رکھا جائے۔ اُسی قدر بہتر ہے۔ یہ شخص اُس مقدس مسند کی ہتک کرتا ہے۔ جو دنیا میں تہذیب اور شرافت پھیلانے کی مسند ہے۔ اور جو برادرانِ اسلام کو پاک مذہبی تعلیم دینے کی مسند ہے۔ ایک ایسی مجلس میں جو حمایت اسلام کے نام سے منعقد ہو۔ اور ایسی مسند پر جو ہمیشہ سے مقدس سمجھی گئی۔ ہر کس و ناکس اور رذیل خیالات اور پاجیانہ دماغ کے آدمی کو کھڑا ہونے کا حق حاصل

نہیں ہوسکتا۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئین سروری داند

سرسید کے نیچری مذہب کی نیچری مجالس میں اگر ایسے نیچری بھانڈوں کو واعظ وامام بنایا جائے۔ جو ان حرکات ناشائستہ کے ساتھ تالیوں کی ٹیپ پر پھدکنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہوں۔ تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اسلامی مجالس سے ایسے نالائق اشخاص کان پکڑ کر نکال دیئے جانے کے قابل ہیں۔
جو صاحبان خیال فرماتے ہیں۔ کہ مسٹر نذیر احمد کو بیرحمی کے ساتھ تقریر کرنے سے روکا گیا۔ وہ ذرا خیال فرمائیں۔ کہ یہ شخص جو ان حرکات کے باعث کسی بازاری مسخرے سے کچھ بھی ترجیح نہیں رکھتا۔ اپنی تقریر میں حدِ اعتدال سے اس درجہ تک بڑھ گیا۔ کہ قدیم مذہب اسلام کے پیروؤں کو گور پرست پیر پرست۔ اور مشرک کا خطاب دینا شروع کر دیا۔ قبروں پر جانے اور عرس کرنے پر مضحکہ اڑایا۔ حضرت خواجگان رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی محفل سماع پر پھبتیاں سنائیں۔ بزرگان اسلام نے جنہوں نے فتوحات کیں۔ ان کی نسبت بیان کیا۔ کہ وہ ظالم تھے۔ اور انہوں نے ظلم و تعدی کے پیرایہ میں اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ علمائے اسلام اور اولیائے کرام کی نسبت بیان کیا۔ کہ انہوں نے اسلام کو نہائت سختی کے پیرایہ میں پیش کیا جس کی پابندی کرنی مشکل ہے۔ اور پھر طنز کے طور پر یہ بھی کہا کہ صحابہ اور خیر القرون کے بزرگوں کا تم کیوں عرس نہیں کرتے۔ اور ان لوگوں کا عرس کرتے ہو جو چھ صدیوں کے اندر ہیں؟

دمراد خصوصاً حضرت غوث الاعظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی) اور اس کے متعلق مضمون کو ان گستاخانہ الفاظ میں ادا کیا - کہ نعوذ باللہ" یہ چھ سال کے اندر واسے اولیاء بیچ میں آکر کود پڑنے والے کون ہیں" اس کے ساتھ ہی روضوں اور مزارات کے بنائے جانے پر سخت ترین حملے کئے اور ان کے متعلق تربتوں پر غلاف چڑھانے اور روشنی کرنے وغیرہ سب پر نہایت گستاخانہ الفاظ میں اعتراضات کئے۔

مقام حیرت ہے۔ کہ اس خرد ماغ شخص نے اناپ شناپ جو کچھ منہ میں آیا۔ بک دیا۔ اور غالباً اس وجہ سے کہ ۸ - فروری کے رفیق ہند میں حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک کی رونق اور دھوم دھام اور خیر و برکات اور اسلامی تزک و احتشام کے حالات درج تھے۔ ان کو پڑھ کر کباب ہوگیا۔ اور اس جلن کو اس پیرایہ میں ظاہر کیا - اور قدیم مذہب اسلام کے تمام پیرووں کو مشرک قرار دیا۔ اس بے ایمان مشرک کو بخوبی معلوم ہے کہ کوئی مسلمان قبروں کو خدا نہیں سمجھتا - معاذ اللہ معاذ اللہ - کوئی مسلمان جرأت کرسکتا ہے - کہ اس وحدہٗ لاشریک کے مقابل قبروں کو اپنا خدا قرار دے؟

"انما الاعمال بالنیات" - سچے مسلمان تو قبروں پر جائیں یا کہیں جائیں - اسی خالق اکبر خدائے عزوجل کی پرستش کرتے ہیں - بلکہ ان کا کوئی لمحہ یا لحظہ عبادت الٰہی سے خالی نہیں ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہی اولیاء اللہ کی عظمت اور بزرگی کو بھی وہ مانتے ہیں - اور تسلیم کرتے ہیں - جو محض حضرت اللہ جلشانہ کے بندگان مقبول ہونے کی وجہ سے ان کو حاصل ہے - بلکہ اس عقیدہ کو وہ اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون' اور حدیث شریف میں ہے - کہ المومنون لا یموتون - بیت المقدس کو اللہ تعالےٰ نے اسی لئے مقدس قرار دیا - کہ انبیا کے مزار پر انوار وہاں ہیں - حتیٰ کہ وہ مقدس مکان سچے پیغمبروں اور ان کی امتوں کا سجدہ گاہ رہا

یہاں تک کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم عرصہ تک بیت المقدس کی طرف ہی نماز ادا فرماتے رہے۔ اور اب بھی تمام پیغمبروں کے ماننے والے اس مقدس مکان کی تعظیم کرتے ہیں۔ سوائے نیچریوں کے جو کسی کی امت ہیں۔ اور نہ ان کا کوئی مذہب ہے۔ زیارات اور مقبروں پر جانا اسلام میں نہ صرف جائز ہے۔ بلکہ داخل ثواب اور عبادت ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ جو شخص ہمارے روضہ مبارک پر حاضر ہو۔ اس کی شفاعت ہمارے ذمہ ہو گی۔ آنحضرت خود اور اصحاب کبار بھی مزارات پر تشریف لے جاتے تھے اور ہمارے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو بلفظ زیارات یاد فرمایا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے پس جو شخص ان متبرک مقامات کے حاضر ہونے پر معترض ہو اور وہاں پر بنظر ثواب جانے کو شرک قرار دے۔ وہ شیطان ہے۔ اور لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور ایسے شیاطین سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیئے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

اس شعر کو نیچری بھانڈ نے بھی جلسہ میں پڑھا تھا۔ اور اس وقت یہ شعر خود اس پر اس قدر چسپاں معلوم ہوتا تھا۔ کہ بے اختیار رکھنا پڑتا تھا۔ کہ "یہ ابلیس آدم رو خود اپنی ہی تعریف کر رہا ہے۔

یہ کہنا۔ کہ پیروان مذہب قدیم اسلام صرف ان بزرگوں کے عرس کرتے ہیں جنھوں نے چھ سو سال کے اندر رحلت پائی ہے۔ اور خیر القرون کے واجب التعظیم بزرگوں کا کوئی عرس نہیں کرتا۔ ایک پاجیانہ کذب ہے۔ اور لعنت اللہ علی الکاذبین واقعی یہ امر ہے۔ کہ جس جس بزرگ کا جہاں جہاں روضہ مبارک ہے۔ وہیں پر ان کا عرس اس رونق اور ہجوم دہام سے ہوتا ہے۔ کہ حدِ بیان سے باہر ہے۔ اور عموماً ہر حصہ دنیا کے مسلمان اپنی حسب حیثیت اپنے گھروں پر بھی کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک پر یوں تو ہر روز ہی عُرس ہے۔
لیکن ہر سال کے بعد بارہ روز مدینہ شریف میں اس جاہ و احتشام کا عُرس ہوتا ہے
جس کا لطف دیکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نہ وہ بدبخت سود خوار جن کو دنیا کی
پرستش سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی۔ کہ اُس رحمۃ للعالمین کے روضۂ انور کی
زیارت کا فیض حاصل کریں۔ علاوہ بریں اکثر مسلمان ہر مہینہ کی گیارہویں کو بھی
اسی مبارک تقریب سے مجالس درود و وعظ و ختم وغیرہ منعقد کرتے ہیں۔ اصحاب
کبار کے عُرس بھی اپنے اپنے موقع پر بڑی ہی رونق سے ہوتے ہیں۔ حضرت
علی کرم اللہ وجہہ کا عرس مبارک چالیس روز تک اس آب و تاب اور زمین برکات
کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہ شیرِ خدا کے عاشقانِ صادق کو انتہا درجہ کا محوِ کیفیت رکھتا
ہے۔ شہدائے کربلا علیہم السلام کا عُرس تو ایسا اظہر من الشمس ہے۔ کہ اُسے
شاید ہی کوئی شپرہ چشم بے خبر ہو۔ عشرہ محرم بلکہ کُل ماہ محرم میں اُن محبوبانِ حضرت
صمدی کا ذکرِ خیر اس درد و سوز کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہ در و دیوار تک متاثر نظر آتے
ہیں۔ سوائے اُن بے ایمان اور بدبخت نیچریوں کے جو واقعہ کربلائے کو معاذاللہ
معاذاللہ ایک پولیٹیکل جنگ قرار دیتے ہیں۔ جو فریقین نے سلطنت کی ہوس
کے لئے کیا تھا۔ غرضکہ اصحاب اور تابعین اور تبع تابعین اور عموماً تمام بزرگان سلف
سب کے عرس مبارک اپنے اپنے موقع پر کمال درجہ کی رونق اور عظمت سے
ساتھ ہوتے ہیں۔ اور جو بزرگان دین چھ سو سال کے اندر ہیں۔ اُن کے عُرس
بھی اپنے اپنے موقع پر اسی طرح ہوتے ہیں۔ جن کے مزار پر انوار ہند میں ہیں۔ اُن
کے عُرس خصوصیت کے ساتھ ہندوستان ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے۔
کہ اُن میں سے کسی ایک کے روضۂ مبارک پر جا کر بھی تمام بزرگان اسلام
کی یاد اور اُن کے ساتھ ولولۂ محبت پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سب کنفسِ واحد
ہیں۔ بقولِ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ؎

گر ہزاران اند یک تن بیش نیست
جز خیالات عدد اندیشش نیست
جانِ گرگان و سگاں از ہم جداست
متحد جانہائے مردانِ خداست

اِن بزرگان حق پرست کی خاصیت یہ ہے۔ کہ جو ایک کا دوست ہو۔ وہ سب کا دوست ہو۔ اور وہ سب سے مردود ہوتا ہے جو ایک کی درگاہ سے مردود ہوتا ہے۔ پس یہاں دوئی کے خیالات کی تو گنجائش ہی نہیں۔

لیکن مسلمان بھائی اس بات کو یاد رکھیں۔ کہ اس نیچری بھانڈ نے خیر القرون کے بزرگوں کی تعریف اور عظمت اس لئے بیان نہیں کی تھی کہ وہ ان کے عُرس کی رونق کو پسند کرتا ہے۔ بلکہ اس کو تو بلا استثنا تمام بزرگان دین کی تعظیم و بزرگی پر حسد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سرے سے قبروں پر بنظرِ ثواب جانے ہی سے منکر معلوم ہوتا ہے۔ اور رونقِ مسلمانی کو بنیاد ہی سے مسمار کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ ایسے خسر الدنیا و الآخرۃ۔ خود برباد اور مسمار ہو جائیں گے۔ لیکن یہ رونق اسلام قائم رہے گی۔ سرسید اور اس کے نیچری بھانڈ جیسے لاکھوں سگان دنیا تھوڑے دن کے دنیاوی عروج پر ناز کر کے اور عارضی شہرت حاصل کر کے باوجود لاکھوں پیرو پیدا کرنے کے ایسے گمنام و بے نشان ہو گئے۔ کہ کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا۔ اور لیتا ہے۔ تو لعنت اور بدی کے ساتھ لیتا ہے۔

لیکن مردانِ الٰہی کا نام آج تک زندہ ہے۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ برحمت الٰہی دنیا کے قیام تک ایسا ہی رہے گا۔ اگر نیچری بھانڈ کے دل میں خیر القرون کے بزرگوں کی عظمت ہے۔ اور وہ اُن کے عُرس کو مقدم سمجھتا ہے۔ تو وہ بتائے۔ کہ آج تک کتنے بزرگان خیر القرون کے عُرس پر وہ گیا ہے۔

اُن کے عرس پر نہ سہی۔ کعبہ شریف اور مدینہ منورہ ہی کی زیارت کے لئے جاتا۔ مگر واقعی اس کی حالت تو **دو غلے چچر** کی ہے۔ جس کا ذکر اس نے اپنی تقریر میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ کہ یہ کمبخت کہیں بھی بوجھ نہیں اٹھاتا۔ اور ہم نیچری بھانڈ کے اپنے الفاظ میں اس کو یہ کہنے پر مجبور ہیں۔ کہ "کمبخت! کہیں نوزباں تک عرس اور دیگر اس قسم کے معاملات کو جانے دیجئے۔ خود انجمن حمایت اسلام ہی کو لیجے۔ جس کی تائید میں بظاہر اتنی سرگرمی جلسہ میں دکھاتا تھا۔ اور اگر کم بخت سے کوئی پوچھے۔ کہ کبھی ایک پیسہ بھی اس انجمن کی امداد کے لئے دیا ہے۔ تو جواب نفی میں ملے گا۔ غرضکہ اُس **دو غلے چچر** کی طرح کہیں بھی نہیں لدتا۔ انجمن حمایت اسلام کو بھی جانے دیجے۔ سرسید اس کا پیر مغان ہے۔ اُسی کے علیگڈھ کالج کو دیکھئے۔ کہ اس میں اس سود خوار دولت مند نے کتنا روپیہ دیا ہے۔ ہم پھر اسی کے الفاظ میں اس دوغلے چچر کو کہتے ہیں۔ کہ " ارے کم بخت کہیں تو لد" یا صرف زبانی جمع خرچ ہی بھگتنا جانتا ہے۔ اگر تو مفلس یا قلاش ہوتا۔ تو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ روپیہ جمع کر کر کے اور سُود کھا کھا کر موٹا ہوگیا ہے۔ کیا اس دولت کو قارون کی طرح سر پر اٹھا کر ساتھ لے جائے گا؟ لوگوں کو چندہ میں روپیہ دینے کی تحریک کرتا ہے۔ اور چندہ نہ دینے پر ملامت کرتا ہے۔ اور اپنا یہ حال ہے۔ کہ مکھی بھی نہیں مارتا۔ خود را فضیحت دیگران را نصیحت۔ لعنت ہے تیرے اس واعظ بننے پر۔ اور نفرین ہے تیرے اس فرضی جوش مسلمانی پر!

حقیقت یہ ہے۔ کہ نیچری بھانڈ اپنے آپ کو نہ تو اہل سنت جماعت میں داخل کرتا ہے۔ نہ اہل الشیعہ میں۔ اور پورے نیچری بننے سے بھی گریز کرتا ہے۔ ہر مجلس میں مختلف رنگ اختیار کر کے اپنے آپ کو چندہ سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح سے اُس پر نہ صرف **دو غلے چچر** کی بلکہ **چار غلے چچر** یا **پانچ غلے چچر** کی مثال صادق آتی ہے۔ کہ کہیں بھی نہیں لدتا۔ بلکہ ہفتاد و دو فرق

میں سے کہیں بھی اپنی حیثیت کے مطابق مالی امداد نہیں دیتا - اور اس طرح سے اس پر بہت غلے نیچر کی مثال بھی صادق آتی ہے - اور اگر دیکھا جائے - کہ ہندوؤں اور عیسائیوں اور دیگر مذاہب بلکہ دہریوں کی بھی اس قسم کی امداد میں ویسا ہی جی چراتا ہے - تو ہم حیران ہیں - کہ اس کو کتنے غلے نیچر سے مثال دی جائے

اس نالائق نیچری بھانڈ کو خوب معلوم ہے - کہ جن لوگوں کو اس نے قدیم مذہب اسلام کی پیروی کے باعث مشرک اور پیر پرست اور گور پرست وغیرہ کا خطاب دیا - انہی کی طفیل آج زیادہ تر ہندوستان میں فیاضی کے دریا جاری ہیں - یہ وہی مشرک اور پیر پرست ہیں جن کے زیر سایہ آج لاکھوں مفلس مسلمان پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں - لاوارث یتیم بچے پرورش پاتے ہیں - بیواؤں کو امداد ملتی ہے - ہزاروں بیکار مسلمان برسر کار ہوتے ہیں - لاکھوں روپیہ کی امداد غریب مسلمانوں کو ملتی ہے یہ وہی "مشرک اور پیر پرست" مسلمان ہیں - جن کی امداد سے آج حمایت اسلام اس قابل ہوئی ہے - اور جن کی امداد کے بھروسہ پر چل رہی ہے - اور جس کے سالانہ جلسہ کو نیچری بھانڈ نے اسی انجمن کے سرپرستوں کو گالیاں سنانے کا موقع بنا لیا - یہ وہی مشرک اور پیر پرست" مسلمان ہیں - جن کے دروازوں پر نیچری بھانڈ کا ممدوح سید احمد خان گداگری اور بھیک مانگنے کے لئے حاضر ہوتا ہے - اور جن کی زیادہ تر امداد سے علیگڈھ کالج قائم ہوا ہے - جس کو سید نے ایک موروثی جائداد قرار دے کر اپنے بیٹے کے سپرد کرنا چاہا ہے - غرضکہ وہ "مشرک اور پیر پرست اور گور پرست" لوگ تو مسلمانوں کے لئے یہ کچھ کہہ رہے ہیں - تم ہمیں اتنا تو بتاؤ - کہ آج تک کتنے نیچریوں کے نام تم بتلا سکتے ہو - جنہوں نے یہ فیاضی اور یہ حوصلہ دکھایا ہو - یا صرف مسٹر نذیر احمد کی طرح بنک میں سرمایہ اور جائداد پیدا کرنے اور سود کا روپیہ جمع کرنے اور قومی ہمدردی کے زبانی جمع خرچ پر ہی ناز ہے

اگر خدا پرستی اور توحید کے یہی معنی ہیں۔ تو ایسے خدا پرست بننے پر ہم اُس پیر پرست بننے کو کروڑ درجہ ترجیح دیتے ہیں۔

یہ کہنا کہ قدیم مذہب اسلام کا کوئی پیرو اپنے پیران عظام کو دیوتا یا خدا سمجھتا ہے۔ اور ان صاحبوں کی پرستش کرتا ہے۔ محض لوگوں کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ یہ کوئی اصغری اکبری کا قصہ یا ابن الوقت کا ناول نہیں۔ جس پر نیچری بھانڈ صاحب ایسی جلدی سے عبور کر جائیں۔ یہ کلام توحید اور کلام حق ہے۔ یہاں تمسخر اور تضحیک کا موقع نہیں۔ بلکہ ادب کا مقام ہے۔ اور ان کو معلوم رہنا چاہئے۔ کہ قدیم مذہب اسلام کے سب پیرو اُسی خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ اور طالبان خدا صرف زبان سے لاالہ الا اللہ نہیں کہتے۔ بلکہ واقعی دل سے یہ کلمۂ توحید کہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ وہ توحید الٰہی کو بذات بحت و صفات حق و اثر صفات حق (جو خلق اللہ ہے) دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ جسم فانی کو کل من علیہا فان خیال کرکے یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام کا تصور کرتے ہیں۔ اگر تم سرور کائنات مفخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کا مطلب سمجھتے ہو۔ کہ من رانی فقد رای الحق (جس نے مجھے دیکھا۔ خدا کو دیکھا۔) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کے معنی سے آگاہ ہو کہ ان اللہ ینطق علی لسان العمر رضی اللہ تعالےٰ (حضرت عمرؓ کی زبان سے بولتا ہے) تو یقیناً طالبانِ صادق پر تم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ جو لوگ کلام اللہ کے اس بیان پر اعتبار رکھتے ہیں کہ اُس قادر مطلق نے حضرت موسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک درخت میں سے آواز دی کہ اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ اُن کے لئے اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ کہ وہ کردگار عالم کس طرح اپنے برگزیدگان بارگاہ کے آئینہ سے نورِ الٰہی کو دیکھتے ہیں۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ المومن مراۃ المومن

انا مومن (مومن آئینہ ہے مومن کا۔ میں مومن ہوں) یہی توحید اکابران دین اور اہل یقین کی ہے۔ اور یہی مذہب سلف کا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے دنیا کو اپنا خدا سمجھ رکھا ہو۔ اور شب و روز دنیا کی دولت اور حشمت پر ہی جاں نثار رہیں وہ توحیدِ حقیقی پر غور کرنے کے لئے وقت ہی نہیں رکھتے۔ جس توحید کو وہ توحید سمجھے بیٹھے ہیں۔ وہ توعین شیطان کی توحید ہے۔ کیونکہ جیسا کلام مجید میں مذکور ہے شیطان نے بھی خدا ہرگز دو نہیں کہے۔ بلکہ خدا کی وحدانیت پر یہاں تک مصر تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ اور اس کو شرک قرار دے کر اللہ تعالےٰ کی درگاہ میں آدمِ خاکی نژاد کو ایک علیحدہ مستقل چیز خیال کرکے اس کے مسجود قرار دینے پر سخت معترض رہا۔ مگر اسلام نے اس ابلیس کی اعتقادی توحید کو عین شرک قرار دیا۔ اور اس جرمِ عظیم میں شیطان کو ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ٹھیرا دیا۔ پس یاد رکھو۔ کہ توحید حقیقی وہی ہے۔ جو کلام الٰہی اور کلام رسول کے مطابق ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کو صرف زبان سے وحدہٗ لاشریک کہنا کافی نہیں۔ بلکہ دل سے اس پر ایمان لانا اور یقین کرنا ضروری ہے ؎

یک گوئیم و بینم و بدانم　　　سر ودہ ہمہ ہو خدانم
موسیٰ زدرخت بکنہ بشنید　　　من از شجر بشر بخوانم
شیطان ز بشر خدا جدا دید　　　شد دور ز قرب دوستانم
توحید محققان زانسان　　　توحید منافقان ندانم
در پردہ عیان نگفت جانان　　　بے پردہ نہان درنہانم
المومن مراۃ ہمی خوان　　　تابینی یقین حسن جانم

نیچری بھانڈ نے خود بخود مفتی بن کر یہ بھی فتویٰ دیا۔ کہ انسان کا جو دل چاہے کرے۔ اور اسلام کے جس حکم کو چاہے مانے یا نہ مانے اس کی مسلمانی میں کوئی نقص نہیں آتا۔ کیونکہ مسلمان ہونے کے لئے صرف زبان سے لا الٰہ الا اللہ

کہ دینا کافی ہے۔ یہاں تشریح کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ اس دشمن اسلام نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بھی نہیں کہا۔ بلکہ بار بار صرف زبانی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے پر ہی اسلام کا حصر رکھا۔ اور ہر دفعہ یہی کہا۔ کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا کافی ہے۔ پھر صاف الفاظ میں یہ بھی کہدیا۔ کہ ایک شخص نماز کو نہ مانے۔ روزہ کو نہ مانے حج کو نہ مانے۔ اور جس رکن مسلمانی کو چاہے نہ مانے۔ مگر جب زبان سے صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے۔ تو بس اتنا ہی مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے۔ سرسید کی طرح "ناشکرا مسلمان" کبھی نہیں کہا۔ بلکہ سچا مسلمان قرار دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ کہ تاویل میں کوئی گناہ نہیں۔ تعمیل نہ کرنے میں گناہ ہے۔ مثلاً کوئی شخص نماز یا روزہ یا حج کو تاویل کر کے شرع اسلام کے مطابق غیر ضروری ثابت کر دے۔ اور ان پر عمل نہ کرے۔ تو یہ گناہ نہیں۔ لیکن جو شخص ان تمام فرائض کو سچ مان کر ان کی تعمیل نہ کرے وہ گنہگار رہے نعوذ باللہ نعوذ باللہ۔ اب خیال فرمائیے۔ کہ اس شخص کو سرسید کی مدح سرائی اور اس کے جھوٹے دین کی اشاعت کے خیال نے کہاں تک اندھا کر دیا۔ کہ ایک نیا مذہب اسلام قائم کرنے پر تیار ہو گیا۔ اور صرف زبانی خدا کی وحدانیت کا اقرار کرنا مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے۔ تو بتائیے کہ برہمو اور آریا۔ اور بودھ اور یزدان پرست اور قریباً دنیا کے تمام مذاہب کے پیرووں میں سے کون ہے۔ جو اپنی اپنی زبان میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہیں کہتا۔ بلکہ بعض مذاہب والے مثلاً برہمو تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول خدا بھی مانتے ہیں۔ اب مسلمانان صادق الاعتقاد انصاف فرمائیں۔ کہ سرسید اور اس کے پیرو کس کس طریق سے کلام مجید کو اور اس کے تمام احکام کو نعوذ باللہ فضول یا غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ اگر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا ہی کافی تھا۔ تو کلام الٰہی اور کلام رسولؐ وغیرہ کتب احکام

اسلام کی کیا ضرورت تھی؟ اس امر کی تفصیل کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے۔ اس مختصر آرٹیکل میں اسی قدر جتا دینا کافی ہے۔ کہ سچے اسلام کے مطابق اگر ہزار سال تک بھی صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا رہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ کہے۔ تو ہرگز ہرگز مسلمان نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جس نے رسول کو نہیں مانا۔ خدا کو ہرگز نہیں مانا اور اسی طرح اگر صحابہ کرام کو نہ مانے۔ تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منکر ہے۔ اور اسی طرح تابعین اور تبع تابعین اور تمام اولیاء اللہ کے منکروں کی حالت ہے۔ جو شخص سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اور اولیائے کرام کو الگ رکھ کر خدا تک پہنچنا چاہے۔ وہ عقیدہ اسلام کے بالکل مخالف ہے اور توحید حقیقی کا محض منکر ہے۔ کیونکہ توحید اصلی وہی ہے۔ جو ان بزرگان اسلام کی پیروی اور متابعت سے حاصل ہوتی ہے۔ کلام الٰہی اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ کہ دوستان خدا سے دوستی خدا سے دوستی ہے۔ اور عین اقرار توحید حق ہے۔ اور دوستان خدا سے دشمنی کرنا ہے اور انتہا درجہ کا شرک ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا اللہ تعالےٰ سے مناجات کی۔ کہ الٰہی! تیرے دوستوں اور دشمنوں کو کیونکر پہچانوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی۔ کہ اے داؤد! جو شخص ہمارے دوستوں اور نیک بندوں کا دوست ہو۔ وہ ہمارا دوست ہے۔ مولانا روم نے خوب ہی فرمایا ہے ؎

حب درویشاں کلید جنت است
دشمن ایشاں سزائے لعنت است
اولیا را طفال حق اندا سے پسر
حاضر و غائب ز ایشاں کن حذر
اولیا راہست قدرت از الٰہ
تیر جستہ باز گردانند ز راہ

یہ درجہ ہے۔ اور یہ رتبہ ہے اولیاء اللہ کا۔ جن کی تعظیم اور بزرگی کرنے کو نیچری بھانڈے نے شرک اور کفر قرار دیا ہے۔ یہ خسر الدنیا والآخرۃ اُن مقربانِ بارگاہِ الٰہی کے رتبہ اور درجہ کو نہیں مانتا۔ اگر مانتا تو ان کی عظمت اور بزرگی پر اس قدر تمسخر نہ اُڑاتا۔ اور ان کے معتقدوں کے اسلامی اعتقاد اور عقیدۂ توحیدِ حقیقی کو نعوذ باللہ بی بی تمیز کے ناپاک وضو سے مشابہت نہ دیتا۔ ہم اس مسخرے کو آگاہ کرتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ کی بارگاہ بہت بڑی عظمت اور جلال والی بارگاہ ہے۔ رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر شان۔ یہاں پر تمسخر اور تضحیک کرنا اپنے لئے کسی فوری ادبار اور وبال کی درخواست کرنا ہے۔ ع

این سر شیر است بازی مگیر

یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کی خاطر خود اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔ اور بارگاہ الٰہی میں مقبولیت اور محبوبی کے درجہ تک پہنچے ہوئے ہیں۔ یہاں پر ادب اور متانت کو ہر وقت ملحوظ رکھنا چاہیئے ؎

روضۂ خلد برین خلوتِ درویشان است
مایۂ محتشمی خدمتِ درویشان است
آنکہ پیشش بنہد تاج تکبر خورشید
کبریائیست کہ در حشمتِ درویشان است
خسروان قبلۂ حاجات جہان اند و لے
از ازل تا ابد فرصتِ درویشان است
اے توانگر مفروش اینہمہ نخوت کہ ترا
سر وزر در کنفِ ہمتِ درویشان است
گنجِ قارون کہ فرو می رود اندر تو خاک
خواندہ باشی کہ ہم از غیرتِ درویشان است

ان بزرگان پاک سیرت اور مقربان درگاہ حضرت جلّ وعلا کے ساتھ عقیدت رکھنے اور ان کی تعظیم و تکریم کرنے اور ان کے مقبروں پر جانے اور ان کو پیر و مرشد ماننے کو نعوذ باللہ بی بی تمیز کے زنا کرانے کے ساتھ تشبیہ دینا نیچری بھانڈ کی کمال درجہ کی خباثت اور بے ایمانی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور کوئی سچا مسلمان اُسکے اس باجیانہ حملہ پر انتہا درجہ کا اسلامی جوش ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری رائے میں یہ بے تمیز شخص اپنی بی بی تمیز کو اگر گھر چھوڑ آتا۔ تو نہایت بہتر تھا۔ ازتعجب ہے۔ کہ اس کمبخت کو نیچری بھانڈ اس طرح مسلمانوں کے جلسہ اور وعظ کی مجلس میں کیوں کھینچ لایا۔ اور چونکہ نیچری بھانڈ نے قدیم اسلام کے معتقدوں پر ایسا گندہ حملہ کیا ہے۔ لہذا ہم اُس کے جواب میں یہ کہنے کے لیئے مجبور ہیں کہ مسلمانان صادق الاعتقاد کے اسلامی عقیدہ کو کوئی نسبت بی بی تمیز کے ناپاک افعال سے نہیں ہوسکتی۔ ہاں مسٹر نذیر احمد کے خیالات کے لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ خود ان میں بی بی تمیز کی رگ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ باوجود ایسے مخالف اسلام عقیدے رکھنے کے۔ باوجود اولیاء اللہ اور ان کے سچے معتقدوں کی ایسی ہتک کرنے کے۔ باوجود اسلام پر مضحکہ اڑانے اور تمسخر کرنے کے باوجود اُس مشہور مخرب اسلام سرسید کی پیروی اور تائید کرنے کے۔ باوجود سود کا مال حرام کھانے کے باوجود اس بھانڈپن اور نقالی کے۔ اور باوجود اسی قسم کے خلاف اسلام افعال و کردار کے پھر بھی وہ بی بی تمیز کی طرح اپنے آپکو مسلمان اور سچا مسلمان اور مقدس مسلمان قرار دینا چاہتے ہیں۔ اور اسسے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ اپنے آپ کو مذہبی سرگروہ اور عالم اور مولوی اور حافظ اور واعظ اور خدا جانے کیا کچھ سمجھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو مذہبی پند و نصائح اور وعظ کرنے کے لیئے اسلامی مجالس میں تشریف لاتے ہیں۔ ایسے اسلام کے کیا کہنے ہیں! ؎

اگر حقیقت اسلام درجہان این است
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ کہ مسلمان ہونے کے لئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنا ضروری ہے۔ اور محمد رسول اللہ ماننے کے بعد تمام احکام شریعت اسلام کی پابندی ضروری اور فرض ہے۔ اگر اُن احکام کی تعمیل میں کوئی شخص کوتاہی کرے۔ اور اُس کے ساتھ ہی اپنی کوتاہی پر نادم ہو۔ اور استغفار کرے۔ تو اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔ لیکن اگر کوئی نالائق صرف مسلمانی کا لقب رکھ کر خدا کا اور رسولؐ کا مقابلہ کرے۔ اور بیہودہ تاویلیں کرکے تمام قیودِ اسلام کو اُٹھا کر خلقِ خدا کو گمراہ اور بے ایمان بنانا چاہے۔ اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کی تکذیب کرکے اسلام کے مقابل عَلَم بغاوت بلند کرے۔ تو ایسا شخص کافر ہے۔ اور اگر توبہ نہ کرے۔ تو احکامِ الٰہی کے مطابق اُس کا حشر دشمنانِ خدا کے ساتھ ہوگا۔

جس طرح بلا تشبیہ ایک شخص اگر زبان سے اپنے آپ کو برٹش گورنمنٹ کی وفادار رعایا بتائے۔ اور گورنمنٹ ممدوح کے تمام احکام و قوانین کی خلاف ورزی کرنے اور اُس کے مخالفانِ سلطنت کے ساتھ سازش رکھنے اور علانیہ برٹش گورنمنٹ کی تحقیر کرنے اور سرکاری عہدہ داروں کے سرکاری احکامِ اطاعتِ سرکار پر تمسخر اڑانے کے بعد ہرگز وفادار رعایا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور ایسے بے ایمان غدار باغی کو انتہائی سزا ملنی ضروری ہے۔ اسی طرح جو شخص مسلمانی کی آڑ میں اسلام کے مقابل علانیہ ایک نیا مذہب ایجاد کرکے اسلام کی تخریب کرنا چاہے۔ اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کے سچے پیرووں کے مقابل عَلَم بغاوت بلند کرکے مخالفانِ اسلام کی تائید کرے۔ وہ بطریق اولیٰ انتہائی سزا کا

مستوجب ہے اور اُس کا صرف زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا اور اپنے
آپ کو مسلمان قرار دینا کسی طرح اس کے لئے بسپر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ
اس طرح پر اس کا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا صریح اسلام کے ساتھ تمسخر کرنا ہے۔
یہ سچ ہے۔ کہ اس مذہب سے بعض آزاد مزاج نوجوان جو نماز اور روزہ اور
حج اور زکوٰۃ اور دیگر اسلامی قیود کی پابندیوں کو اپنے لئے بارِگراں سمجھتے ہیں۔
وہ ایک ایسے مذہب میں شمولیت کو غنیمت سمجھیں گے۔ جو صرف دو لفظ
زبان سے کہدینے پر ان کو تمام مذہبی ذمہ داریوں سے آزاد کرا سکتا ہے۔ اور
اس کے ساتھ ہی غیر قوم کے آرام طلب۔ دہریہ مزاج۔ عیاش۔ اور مادر پدر
آزاد اشخاص کو اس نئے پنتھ میں شامل کرنے کا بھی یہ ایک نہایت سہل ٹھکا
معلوم ہوتا ہے۔ مگر یاد رکھو۔ کہ حق۔ حق ہے۔ اور باطل۔ باطل ہے۔ اور
اللہ تعالٰے کا یہ فرمان پورا ہو کر رہیگا۔ کہ جاء الحق وزھق الباطل۔ اِنَّ
الباطل کان ذھوقا۔
مسٹر نذیر احمد کے لکچر پر ہمیں ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ خصوصًا اُن
کی اس پیشنگوئی پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ کہ "پچاس سال
تک کل مسلمان سرسید کے مذہب نیچریت کو ماننے لگیں گے" اور اُن کے
اس خیال پر بھی بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ کہ اسلام کا مذہب ہر زمانہ
کے حالات کے مطابق تبدیل کر لینا چاہئے۔ اور اسی طرح بہت سے امور
ہیں۔ جو ریمارک اور نوٹس کے قابل ہیں۔ لیکن چونکہ آج کے پرچہ میں اب
زیادہ گنجائش نہیں رہی۔ لہذا یار زندہ و صحبت باقی کے مقولہ کے
مطابق ضرور ہے۔ کہ مفصل تحریر کو آئندہ پر ملتوی رکھا جائے۔ سردست
ہمیں یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ مسٹر نذیر احمد کے خیالات پر ہمیں صرف اس
لئے لکھنے کی ضرورت پڑی۔ کہ اُنہوں نے مسلمانوں کے ایک پبلک اور

مذہبی جلسہ میں واعظِ اسلام بن کر اُن خیالات کو ظاہر کیا۔ اگر کوئی ہولی کا بھڑوا اس قسم کے لغو تمسخر کی باتیں اور فضولیات اور فحش باتیں بکتا۔ تو چونکہ آج کل ہولیوں کے دن ہیں۔ لہٰذا ہم اخبار میں نوٹس لینے کی ایسی زیادہ ضرورت نہ سمجھتے۔ مگر بحالت موجودہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ صرف اسی مضمون پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بلکہ برادرانِ اسلام اور پبلک کے فائدہ کے لئے مسٹر نذیر احمد کی گندہ خیالی کی پوری پوری تردید کر کے لوگوں کو اس مغالطہ سے بچایا جائے۔ اور جو لائیبل الفاظ اور نالائق استعارات اُنہوں نے اڈیٹر رفیق ہند اور سرسید کے دیگر مخالفین کی نسبت صراحتاً اور کنایتاً استعمال کئے۔ اُن کی چارہ جوئی مناسب قانونی ذریعہ پر منحصر رکھتے ہیں۔ کیونکہ گو مسٹر نذیر احمد نے بھرے جلسہ میں صلائے عام دیکر فرمایا تھا۔ کہ جو کچھ کسی کا دل چاہے۔ ان کو کہے اور کوئی سخت سے سخت نقرہ اور سنگین سے سنگین لفظ بھی ان کی نسبت استعمال کرنے سے کوئی رنج کسی قسم کا ان کو پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اڈیٹر رفیق ہند یا اُس کے ہم خیالوں کو یہ دعویٰ نہیں ہے۔

مسٹر نذیر احمد نے اپنی تقریر میں اپنے ہیرو سرسید احمد خان صاحب کو "گوندہ کی آنکھ والا" (نرگس چشم) اور "بناش" (یعنی کفن گھسوٹ) کا خطاب بھی عطا فرمایا۔ جس کو غالباً سی۔ ایس۔ آئی۔ اور کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کے خطابات کے ساتھ ہی سرسید اپنے نام کے ساتھ شامل کرنا ضروری سمجھیں گے۔ یہ سرسید کو مردار خوار گدھ اور مردوں کے کفن اتارنے والے مردودوں کے ساتھ تشبیہ دینے کی ضرورت مسٹر نذیر احمد نے اس لئے سمجھی ہوگی۔ کہ سرسید اس مردار دنیا پر بہت ہی جاندادہ ہیں۔ اور واقعی الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب مگر مسٹر نذیر احمد سے مؤدبانہ التماس ہے۔ کہ وہ اس نرگس چشم کفن گھسوٹ شخص کی پیروی سے باز آئیں۔ اور یاد رکھیں۔ کہ جواب دہی کا دن عنقریب آنے والا ہے۔ جبکہ کوئی لسانی اور

کوئی لفاظی کام نہ آئیگی۔ اور وائے بر حال اُن کے جو اُس خوفناک دن کو فراموش کئے بیٹھے ہیں ؎

ہفتاد و دو از عمر تو بگذشت و تو طفلی ہنوز
اے پیر نا بالغ بیا از مستیت بیدار شو

مولوی نذیر احمد خان اور بی بی تمیز کا قصہ

انجمن حمائت اسلام لاہور کے تازہ لکچر میں یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ کہ مسٹر نذیر احمد نے بی بی تمیز کا تذکرہ اپنی تقریر میں کیا ہو۔ مسٹر نذیر احمد کے چھپے ہوئے لکچروں کے مجموعہ کی ایک کاپی جو ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسٹر نذیر احمد نے اِس سے پہلے بھی بی بی تمیز کا تذکرہ اپنی تقریروں میں کرنا ضروری سمجھا ہے۔ انجمن حمائت اسلام لاہور کے چوتھے سالانہ جلسہ پر ۱۸۸۹ء میں جو تقریر اُنھوں نے کی تھی۔ اُس کو پڑھتے ہوئے مجموعہ مذکور کے صفحہ ۸۵ پر یہ فقرہ نظر آیا۔ "توحید کیا ہوئی۔ بی بی تمیز کا وضو ہوا کہ وہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں۔" پھر ۱۸۹۱ء میں جو تقریر مسٹر نذیر احمد نے سرسید کی کونفرنس میں کی اُس کو پڑھتے ہوئے بھی مجموعۂ مذکور کے صفحہ ۲۱۶ پر یہ مصرع بڑے شد و مد سے لکھا ہوا دکھائی دیا کہ "چون وضوئے حضرت بی بی تمیز" اب تیسری دفعہ پھر تازہ لاہور والے لکچر میں تو بی بی تمیز کا گندہ تذکرہ ایسے فحش الفاظ میں مفصل بیان کیا۔ کہ اُس کو سنکر سخت نفرت پیدا ہوئی۔ اگر کوئی صاحب ہمیں یقین دلا سکیں۔ کہ "حضرت بی بی تمیز" کے تذکرہ کے بغیر اِن لکچروں میں کوئی خاص نقص رہ جانا ممکن تھا۔ اور احکام الٰہی کے ساتھ یہ تذکرہ بھی ضروری ہے۔ تو ہم اس معاملہ میں یقیناً مسٹر نذیر احمد کو معذور تصور کریں گے۔

مولوی نذیر احمد صاحب بطور ایک مُرغ کے

مولوی نذیر احمد صاحب نے جہاں اپنے لکچر میں مختلف قسم کے سوانگ بھرے وہاں ایک موقع پر پہنچکر آپ مرغ بننے پر بھی تیار ہو گئے۔ اور فرمایا۔ کہ "سنو بھئی! اگر تمہیں یہ منظور تھا۔ کہ میں مُرغ بن کر لڑ دوں۔ تو ذرا مجھے پہلے اطلاع دے دی جاتی۔ تاکہ میں بھی اپنے نوک پنجے درست کر لیتا" کیا کہنا ہے؛ بڈھے مرغ کو اس بڑھاپے میں بھی نوک پنجے درست کر کے لڑنے کی خواہش ہے ؎

بپرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است
وز شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

اب ذرا اس دعوائے اسلام کو دیکھئے۔ آپ کی مولویت اور واعظ بننے کو دیکھئے۔ اور اس مرغوں کی نقل کو ملاحظہ فرمائیے۔ استاد ذوق مرحوم خوب ہی فرما گئے ہیں کہ ؎

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال
غور سے دیکھا تو اے **ذوق** ہے انکا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر
نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

لاہور میں مقدمات

بہت سے صاحبان اس بات کو معلوم کرنے کے مشتاق ہیں کہ محرم علی چشتی کی طرف سے کتنے مقدمات دائر ہیں۔ اور اس کے برخلاف کتنے استغاثے ہیں؟ اور وہ کس کس محکمہ میں سپرد ہیں؟ اور کون کون سی تاریخ ان کے لئے جو لوگ حالات اصلی سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ یہ نالش ازالہ حیثیت عرفی کی جو مسٹر نذیر احمد کی طرف سے نہیں بلکہ خود سر سید احمد خان صاحب کی طرف سے اور عموماً کل نیچری پارٹی اور ان کے اکثر معاونوں کی طرف سے ہے۔ اور ان لوگوں نے کوئی وقیقہ اپنی دنیاوی طاقت اور رسوخ کو رفیق ہند کے برخلاف استعمال کرنے میں اٹھا نہیں رکھا۔ لاہور میں آج کل سر سید کے مردہ رسوخ کو زندہ کرنے کا ہاڑ کوارٹر قائم ہوا ہے۔ اور سنا ہے۔ کہ انہی دنوں میں سر سید احمد خان اور ان کی پارٹی کے بڑے بڑے اراکین مسٹر نذیر احمد کی امداد کے لئے لاہور آنے والے ہیں۔ رفیق ہند کی مخالفت کے لئے ایک بہت بڑا فنڈ قائم ہوا ہے۔ اور بڑے بڑے متمول اشخاص اس کی امداد میں شریک ہیں۔ سنا جاتا ہے۔ کہ سر سید کی پارٹی کے بعض اشخاص کی یہ پختہ رائے قرار پا چکی ہے کہ اپنی پوری طاقت اور رسوخ کو خرچ کر کے (۱) یا تو خدا نخواستہ رفیق ہند کو ایسا مالی صدمہ پہنچانا چاہیئے۔ کہ یہ پرچہ بند ہو جائے۔ یا (۲) رفیق ہند کو (خدا نخواستہ) دباؤ ڈال کر سر سید کا مداح بنایا جائے۔ اور کم سے کم نیچریوں کی مخالفت سے روک دیا جائے۔

بازی بازی برلش بابا ہم بازی:۔ یہ مثال عام طور پر سنی جاتی تھی۔ مگر مسٹر نذیر احمد نے اس کو نتیجہ کر دکھایا۔ حمایت اسلام کے جلسہ میں تمسخر کرنے کرتے اور مختلف قسم کی نقلیں اتارتے اور پھبتیاں سناتے مسٹر نذیر احمد نے اپنے باپ کا ذکر بھی شروع کر دیا۔ کہ میرے والد بالد ایسے مسلمان تھے۔ کہ کالج کے پرنسپل نے مجھے انگریزی میں تعلیم دینی چاہی۔ مگر والد ماجد نے کسی صورت سے نہ مانا

اور کہا کہ "مجھے اپنے بیٹے نذیر احمد کا مرجانا منظور ہے لیکن اُس کو انگریزی میں تعلیم دلانا منظور نہیں"۔ اس پر مجلس میں بعض صاحبوں نے قہقہہ اڑایا۔ اور مسٹر نذیر احمد نے بتایا۔ کہ جس طرح ریل کے مقابلہ میں اگر کوئی بیل آکر ٹکر مارنا چاہے۔ تو وہ کٹ کر قیمہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح زمانہ کی رفتار کے مطابق انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کا جو لوگ مقابلہ کریں۔ ان کا کٹ کر پس جانا ضروری ہے۔ اور بڑے زور سے فرمایا کہ ایسے لوگ اُن بیلوں کی طرح جاہل اور بیوقوف ہیں۔ جو ریل کو ٹکر مار کر مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح سے مسٹر نذیر احمد نے اپنے والد ماجد کی جو کچھ تعریف کی وہ ناظرین خود ملاحظہ فرمالیں باپ بیچارے کو کیا معلوم تھا۔ کہ فرزند ارجمند ایسے خلف الصدق پیدا ہوئے ہیں۔ کہ پبلک مجالس میں باوا کو مرنے کے بعد بیل اور جاہل اور خدا جانے کیا کچھ قرار دینگے۔ باپ کے ساتھ آپ نے اپنے اُستاد کو بھی لے ڈالا۔ اور اپنے اُستاد کے مٹکا توڑنے کی حرکت کو ایسے پیرایہ میں بیان کیا کہ جس پر بعض حاضرین کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اُستاد صاحب کو اگر معلوم ہوتا کہ مسٹر نذیر احمد بڑے ہوکر اُن کے خیالات کی نسبت یہ کچھ کہیں گے۔ تو عجب نہ تھا۔ کہ وہ ایسے شاگرد رشید کو اپنے مکتب سے نکال کر کسی بھانڈوں کے طائفہ میں داخل ہونے کے لئے چھوڑ دیتے۔ اور جو مذہبی خیالات اپنے والد کے مسٹر نذیر احمد نے بیان کئے ہیں۔ ان کے لحاظ سے تو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر اُس سیدھے مسلمان کو یہ معلوم ہوتا۔ کہ اُس کے اپنے اعتقادات کے مطابق اُس کا بیٹا ایسا ناخلف نکلیگا۔ اس قسم کے وعظ لوگوں میں کیا کریگا۔ تو وہ زندگی میں ہی اس کو عاق کرکے داخل ثواب ہوجاتے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے خوب ہی فرمایا ہے ؎

زنان باردار اے مرد ہشیار اگر وقت ولادت مار زائند
ازاں بہتر بہ نزدیک خردمند کہ فرزندان ناہموار زائند

ایک تو وہ اولاد ہوتی ہے۔ جو بزرگوں کی دانشمندی اور لیاقت پر فخر کرتی ہے۔ اور ایک وہ اولاد ہوتی ہے۔ جس کا نمونہ مسٹر نذیر احمد ہیں۔ جو بازی بازی۔ بریش با باہم بازی سے نہیں چوکتے۔

مولوی محرم علی چشتی کے استغاثے

لاہور - اپریل ۱۸۹۳ء

مولوی نذیر احمد خان اور سرسید کے عقائد کے خلاف مولوی محرم علی چشتی نے متعدد استغاثے لاہور کی عدالتوں میں دائر کئے۔ جن میں سے ایک کا نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ جس کا مطالعہ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

محرم علی چشتی بنام نذیر احمد واعظ ساکن
مستغیث دھلی ملزم

جرم زیر دفعہ ۴۹۹ و ۵۰۰ و ۵۰۴ تعزیرات ہند

جناب عالی۔

بیانِ استغاثہ یہ ہے۔

۱ - مستغیث لاہور کا رہنے والا ہے۔ اور ملزم دہلی کا باشندہ ہے مستغیث اس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بلحاظ عقائد کے سرسید احمد خان نیچری کے مذہبی خیالات کا سخت مخالف ہے۔ اور سرسید احمد خان کی مذہبی مخالفت کو اپنا ایمان اور مذہب جانتا ہے۔

۲ - ملزم بوجہ اختلافِ مذہبی اور دیگر وجوہات کے مستغیث کا مخالف ہے اور مستغیث کے بعض مخالفوں کی سازش سے ملزم نے دہلی سے لاہور پہنچکر انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ۲۶ تاریخ ماہ فروری ۱۸۹۳ء کو ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں مستغیث کی نسبت ایسے اتہام اور الزام اور سخت الفاظ اپنی تقریر میں بیان کئے۔ جن کو وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ کہ مستغیث کی نیک نامی کو نقصان پہنچانے والے

اور اُس کی انتہا درجہ کی دل آزاری کرنے والے ہیں۔

۳ - منجملہ بیشمار طعن و تشنیع اور ہتک آمیز الفاظ کے جو ملزم نے اُس مجمع میں بیان کئے۔ چند الفاظ حسب ذیل ہیں۔ جو اُس نے مستغیث کی نسبت کہے :-

(ا) ایک بیل جو دُم اُٹھا کر (یعنی اپنی شرمگاہ کو ننگا کرکے) ریل کا مقابلہ کرتا ہے۔

(ب) نباش یعنی کفن گھسوٹ۔

(ج) مردہ جس کی شرم گاہ میں میخ ٹھونکی جائے۔

(د) مُردہ جس کا کفن اُتارا جائے۔

(ہ) یہ شخص اپنے سے بڑے یعنے سرسید احمد خان کا ادب نہیں کرتا۔ لہذا یہ مسلمان نہیں ہے۔ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ہے۔

(و) یہ شخص پیغمبر صاحبؐ کی مخالفت کرتا ہے۔ اور لوگوں کو اپنے زبان و قلم سے ایذائیں دیتا ہے۔ اور اپنے بڑوں کا ادب ملحوظ نہیں رکھتا۔ اور مسلمانوں میں رنجشیں اور عداوتیں اپنے ذاتی اغراض کے لئے بے ایمانی پھیلاتا ہے۔

(ز) سرسید　　سُنار کی طرح اسلام کی خیر خواہی کے لئے کھٹ کھٹ کرتا رہتا ہے۔ اور یہ شخص (یعنے مستغیث) لوہار کی طرح ایک ایسی چوٹ مارتا ہے۔ جس سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ شخص (مستغیث) دشمن اسلام ہے۔

(ح) یہ شخص نہ خدا کو مانتا ہے۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور یہ ظالم ہے۔

(ط) یہ شخص سرسید کی غیبت کرتا ہے۔ اور اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاتا ہے۔

(ی) سانپ اور بچھو کی اولاد ہے۔

(ک) اس کی طبیعت ایسی نیش زن فطرتاً ہے۔ کہ کسی نیک کام میں بغیر روڑا اٹکائے کے نہیں رہتا۔

(ل) یہ مجرمی صورت کا لبسور یا نہیں (یعنی مستغیث ایسا ہے)۔

(م) یہ اُن آدمیوں میں سے ہے۔ جو دود شوندار بدملغے رسند۔ باد شو ندار بچراغے رسیند۔

(ن) یہ دو غلے خچر کی طرح ہے۔ کہ گدھوں کو لادنے لگے۔ تو اس دوغلے نے کہا۔ کہ میں گھوڑا ہوں۔ اور گھوڑوں پر زین کسنے کی نوبت آئی۔ تو لگا ہینچوں۔ ہینچوں کرنے۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہے۔ یہ بے ایمان بدمعاش کسی طرح لدنے ہی میں نہیں آتا۔ ارے ظالم! کہیں تو لدُ اور لدیگا نہیں۔ تو یہ بوجھ تیرا باوا آ کر اُٹھائیگا۔ لعنت ہے تیری اس شرارت پر۔

(س) یہ شخص کیسا ہی نیک کام ہو۔ اُس کو بُرے اغراض پر ڈھال لیتا ہے۔ چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد۔ میلش اندر طعنۂ پاکاں برد۔

(ع) اس کو کوئی اور بہانہ اپنی پلیدی اور خباثت ظاہر کرنے کا نہیں ملتا۔ تو مذہب کا حیلہ نکال کر کھڑا کر دیتا ہے۔

(ف) یہ ایک گندہ دل تمام مسلمان کمیونٹی کے دلوں کو بگاڑ دینے کے لئے کافی ہے۔ جس طرح ایک دیا سلائی ایک شہر کے جلا دینے کے لئے بس ہے۔ جب مٹیریل ڈرائی اور ہوا موافق ہو۔

(ص) اس بے ایمان خرد ماغ سے بچے رہو۔ اے بسا ابلیس آدم روئے ہست۔ پس بہر دستے نہ باید داد دست۔

(ق) اب اگر تجھے مرغوں کی طرح ہمیں لڑانا منظور ہے۔ تو خود بھی مرغ بن کر آجا۔ اور مجھے خبر ہوتی۔ تو میں بھی مرغ کی طرح اپنے نوک پنجے تیز

کر کے لڑنے کے لئے آجاتا۔
(ر) مستغیث کو اُن مکار اور شریر اور دغاباز حکیموں سے تشبیہ دی۔ جو فرضی نسخے لکھ کر ہر مریض کو اُٹھا کر دیتے ہیں۔ اور کہا کہ مستغیث مسلمانوں کو کافر بناتا ہے۔ (یعنے شرع اسلام کے مطابق خود کافر ہے)۔
(ش) ایسا نالائق فرعون کی طرح خدائی دعوے کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور بڑے بڑوں کی پگڑیاں اُتارتا ہے۔
(ت) اے تیری ہستی کیا ہے۔ "گوز تو بند می شود وعقل تو گم می شود" (اور بار بار اس فقرہ کو دوہرایا)۔
(ث) مشرک۔ بے ایمان۔ خدا سے باغی۔ خدا کا مخالف۔ برٹش گورنمنٹ کا مقابلہ کرنے والا باغی۔ وغیرہ وغیرہ بہت سے الفاظ۔
۴۔ ان الفاظ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ کی نسبت کافی شہادت موجود ہے۔ کہ ملزم نے بدنیتی سے یہ سمجھ کر اور باور کر کے اور اس نیت سے اُس جلسہ میں بیان کئے۔ کہ مستغیث کی توہین اور دل آزادی ہو۔ اور اُس کی تذلیل و تحقیر کر کے اُس کی نیک نامی اور اُس کی آمدنی اور اس کی حیثیت اور اُس کی شہرت کو سخت نقصان پہنچائے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان الفاظ اور دیگر فقرات سے قصداً مستغیث کی توہین کر کے اس کے ذریعہ سے مستغیث کو اشتعال طبع دلائے یہ نیت کر کے اور اس امر کے باور کرنے کی وجوہات رکھ کر کہ اس اشتعال طبع کے سبب مستغیث آسودگی عامہ خلائق میں خلل ڈالے۔ یا کسی اور جرم کا مرتکب ہو۔ اور اس امر کے ثبوت میں معزز شہادتیں موجود ہیں۔ کہ عموماً حاضرین جلسہ نے ان تمام الفاظ کو مستغیث کی نسبت سمجھا۔ جس پر مخالفوں نے اُس کی ہنسی اڑائی۔ اور اُس کے دوستوں کو سخت رنج پہنچا۔ اور ایسے

بلا موقع پر جب کہ مستغیث بھی اسی جلسہ میں سامنے موجود تھا مستغیث کی سخت دل آزادی اور توہین کی گئی۔ اور اس کو انتہا درجہ کا اشتعال طبع دلایا گیا۔

مندرجہ بالا حالات کے لحاظ سے استغاثہ ہے۔ کہ ملزم مرتکب جرائم دفعات ۴۹۹ و ۵۰۰ و ۵۰۴ تعزیرات ہند کا ہوا ہے۔ اور اگر واقعات کے روسے عدالت کے نزدیک کوئی اور جرم بھی عائد ہو۔ تو ان تمام واقعات کے مطابق استدعا ہے۔ کہ حسب ضابطہ ثبوت لیکر ملزم کو سزا دیجائے۔

عرضی
محرم علی چشتی مستغیث
۱۶ اپریل ۱۸۹۳ء

محرم علی چشتی صاحب کا معافی نامہ

مقدمہ مذکورہ بالا میں مولوی محرم علی صاحب چشتی کا قافیہ آخر تنگ ہوا۔ تو مولوی نذیر احمد صاحب سے یوں معافی مانگ کر رہائی پائی کہ میں محرم علی چشتی نہایت عاجزانہ طور پر سچے دل سے مولوی نذیر احمد صاحب سے معافی کا ملتجی ہوں۔ مجھے نہایت رنج ہے کہ میں نے اپنی تحریرات میں ان کی نسبت متشدد و سخت الفاظ اور بلا موقع اور نا ملائم اور بے جا فقرے اور گالیاں لکھیں۔ جس کی وجہ سے ان کو رنج اور تکلیف ہوئی۔ ان سب کی اب تلافی چاہتا ہوں۔ اور یقین واثق دلاتا ہوں۔ کہ آئندہ کسی قسم کی بے جا تحریر ان کی نسبت شایع نہ کروں گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مولوی صاحب نے مقدمہ کا خرچ معاف کر دیا ہے۔ محرم علی چشتی۔

راقم محرم علی چشتی۔
لاہور - ۱۹ جون ۱۸۹۳ء دستخط رام ناتھ مجسٹریٹ درجہ اول

سرسیّد اور شکیگو کی نمائش گاہ

گر فزوں گردد تو اش افزودہ
کان سخن را خود تو مبدا بودہ

سرسیّد کے ایک مدّاح اخبار نے اڈیٹر رفیق ہند کو گالیاں دینے کے ایک بڑا لمبا مضمون لکھا ہے جس میں اخبار مذکور لکھتا ہے کہ :-

اس زمانہ کا شائر سب سے بڑا عجوبہ ہندوستان کے اردو اخبار نویس ہیں۔ انسان جن عجائبات کو ظاہر کرسکتا ہے۔ ان میں سے ایک قسم کے عجائبات کا مظہر یہ حضرات ہیں۔ ہندوستان کے اخبار نویس ان کلوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز چیز ہیں۔ کہ ہوا اگرچہ اسی سمت میں چلتی رہے۔ اُن کا رخ ایک طرف سے دوسری طرف بدل جاتا ہے۔ اور دُور سے دیکھنے والے اس کا سبب نہ معلوم ہونے کے سبب سے نہایت حیران ہوتے ہیں۔ اسی سبب سے ہم نے ان اخبار نویسوں کو اس زمانے کے سب سے بڑے عجائبات میں سے کہا ہے۔ اور اگر ہماری صلاح کو مانا جائے۔ تو شکیگو کی عالمگیر نمائشگاہ کے مہتمم ہندوستان کے عجائبات کے کمرے میں ہندوستان کے اڈیٹروں کو بھی لے جا کر رکھ دیں۔ اور ان کے عجائبات کندہ کردیں۔ ہم کو امید ہے۔ کہ اُن سے زیادہ حیرت انگیز اور عجیب ترین چیزیں اور بہت کم پائی جائینگی۔ اور دیکھنے والوں کو بہت دلچسپی ہوگی۔ اگر زیادہ نہیں۔ تو کم سے کم دو اخبار نویس ایک لاہور سے اور ایک لکھنؤ سے ضرور لے جائیں۔

مندرجہ بالا فقرات میں ظاہر ہے۔ کہ اخبار مذکور نے بلا استثنا تمام اڈیٹران اخبارات ہندوستان کی نسبت یہ رائے دی ہے۔ کہ ان کا منہ کالا کرکے شکیگو کی نمائشگاہ میں بھیجدیا جائے۔ اور بعد میں اڈیٹر رفیق ہند کی خصوصیت کی ہے۔ حالانکہ ایڈیٹر رفیق ہند کو اخبار نویسوں میں کوئی وجہ خصوصیت کی نہیں۔ اور اخبار نویسوں کی طرح وہ بھی ایک اخبار نویس ہے۔ البتہ سرسید احمد خان صاحب ایک نہایت پرانے

اخبار نویس ہیں - اور عام طور پر اپنے مداحوں کے نزدیک اول درجہ کے اڈیٹر تسلیم کئے جاتے ہیں - اُن کی شکل و صورت میں بھی شائد کچھ عجیب الخلقت باتیں ہیں - اور تمغہ قابلیت ان کے زیب گلو ہے - پس اگر کسی اخبار نویس کو شکیگو کی نمائش گاہ میں بھیجنا ضروری ہو - تو سرسید سے بڑھ کر اور کوئی اڈیٹر منتخب نہیں ہوسکتا - باقی رہی منہ کالا کرنے کی تجویز - اس بارہ میں سرسید کے بعض مداحوں کو اپنے ممدوح کی نسبت پورا اختیار حاصل ہے - البتہ ہم اتنا ضرور کہیں گے - کہ اخبار مذکور کی تجویز کے مطابق سب اخبار نویسوں بیچاروں کا منہ کالا کرنے کے بجائے صرف ایک سرسید ہی کو منتخب کر لیا جائے - تو بہر حال بہتر ہے - اور عجب نہیں - کہ سرسید کے طوقِ گلو کا علاج جو کرنیل الکاٹ صاحب سے نہ ہوسکا تھا - اُس کے دُور کرنے کی بھی کوئی تدبیر شکیگو کی نمائشگاہ میں پیدا ہو جائے - سرسید میں بہت سی خصوصیتیں ہیں - جن کے لحاظ سے شکیگو کی نمائشگاہ کے ناظرین یقیناً ان کو نہایت توجہ سے دیکھیں گے - سرسید علاوہ "سیج اوف علیگڈھ" کا خطاب رکھنے کے اوزیبل ہیں - سر ہیں - اور ایک نئے مذہب کے موجد ہیں - غرضکہ ہر طرح نمائشگاہ کی الماری میں رکھے جانے کے قابل ہیں - اور سر کی دُم کو اور زیادہ بڑھا کر اس ہیئت عجیب میں اُن کا فوٹو لیا گیا - تو تصویر بہت ہی دلچسپ ہو جائے گی - اور عجب نہیں - کہ جو لوگ رسول خدا کے مخالف ہیں - وہ اس فوٹو کو قیامت کے دن اپنی شفاعت کے لئے "تصویر جاناں در بغل" لے کر حاضر ہوں -

ہمارا ارادہ ہرگز ایسی تحریر کرنے کا نہ تھا - لیکن ہمیں افسوس ہے - کہ سرسید کے بعض مداح خواہ مخواہ ایسے مضامین لکھتے ہیں - جن کا ویسا ہی جواب لکھنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہوتا ؎

گر فزوں گردد تو اش افزودہ
کان سخن را خود تو مبدا بودہ

(رفیق ہند ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۹۳ء)

آگے کا صفحہ ۷۹ کی بجائے ۹۷ سمجھو

سر سید کے خیالات کی تبدیلیاں

(منقول از اخبار نور الانوار کانپور)

موسم تو ہمیشہ بدلتا ہی رہتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں آدمی بھی موسم کی طرح رنگ بدلنے لگے۔ جاڑے آئے اور جم گئے۔ گرمیاں آئیں تپ گئے برسات میں ڈوب گئے۔ اور خود ڈوبے تو ڈوبے۔ مگر اپنے ساتھ اوروں کو بھی لے ڈوبے۔

ایسے غیر مستقل اور متلون مزاج آدمی بہت کم نامور ہیں۔ چونکہ نام بغیر دو باتوں کے حاصل نہیں ہوتا۔ یا کثرت حسنات سے نیک نام ہوتا ہے یا شدت منکرات سے بدنام۔ تلون مزاجی کے ساتھ حسنات کا ادا ہونا تو معلوم۔ اب نام آوری کی یہی ایک صورت رہ گئی۔ کہ خوب سی دل کھول کر قبیحات اپنی ذات میں جمع کرے۔ پھر کیا تھا۔ معلم الملکوت بھی شاگردی کو حاضر ہو۔

ایسے نام آوروں میں ہی زمانہ بقول شخصے ؎

زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
جا کہے عالم اسے بجا سمجھو

ہمارے سر سید احمد صاحب اول درجہ کا حصہ لئے ہوئے ہیں۔ رنگ بدلنے میں گویا وہ خود مفعول بن گئے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے تبدیلی موسم کا دورہ اپنے شمار سے بھی زیادہ اختلاف قبول کر چکا۔ مگر تمام موسم ناتمام ہے۔ تلون مزاجی سے کوئی رنگ پورا نہ آنے دیا۔ پیچھے چھوڑ آگے دوڑ کا مضمون ہر موسم میں صادق آتا رہا۔

چنانچہ ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ سر سید صاحب کو شوق علم نے گدگدا کر چھیڑا

کرر کھا تھا ۔ لیکن ہوس نے نیم ملا خطرہ ایمان رکھا ۔ جس کی بدولت ہزارہا
ایمانوں کا خاتمہ ہوا ۔ پہلے ہوس پوری کرنے کو ملازمت گورنمنٹ حاصل کی ۔
رفتہ رفتہ ڈپٹی کلکٹری تک نوبت پہنچی ۔ مگر بمقتضائے

ستم ہے خیال کہ بینم جمال دوست
آہم شدید بیشتر و سودائے خام شد

تاہم سے کھسک گئے ۔ اور ہولنگا کے شہید ولایت داخل ہونے کو
تصوف کا دم بھرا ۔ گوشہ اختیار کیا ۔ تہجد میں سر مارا ۔ تھوڑے دنوں میں
اچھے خاصے مصنوعی صوفی صوف پوش بن گئے ۔ لیکن رفتہ میں اس کے بعد
یا صدقی کا فیلسوفی کے ہم ردیف ہونے نے کیا قافیہ تنگ کیا ہے

قسمت کی نا کم نصیبی کہ ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

ہمنا صر سفلی کی کشش نے چڑھتے چڑھتے زینہ پر سے پاؤں پکڑ کر کھینچ
لیا ۔ اور اس عروج مرتبت حقیقی سے خاک ذلت ابدی پر آرہنا کیا
یعنی ۔ تاروں سے آگے بڑھ کر خرد انہ سمیٹنا شروع کر دیا ۔ شاید اسی صعود
اور ہبوط کے سبب آپ کے حواری مسیحا ہونے کا گمان کرتے ہیں ۔ کہ شاید
وہی اتر آئے ہوں ۔ بقول مولوی نذیر احمد ع

"مسیحا کون ۔ سر سید بیچارے سب میں کہتا ہوں"

چنانچہ ان کے رجحان قلبی سے اس تصور کی تصدیق ہوتی ہے ۔ کہ جب
اس کو صعود سے ہبوط نصیب ہوا ۔ گویا سال بھر میں دوسرا جنم لیا ۔ تو
اول اول کچھ عیسائیوں کی محبت ایسی دل میں سمائی ۔ کہ احرام کی جگہ کوٹ
پتلون ڈانٹا اور دوڑ کر لندن کا حج کر آئے ۔ بلکہ ایسے خوش قسمت کہ کئی حج
نصیب ہوئے ۔ سنگ اسود کے بدلے پایۂ تخت کا بوسہ لیا ۔ جنت کے
مناظر میں خطاب پایا ۔ قصہ مختصر تقرب الٰہی سے قرب شاہی میسر آیا ۔

افسوس! یہ موقع کمال حسرت و اندوہ کا ہے۔ اگر قوم آٹھ آٹھ آنسو اس وقت
کی حالت پر بہائے۔ تو تھوڑا ہے۔ شیخ صنعان کے قصہ کا نقشہ اس وقت پیش
نظر ہے۔ کہ ایک ایسا گوشہ نشین تہجد گذار عروس دنیا کی زلف چلیپا کے
دام میں پھنسکر اسلام کو خیر باد کہے اور پناہ بخدا قرآن شریف کو جلانے کے
بدلے اس کے معنوں اور آیتوں کی دھجیاں اڑائے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ
اس موقع پر بے اختیار یہ زبان سے نکلتا ہے۔ کہ یہ قصور سرسید صاحب کا ہے
نہ یہ خطا ملعون ازل کے گمراہ کرنے کی۔ سب تقدیر کی خوبی ہے ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

فمن یھدی اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ

لیکن قسام ازل نے یہاں بھی کسر رکھی۔ ہر کام میں ادھار رکھا۔ ادھر
اس کا مصداق ہوکر پورا مرد نہ ہونے دیا ؎

شیوہ مردوں کا نہیں کام ادھورا کرنا
دخل جس کام میں دینا اسے پورا کرنا

اس شہر میں دال نہ گلی۔ اور اس زعم پر کہ نام کے گلے میں کچھ اسلامی
تمغہ لٹکتا باقی رہ گیا تھا۔ قوم کے پیشوا بنے۔ بقول مولوی نذیر احمد ؎

یہی اک فرد اکمل ہے کہ جس کو دیکھ کر جاتا
ہماری ناؤ کا اٹکا ہے بارے ناخدا باقی

اب یہاں سے نیا ہی پانچواں موسم بدلا۔ جو اب تک کسی سال میں نہیں
آیا تھا۔ قومی ترقی کے حیلے تحصیل زر میں امرا کی زر کوبی کی۔ غربا کو بھی اپنے
چندہ سے محروم نہ چھوڑا۔ جابجا جلسے ہوئے۔ لکچر کہے۔ مقتضائے مثل پیران نمے پرند
مریدان می پرانند۔ بعض زبانی جمع خرچ میں سیاق سباق کے منافی انھوں
کا نمبر تاکید قانون فطرت کے مطابق۔ حسب حالی کے ہم اکھاڑہ۔ خواہ مخواہ ہاں

میں ہاں ملانے والے اور سوئی کا پھاوڑا بنانے والے پورے ہم خیال ہو گئے پھر کیا تھا۔ توبہ توبہ پورے نبوت کے ٹھاٹھ مع صحابہ کے موجود کر لیئے۔ جہلا تو کوٹ پتلون ہی کو دیکھ کر امت ہو گئے۔ رہے لکھے پڑھے۔ ان کو دعوت بیعت صرف زبانی لکچروں سے مشکل تھی۔ خود ہی لسان الغیب ہو کر صاحب تصنیف بنے۔ تفسیر لکھی۔ آیات قرآنی کے معنی من گھڑت لگائے۔ آزادی کو پوری ڈگری دی۔ معجزات انبیائے علیہم السلام کا مقدمہ ڈسمس کیا۔ ملائک سے انکار۔ جنات کے نہ ہونے کا اصرار۔ غرضکہ جنت۔ دوزخ۔ رحمن۔ شیطان سب کو بالائے طاق رکھ کر رسائی کیڑے بن گئے۔ یا جنگل کی گھانس جنہیں ان کی زمین ہے۔ بونے والے کی کوئی ضرورت ہی نہ چھوڑی۔ قانون قدرت کا آئینٹ اسی پر مبنی ہے۔ کہ بنتے جاؤ۔ بگڑتے جاؤ۔ نہ کوئی بنانے والا نہ بگاڑنے والا۔ دست خود دہان خود۔ پھر یہ کون بڑی بات تھی۔ کہ خانہ کعبہ کو ایک معمولی عبادت گاہ کہا۔ محمڈن کالج کو اس سے بہتر جانا۔ غرضکہ اس کے قائل ہو گئے۔ ع

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

مگر یہ جو کچھ ہم کہہ گئے۔ نہ ہمارے اس کہنے کی زمانہ سے ضرورت چھڑی۔ نہ سرسید کی شہرت اس اشتہار کی محتاج۔ صرف زبان خلق کا تکیہ کلام کچھ آپ کے نام نامی کے ساتھ ایسا چسپاں ہو گیا ہے۔ کہ قلم کو چھوڑنا ناگوار ہے۔ ورنہ ہمارا تو یہ مقولہ ہے۔ کہ یہ تمام فتور سرسید صاحب کے حواریوں کا ہے۔ جو انہیں مسیحا بناتے ہیں۔ اور کبھی نوح ٹھہراتے ہیں۔ اور ناحق خلقت سے گالیاں دلاتے ہیں۔ اخباری شترقلیوں کو کلام و رسائل کے مشغلے ہاتھ آ گئے۔ اور چلبلی طبیعت والے ایک کھلونا رنگ برنگی پا گئے۔ جس کو بیچ میں رکھ کر ہر ایک اپنی اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے۔ کوئی مخالفت کرتا ہے۔ کوئی معاونت کی رائے لگاتا ہے۔
ہم ان کے خیالات سے قطع نظر دونوں گروہ سے علیحدہ ہو کر بخیال ان کے

اسی شوق تصوف کے ایسا سمجھتے ہیں۔ کہ شاید سر سید صاحب ملامتیہ فرقہ کے مرد ہیں۔ مگر یہاں آکر ہمارا خیال بگڑ جاتا ہے۔ کہ خدا رسول کو بھی زبان قلم سے خالی نہ چھوڑا۔ اگر واقعی موافق ہمارے خیال کے یہ ساری تباہ کاریاں خلاف عقل و نقل جیسی دنیا نے ان کی طرف منسوب کر رکھی ہیں۔ ان کے ظاہری ہوا خواہوں کی ہیں۔ تو ہمارے شک کو دور کرنے کے لیے سودا ایسے تباہ کار دوستوں کو اپنی خدمت سے علیحدہ کریں گے۔ اور عام لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دیں گے۔ کہ یہ تمام خوشامدیوں کی افترا پردازی اور بازیگری تھی۔ چونکہ ہم سے ایک نام کے مسلمان پر جس نے قومی ہمدردی کا دعوے بھی دعوے کیا ہے۔ چاروں طرف کی بوچھاڑ نہیں دیکھی جاتی۔ اور یہ بھی بہت بڑا گناہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے سبب اور لوگ بہت ملامت کے مبتلا ہوتے ہیں۔ خیر خواہانہ التماس کرنے پر مجبور ہیں۔ کہ آپ تمام موسم آخر ہو گئے۔ اور زندگانی کے دنوں کا خاتمہ ہو چکا۔ تمام نے بھی معقول پر خوب مقام کر لیا۔ اب اس مقام (آخرت) کے زاد پیدا کرنے کی تدبیر چاہیئے۔ ورنہ بدنامی کو بیٹھ آتا ہے ۔

پیام مرگ ہے موئے سفید اے غافل
کہیں سنا ہے کہ پیری گئی و شباب آیا

(اخبار رفیق ہند ۱۵ مارچ ۱۸۹۳ء)

تذکرہ گلستان سخن کی تاریخ

(از سر سید)

کلک صابر نگاشت تذکرۂ — کہ از و خوب تر بدہر مجو
سال تاریخ ختم او آہی — ذکر یاران ہمدم است بگو

۱۲۷۱ ہجری

غزل

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم — مسیحا رشک می دارد بہ نفسانے کہ من دارم

نہ کفرم من چہ میخواہی نہ ایمانم چہ میخواہی
ہماں یک حجرۂ عشق است ایا کہ من دارم

خدا دارم دلے بریاں زعشق مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

نہ جبرائیل امین قرآن بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاران ایں چنیں دارد گریبانے کہ من دارم

ز برہان تا بہ ایمان سنگ ہا دارد رہ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہم چو برہانے کہ من دارم

(سرسید)

نواب دبیر الدولہ اور بخشی محمود خاں کی رفاقت

سرسید کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد اس قدر ذی شان با رعب۔ صاحب متانت بزرگ تھے۔ کہ جو کوئی ان کی مجلس میں آتا۔ اُنکے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔ ان دنوں بخشی الممالک بخشی محمود خاں ایک شاہی ظریف بلبل ہزار داستان کی طرح ہر جگہ چہکتا پھرتا تھا۔ وہی جب کبھی دبیر الدولہ موصوف کی محفل میں آتا۔ تو اسقدر مرعوب ہو جایا کرتا۔ کہ ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکل سکتا تھا۔ اور وہ بالکل صُمٌّ بُکمٌ ہو کے رہ جایا کرتا تھا۔ راقم خاکسار نے سرسید کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کے چہرے پر بھی وہ جلال وہ نور اور متانت برستی تھی۔ کہ ان کے سامنے بڑے بڑے دل لگی باز خود بخود ہی بات ہو جاتے اور ان سے بمزاح پیش آنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ یہ رتبہ ان کے بعض خاص خاص دوستوں مثلاً نواب مہدی علی ہی کو حاصل تھا۔ کہ جب چاہتے خود ہنستے اور ان کو بھی ہنسا دیتے تھے۔

(ایک مسلمان)

خواجہ نجیب الدین صاحب

یہ سرسید کے بزرگوں میں سے تھے۔ اوائل عمر میں تارک الدنیا ہو گئے۔ اور مولوی محمد حنیف صاحب کے مرید ہو گئے۔ جب فقہ۔ حدیث۔ تفسیر وغیرہ سب کچھ پڑھ چکے

تو اپنے مرشد کے پاس گئے۔ آپ نے حکم دیا۔ کہ چونکہ اب تم درویش کامل ہو گئے ہو۔ اور کسی کتاب کے پڑھنے کی تمہیں حاجت نہیں رہی۔ ان سب کتابوں کو کنوئیں میں پھینک دو آپ نے فی الفور اس حکم کی تعمیل کی۔ اور گھر آکر اپنا تمام کتب خانہ کسی گہرے کنوئیں میں ڈال دیا۔ جب پھر گئے۔ تو ان کو اپنے مرشد کی طرف سے یہ ہدایت کی گئی۔ کہ اب چار ابرو کا صفایا کرا دو۔ اس حکم کو بھی مثل سابق فی الفور بجا لایا گیا۔ بعدہٗ ان کے پیر نے ان سے یہ کہا۔ کہ سر سے پاؤں تک سارے جسم پر راکھ مل دو۔ بس فوراً سارے بدن پر راکھ مل دی گئی۔ مگر آخری حکم یہ ملا۔ کہ اپنے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا اور کوئی کپڑا نہ پہننے دو۔ لہذا مرتے دم تک آپ نے بجز لنگوٹی کے اور کوئی لباس زیب تن نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ۱۲۸۲ھ میں بمقام الور وصال ہو گیا۔ اور وہیں دفن کیے گئے۔

حضرت رند... ؎ تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

جج اکبر کا لطیفہ

سر سید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں۔ کہ جو صاحب (مراد اس سے مولوی علی بخش خاں مرحوم صدر الصدور گورکھپور) ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا تھا۔ ان کے لائے ہوئے فتوے دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں ؎

یہ ہیں کرامت میخانہ مرحلے شیخ
کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد

سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے۔ کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی (ہجو کرنے والا) اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

امام مہدی کوئی چیز نہیں (سرسید)

ان غلط قصوں میں جو مسلمانوں کے ہاں مشہور ہیں۔ ایک قصہ امام مہدی آخرالزمان کے پیدا ہونے کا بھی ہے۔ اس قصہ کی بیسیوں حدیثیں ہیں۔ مگر کچھ شبہ نہیں کہ یہ سب جھوٹی اور مصنوعی ہیں۔ جب کہ ایک محقق کیا باعتبار واقعات تاریخی اور کیا باعتبار ان کے راویوں کے ان پر غور کرتا ہے۔ تو ان کا نامعتبر اور مصنوعی اور سراسر غلط ہونا آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ اور ان سے یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ ان حدیثوں کے بنانے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ یعنی مہدی آخرالزمان کی بشارت کوئی اصلی بشارت نہ تھی۔ بلکہ اس زمانہ کے لوگوں کی صرف ایک حکمت عملی اور مرتبہ خلافت کے ہاتھ آجانے کی تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی۔

سید کا رویت الٰہی سے انکار

خدا کا دیکھنا اس دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہو سکتا ہے۔ اور نہ ان آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں۔ اور نہ قیامت کے دن کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ بیچون و بیچگون ہے۔ کہ جو کسی ہیولے صورت میں آنے کے قابل نہیں ہے۔ پھر وہ کیونکر دنیا میں یا عقبیٰ میں دکھائی دے سکتا ہے۔ بہت سے عابد و زاہد دعوے کرتے ہیں۔ کہ ہم نے ان آنکھوں سے دنیا ہی میں خدا کو دیکھا ہے۔ ہم ان سے کہتے ہیں۔ کہ ان آنکھوں سے کیا بلکہ دل کی آنکھوں سے بھی دیکھنا غیر ممکن ہے در اصل انہوں نے دیکھا دکھایا کچھ بھی نہیں۔ یہ خود ان کا خیال یا ایقان ہے۔ جو انہوں نے دیکھا ہوگا۔ عقبیٰ میں بھی اگر خدا کا دیکھنا تسلیم کیا جائے۔ تو وہ بھی خدا کا دیکھنا ہرگز نہ ہوگا۔ بلکہ خود انہی کا ایقان ان کو وہاں دکھائی دے گا۔

بس آمین ہی کافی ہے

نواب محسن الملک نے کسر نفسی کے خیال سے کانفرنس کے ایک جلسہ میں کہا۔ ایک مجھ سا شخص بھی یہاں موجود ہے۔ کہ جس کو کسی قسم کی لیاقت نہیں ہے۔ اور نہ استعداد ہے۔ (آواز آئی کہ نو۔ نو) نہ دل ایسا قوی ہے اور نہ طبیعت حاضر۔ نہ مسلمانوں کے ساتھ سوائے زبانی ہمدردی کے کچھ کیا ہے۔ (پھر آواز آئی۔ کہ نو نو۔ اس کا کیا حق ہے کہ ایسی محفل میں کوئی تجویز پیش کرے۔ یا اس کی تائید کو کھڑا ہو۔ مگر ایک درگاہ میں دعائیں سکھائی جاتی تھیں۔ مجھ سا نادان بھی وہاں گیا۔ جس کا نہ ذہن نہ حافظہ قوی وہاں پہنچ کر درخواست کی کہ مجھے دعائیں سکھائی جائیں۔ پیر جی نے بہت کچھ سکھلایا پڑھایا۔ مگر اس کو ایک لڑائی بھڑائی دعا بھی یاد نہ ہوئی۔ آخر پیر صاحب نے جیسے ہمارے سرسید ہیں۔ اس سے کہا۔ کہ میں تم کو ایک لفظ بتا دیتا ہوں۔ جس سے ثواب میں شریک ہو جایا کرو یعنی جب کوئی دعا پڑھے۔ تو تم صرف "آمین" کہہ دیا کرو۔ مجھ سے بھی نہ دعا پڑھی جاتی ہے۔ نہ عربی پر زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ میں اس تجویز پر صرف آمین کہہ دیتا ہوں۔

خدا اور انسان کا تعلق

(بقول سرسید)

خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ کیونکہ خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے۔ کہ اگر ہم اس کو چھوڑنا بھی چاہیں۔ تو نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح ہم بھی خدا کے اپنے پیچھے پڑے ہیں۔ کہ اگر خود خدا چاہے۔ تو وہ بھی ہم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہم کو اپنے بندے اور اپنے مخلوق ہونے سے خارج تو کر دے یہ اس کی قدرت ہی سے باہر ہے۔ وہ کیونکر ہماری مغفرت نہ کرے گا۔

لاعلمی بھی ایک نعمت ہے

سرسید فرماتے ہیں۔ بے علمی ایک عجیب صفت موصوفیت کی ہے ۔ دل کو راحت میں طبیعت کو طمانیت میں رکھنے والی جیسی بے علمی ہے ۔ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جاہل جو کچھ جانتا ہے۔ اس کو سچ سمجھتا ہے ۔ جو کچھ کرتا ہے ۔ وہ اس کو ٹھیک جانتا ہے ۔ یہ ایک جھیل ہے جسمیں کوئی لہر نہیں ۔کناروں تک پانی بھرا ہوا ہے ۔ مگر ہلتا نہیں ۔ نہ اس میں کوئی مچھلی ہے ۔ جو تیرے ۔ نہ کوئی مینڈک ہے ۔ کہ ادہر سے ادہر اور ادہر سے ادہر غوطہ لگائے ۔ نہ دل میں کچھ کھٹکا ہے ۔نہ کسی بات کے سوچنے کی حاجت جس نے جو کچھ کہا ۔ اس کو سچ جانا ۔ اور جو جس نے بتایا ۔ اس کو مان لیا ۔ ان ہی لوگوں کا مذہب صحیح ہو یا غلط ۔ نہایت پختہ اور مضبوط ہوتا ہے ۔ کہ جس میں ذرا بھی لکیر یا دراڑ اور کچھ بھی کسر نہیں ہوتی ۔

بہشتی کون لوگ ہیں

اکثر عالم ایسے گذرے ہیں ۔ جو خدا تعالے کی قدرت کاملہ میں اپنی نیکدلی سے نہایت سچا اور مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں ۔ اور وہ یقین جانتے ہیں ۔ کہ خدا تعالے کو اپنی قدرت کاملہ سے ہر ایک امر کرنے کا پورا اختیار ہے ۔ گو وہ تمام عقل اور قوانین فطرت کی رو سے کیسے متناقض ہوں ۔ اس مسئلہ میں ان کو ایسا دلی اعتقاد ہے کہ جو کوشش ان کے اس اعتقاد کے سست اور متزلزل کرنے میں کی جاوے ۔ وہ یقینی ناکام ثابت ہوگی ۔ وہ کسی حجت اور دلیل پر غور کرنے سے کیا سننے سے بھی جو ان کے دل نشین عقیدہ کے مخالف ہو ۔ ہمیشہ انکار پر انکار کئے جائیں گے ۔ ایسے ہی سادہ مزاج اور صاف باطن اشخاص کو بہشتی آدمیوں کا لقب دیا گیا ہے ۔

(سرسید)

خان بہادر و مولوی منشی بھولا ناتھ صاحب

کیا یہ بات دلی رنج اور افسوس کے ساتھ نہ سنی جائیگی - کہ بمقابلہ ہندوؤں کے لاکھوں تین فی صدی مسلمان تعلیم پاتے ہیں - یہ تو حالت ہے - اور ہم مسلمان رونا روتے ہیں قسمت کا اور شکایت کرتے ہیں گورنمنٹ کی - کہ ہم کو اعلیٰ عہدے نہیں ملتے - منصفی اور صدر الصدور کے عہدے ہمیں نہیں دئے جاتے - اب سے پچاس برس پہلے ایک زمانہ تھا - کہ جتنے مولوی یا حافظ ہوتے - وہی منصف اور سب جج کئے جاتے - گویا یہ عہدے مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص تھے - کوئی دوسرا فریق ان کا شریک نہ تھا - چنانچہ مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے - کہ ۱۸۵۴ء میں ایک صاحب منشی بھولا ناتھ نامی اتفاق سے منصف مقرر کئے گئے - جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں - کہ یہ عہدے مسلمانوں کے لئے مخصوص تھے - اس لئے تمام روبکاروں پر نام کے ساتھ مولوی حافظ خان بہادر وغیرہ لکھنے کا دستور تھا - چنانچہ سررشتہ دار عدالت نے ان کے نام کی روبکار بھی اس طرح پر لکھ دی - روبکار از دفتر خان بہادر مولوی منشی بھولاناتھ صاحب وغیرہ وغیرہ - انہوں نے جب یہ دیکھا - تو کہا کمبخت - تو نے تو مجھے مسلمان بنا دیا ہے - اس پر سررشتہ دار نے دست بستہ عرض کیا - کہ اب تو حضور منصف ہو گئے - (لیکچر سید مہدی علی)

سرسید اور نواب محسن الملک کے دوستانہ تعلقات

سرسید مہدی علی یعنی نواب محسن الملک کی ملاقات سرسید سے اول مرتبہ ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی - روشناس ہونے سے پہلے نواب صاحب موصوف کا سرسید سے تفسیر قرآن کے متعلق کچھ تحریری مباحثہ ہوا تھا جس میں سید مہدی علی نے سرسید کو عقاید اسلامیہ

سے بالکل منحرف بنا یا تھا۔ لیکن وہ جب ان کی ملاقات کو علیگڈھ گئے۔ تو دیکھا کہ سر سید سید ھے سادے مسلمانوں کی طرح نماز پڑھ رہے ہیں۔ تاہم یہ شک ان کو پھر بھی پیدا ہونے سے نہ رہا۔ کہ اگر سر سید نماز پڑھتے ہیں۔ تو وہ ضرور قبلہ رو نہ ہو گی۔ مگر سر سید نے ان کو ہر طرح یقین دلایا۔ اور اس امر کے ثبوت کے لئے کہ نماز قبلہ رو پڑھی گئی ہے۔ اپنے بنایا۔ کہ میری کوٹھی کا رخ قبلہ کی طرف ہے۔ مگر جب سید مہدی علی اس پر بھی کچھ شکی سے نظر آئے۔ تو سر سید نے کمپاس ہاتھ میں لیکر اپنی کوٹھی کا قبلہ رو ہونا ثابت کیا۔ تو آخر سید مہدی علی کو سر سید پر پورا اعتماد ہو گیا۔ کہ آپ ایک مسلمان اور بالکل سچے مسلمان ہیں۔ بقول عام مولویوں کے کافر و ملحد و مرتد نہیں ہیں۔

جب سے سر سید اور نواب محسن الملک کی اسقدر دوستی بڑھی۔ کہ دونوں گویا ایک دوسرے کے عاشق صادق ہو گئے۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے دل میں یہ کہتا تھا ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبروجواناں
پیران سال پیرے بردش بیک نگاہے

نواب محسن الملک کا اعتراف سر سید

ایک لیکچر میں نواب صاحب موصوف نے سر سید کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تھا۔ کہ صاحبو! میں ان حضرت یعنی سر سید کی مخالفت اور موافقت دونوں کا مزہ چکھ چکا ہوں۔ اور مجھے دونوں فرقوں میں شریک رہنے کی عزت حاصل ہے۔

اول۔ مخالف فرقہ میں جو مذہبی خیال سے آپ کو برا جانتا تھا۔ پھر اس فرقہ میں جو آپ کے خیالات پر ہنستا تھا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں۔ کہ ان دونوں فرقوں میں میرا ہی نمبر اول تھا۔ تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ حضرت کی تکفیر کا فتوے سب سے اول میرے ہی قلم سے نکلا۔ اور سر سید کو انجیل کی تفسیر لکھنے پر سب سے اول میں نے ہی ایک چھپا یادری بنا یا تھا۔ اور یہ وہی علیگڈھ ہے۔ جہاں سب سے اول فقیر ہی نے ان حضرت کو (سر سید) کو تبیین الکلام کے لکھنے پر ملامت کا ایک بہت بڑا لمبا

خط لکھا تھا۔ اور اب یہی وہ مقام ہے۔ کہ جہاں یہ نادان دین و دل و دونوں ہی حضرت کے نذر کر گیا۔

سرسید بطور قومی ناخدا یا ناکتخدا کے

پنجاب کے ایک مشہور سرکار پرست خطاب یافتہ زمیندار نے ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے سرسید احمد خاں صاحب مرحوم کے متعلق فرمایا تھا۔ کہ ہمارے بزرگ سرسید مسلمانوں کی قومی کشتی کے ناکتخدا ہیں۔ سنا ہے۔ کہ اس تقریر پر خود سرسید باوجود کمال متانت کے بے اختیار ہنس پڑے تھے۔ اور ان کو فی الفور اپنے کنوار پنے کا زمانہ یاد آگیا تھا۔

سر احمد خاں بہادر اور پردہ کا مسئلہ

ایک دفعہ کسی نے یہ اعتراض کیا تھا۔ کہ سرسید چونکہ انگریزی تعلیم کے حامی ہی نہیں۔ بلکہ تمام اہل یورپ کے بھی بڑے طرفدار ہیں۔ وہ پردہ کی رسم بالکل اٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں ان کے دوست سید مہدی علی نے ارشاد فرمایا۔ کہ نہ تو محمڈن کالج کے ٹرسٹی کا یہ منشا ہے۔ کہ پردہ اٹھایا جائے نہ کالج کا اور نہ کالج والوں کا جن میں سے ننانوے فیصدی بذریعہ ووٹ اس کو مناسب خیال کرتے ہیں۔ اور اس کالج کے بانی سرسید احمد خاں تو جاہل سے جاہل اور کٹر سے کٹر مسلمانوں سے بھی اس معاملہ میں بڑھ کر تھے۔ کہ وہ بیٹیوں نہ بچوں اور لڑکیوں تک کی بیبیوں سے ان کی بہو یعنی محمود بیگم سے ماننا چاہا لیکن انہوں نے اس کو بھی جائز نہ رکھا۔

سرسید کی کامیابی کا اصلی راز

اردوئے معلیٰ میں مرزا غالب کا ایک خط کسی دوست کے نام ہے جس کی

بی بی مرگئی ہے۔ اور وہ بہت اداس ہو رہا ہے۔ آپ اس کو یہ کہہ کے دلاسا دیتے ہیں۔ کہ خوش قسمت ہو۔ جو اس قید بے جرم سے رہائی پائی۔ اب دوبارہ اس میں نہ پھنسنا۔ تمہارے بال بچوں کو میں پال لوں گا۔ اسی طرح حالی کا کوئی دوست رنڈوا ہو گیا۔ تو آپ ان کو تحریر فرماتے ہیں۔ (بحوالہ مکتوبات حالی)۔ کہ بھائی بی بی کا مرنا غنیمت جانو۔ اور اس آزادی کی قدر کرو۔ کیونکہ سرسید کی عظیم الشان کامیابی کا حقیقی راز یہی تھا۔ کہ وہ جب ۴۸ برس کے ہوئے تو ان کی زوجہ محترمہ وفات پا گئیں۔ اور پھر دوسری شادی نہ کرنے سے وہ اپنا سارا وقت قومی کاموں کے لئے دے سکے تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ہماری طرز معاشرت اسقدر تضیع اوقات کا منبع ہے۔ کہ جب تک گھر میں رہو۔ اور کسی کام کے لیے فرصت ہی نہیں نکل سکتی۔ مثلاً حقوق نسواں میں مولوی ممتاز علی صاحب جو اردو ادب نسواں کے گویا اکسپرٹ (ماہر) ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کہ ایک بہت بڑے جید عالم مولوی صاحب کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کے لئے اکثر دوست احباب کبھی ان کے گھر جاتے۔ تو اندر سے ہمیشہ یہی جواب ملا کرتا تھا۔ کہ قبلہ مولوی صاحب کو اسوقت باہر آنے کی مہلت نہیں ہے۔ مگر جب تحقیق کی گئی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ مولانا موصوف محض مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر ان کی بی بی صاحبہ ان کو گھر کے برتن صاف کرنے اور چارپائیوں کی اودوائین کسنے میں ہی لگائے رہتی تھی۔

وہاں اُمی اُمی یہاں قومی قومی

سرسید ایک لکچر میں فرماتے ہیں۔ کہ میں خدا کا شکر کرتا ہوں۔ جو کہ میں اس پاک شخص کی ذریت میں ہوں۔ کہ جس کے لب مبارک جب آخری وقت پر ہلتے تھے۔ تو اُمی اُمی پکارتے تھے۔ اسی طرح مجھ کو بھی اپنے اس فخر عالم و اکابر تابع ہونے کا حق ہے۔ جو اسوقت ادا کروں گا جبکہ مرنے سے کچھ پہلے میرے سینے میں سانس کی گنجائش نہ ہوگی۔ اور اسوقت میں قومی قومی کہتا ہوا مر جاؤں گا

زعفران زار

اے وقت تو خوش باد کہ وقت ما خوش کردی

وہ انسان ہی کیا جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کبھی خوش نہ ہو۔ مکروہات دنیوی تو کبھی دم لینے کی فرصت ہی نہ دینگے۔ پس اس چند روزہ زندگی کو ہنسی خوشی گذارنے اور اپنے کام کاج کے بعد طبیعت کو بہلانے یا دماغ کو ستانے کے لئے حکمائے لائیٹ لٹریچر مثلاً (مضحک رسائل و اخبارات و ناول وغیرہ) کے مطالعہ کی تائید کی ہے۔ لہٰذا اس مقصد کو مدنظر رکھکر ہم نے تمام اردو لٹریچر کا جائزہ لیا تو ظریفانہ ناولوں اور کتابوں کی ایک اچھی خاصی فہرست تیار ہوگئی۔ جو سطور ذیل میں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔ یہ سب کتابیں بغایت درجہ دلچسپ۔ سطر سطر ہنسانے والی مستند اور ایک نتیجہ خیز ظرافت میں شرابور ہیں۔ آپ ان میں سے ایک آدھ کتاب ساتویں آٹھویں روز بذریعہ وی پی ہم سے منگا لیا کریں تو آپ کو ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ تفریح طبع حاصل ہوتی رہیگی۔ یہ کتابیں فی الواقعہ تمام اردو علم ادب کا لب لباب ہیں۔ اور ان کو وقتاً فوقتاً نظر گذار کرنے سے آپ کی طبیعت بشاش۔ دل زندہ۔ اور ذاتی قابلیت المضاعف ہونے کے علاوہ آپ جس محفل میں ان کتابوں کے کسی مضمون کا ذکر چھیڑ دینگے وہ محفل کی محفل ہی فوراً لوٹ پوٹ ہوجائیگی۔

منجانب۔ مینیجر شمس ظریف بک ڈپو۔ لاہور

اُردو علم ادب کا نچوڑ

ا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصنیفات

فسانۂ آزاد تین جلد خدائی فوجدار سیر کہسار جام سرشار ہشو کامنی
مع ۱۲ ۸ ۲ ۸/ ۶/ ۸/
پی کہاں کڑم دھم بچھڑی دلہن ان کتابوں کا ایک ایک لفظ ہنسانے والا ہے
۶/ ۶/ ۶/

۲۔ منشی سجاد حسین مرحوم۔ اڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ

احمق الذین حاجی بغلول پیاری دنیا طلسمی دنیا طرحدار لونڈی کایا پلٹ
۱۰ ۱۲/ ۸/ ۱۰/ ۶/
میٹھی چھری ۶/ حیات شیخ چلی ۸/ رتن ناتھ سرشار کے بعد منشی سجاد حسین مرحوم چوٹی کے ناولسٹ اور ظریف نکتہ نگار ہیں۔ ان کی یہ تصنیفات سب کی سب پڑھنے کے لائق ہیں

۳۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تصنیفات

آبِ حیات ع۳ نیرنگ خیال ۸/ جانورستان ۱۰/ آبِ حیات سے بڑھ کر پر مذاق۔ دلچسپ اور اچھی تصنیف آجتک اردو زبان میں نظر سے نہیں گذری۔

۴۔ سید اکبر حسین صاحب مرحوم جج۔ الہ آبادی

کلیات اکبر حصہ اول ۱۲؎ حصہ دوئم ۸؎ حصہ سوئم ۱۲؎ اکبر الہ آبادی کا ہر ایک شعر ظرافت آمیز ہے

۵۔ سر سید اور مولوی نظیر احمد خاں صاحب مرحوم

رسالہ انشاء اللہ (سر سید) ۲ر توبۃ النصوح ۸ر بنات النعش ۸ر مراۃ العروس ۸ر مولوی نظیر احمد یا سر سید سے زیادہ خوش طبع اور کون ہوگا۔

۶۔ شرر۔ اقبال۔ اور حسن نظامی

آغا صادق کی شادی (شرر) ۱۰ر اکبری اقبال ۳ر چٹکیاں اور گدگدیاں (حسن نظامی) ۱۲ر اور لڑائی کا گھر یا پر امیگزین (حسن نظامی) ۸ر حسن نظامی کا کوئی مضمون ظرافت سے خالی نہیں ہوتا۔

۷۔ پروفیسر شہباز۔ نامہ نگار اودھ پنچ لکھنو۔

خیالات شہباز ۸؎ زندگانی بے نظیر ۸؎ کلیات نظیر۔ جدید مکمل ۲؎ پروفیسر شہباز تمام عمر ظریفانہ آرٹیکل اور نظمیں لکھتے رہے ہیں۔

۸۔ حضرت چکبست لکھنوی

گلدستۂ پنچ ۸؎ مباحثۂ گلزار نسیم ۲؎ پنڈت برج نرائن چکبست ایک معرکتہ الآرا ظریف مصنف ہیں

۹۔ سید انشاء اللہ اور مرزا غالب۔

دریائے لطافت ۸؎ کلیات انشاء اللہ خاں ۴؎ عود ہندی (غالب) ۱۲ر اردوئے معلی (غالب) ۲؎

قدیم اُردو نظم کے بنہایت مضحک شاعر غالب اور سید انشا ہیں۔

۱۰ مختلف تصانیف و تالیف ظرافت آمیز

حیات بیربر از فوق - ملا دوپیازہ کی سوانح عمری - نرکوں کا شیخ چلی - گلدستہ ظرافت از نشتر

۸ر ۶ر ۶ر ۱۲ر

امیر خسرو کی پہیلیاں - گلابی اُردو کلام احمق - اپریل فول - بارہ مصالحہ کی چاٹ

۳ر ۳ر ۶ر ۶ر ۶ر

طبابت کے چٹکلے

اس کتاب میں اشتہار باز حکیموں پر ایسا تمسخر اڑایا گیا ہے کہ ایک ایک سطر پر ہنسی کو ضبط کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ہمارے ڈپو کی یہ خاص تصنیف ضرور ملاحظہ فرمایئے صرف ۵ کے ٹکٹ ڈاک میں بھیجدیں یہ چٹکلے گھر بیٹھے آپ کو پہنچ جائینگے۔

منجانب۔ مینیجر صاحب مہتمم ظریف بک ڈپو۔ لاہور

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی محض ناکارہ و بے مصرف گذاریاں

ایک مرتبہ یہ سوال بڑے زور شور سے اخباروں میں اٹھایا گیا تھا - کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کیا کام کرتی ہے - اور آخر وہ کس مرض کی دوا ہے - یعنی سال کے سال اس کا ایک جلسہ ہوتا ہے - اور پھر وہ پورا ایک سال خاموش رہتی ہے - اس کے جواب میں سرسید نے کہا - کہ اس کانفرنس کا کام یہ ہے - کہ آپس کے صلاح و مشورہ اور باتفاق جم غفیر عام مسلمانوں کے اس بات کو قرار دے - کہ کون کون سی بات مسلمانوں کی بھلائی اور انکی قومی ترقی کے لیے مفید ہے - گویا صرف تجویز کرنا اور تدابیر بتانا ہی اس مجلس کا خاص مقصد ہے - اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی - اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سال بھر تک اس نے کچھ کام نہیں کیا - تو اس کی مثال بعینہ ایسی ہے - کہ جیسے ایک قانون بنانے والی مجلس کے متعلق کوئی کہے - کہ اس نے کوئی مقدمہ کیسی فیصل نہیں کیا - یا کسی عمارت کا نقشہ بنانے اور تجویز کرنے والے پر یہ الزام لگایا جائے - کہ اس نے فلاں مکان کا نقشہ تو کھینچ کر دیدیا - مگر وہ مکان نہیں بنایا - یا ایک ڈاکٹر کی اکبر گذاری پہ یہ اعتراض کھڑا کیا جائے - کہ اس نے نسخہ تو لکھدیا - مگر شفا نہیں ہوئی -

مولانا اشہری مرحوم اور سرسید کی مخالفت

مولانا سید امجد علی صاحب متخلص بہ اشہری سنہ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے - یہ ایک ایسے رئیس زادے تھے - کہ ان کی رسم ختنہ پر ان کے والد نے - قریباً بیس ہزار روپیہ پیدا ریز خرچ کیا تھا - جب سرسید کا رسالہ تہذیب الاخلاق جاری ہوا - تو مولانا اشہری بھی ان کے خاص خاص مخالفوں میں شامل تھے - چنانچہ رسالہ تیرھویں صدی میں امداد علی خاں اور مولوی اشہری صاحب نے سرسید کے عقاید کی خوب دھجیاں اڑائی تھیں - آخر یہ جنون مخالفت جب کسی حد تک دور ہوا - اور مولوی اشہری صاحب راہ راست پر آئے - تو اپنی ان حرکتوں سے تائب ہوگئے - اور سرسید کے

مداحوں میں شمار ہونے لگے۔ بقول مومن سب بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آگئے۔ ۱۸۹۵ء میں مولوی اشہری صاحب ایک اسلامی جلسے میں شریک تھے۔ نواب محسن الملک کی باری آئی۔ تو آپ نے اشہری صاحب کی طرف دیکھا۔ اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ آپ ہمارے ان اشہری صاحب کو جانتے ہی ہوں گے۔ جو نہایت قابل اور بذلہ سنج شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں اکثر اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ رنگین نثر لکھتے ہیں۔ ان کو قدرت حاصل ہے۔ اور انشا پردازی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ یہ بہت دنوں تک ہمارے گروہ کے خلاف رہے۔ مگر الحمد للہ کہ اب ہماری برادری میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب ہی میں کہتا ہوں۔ کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ گویا بقول مرزا نوشہ

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
جو صبح جائے اور آئے شام

داد اس طرح دی جاتی ہے

سر سید نے اس تیرھویں صدی (ایک اردو ماہوار رسالہ) کی بابت ایک دفعہ یہ فقرہ لکھا تھا۔ کہ تہذیب الاخلاق کے خلاف میں کوئی رسالہ تیرھویں صدی سے بہتر نہیں نکلا۔ اسیر جناب اشہری کا سوانح نگار قومی نظم کے دیباچے میں رقمطراز ہے کہ ہماری نسبت سر سید کا صرف اتنا لکھ دینا ایسا ہے۔ جیسا کہ مجلس مشاعرہ میں کوئی استاد کسی شاعر کے شعر پر سر ہلا دیتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ صائب کو جیسے ایک کندہ ناتراش نے یہ کہہ کر داد دی تھی۔ کہ او قرم ساق بسیار خوب گفتہ است۔ یہاں بھی کسی قدر یہی معاملہ ہے۔

رسالہ تیرھویں صدی کا ایک اقتباس

اگرچہ یہ بات بڑی شہرت پا چکی ہے۔ کہ آج کل کے مسلمانوں میں حریت اور آزادی کی مقدس تحریک سب سے اول مولانا حسرت نے اپنے رسالہ اردوئے معلیٰ

کے ذریعہ سے کی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ خاص اس امر کا سراغ بھی سرسید ہی کے زمانہ سے
چلتا ہے۔ جبکہ مولانا حسرت موہانی ابھی ایک طفل مکتب ہوں گے۔ ہمارا مقصود یہ ہے
کہ رسالہ تیرہویں صدی میں مولانا اشہری نے ایک ایسا آرٹیکل بھی لکھ کر چھپوا دیا تھا
کہ جس میں وہ سرسید کی کانسرویٹو پالیسی کے خلاف اور نیشنل کانگریس کے علانیہ
موید نظر آتے تھے۔ سرسید کے ہوتے ہوئے کسی کے قلم سے ایسے آزادانہ سیاسی
خیالات کا اظہار بڑی جرأت و جسارت کا کام ہے۔ بلکہ ایک ایسا کام ہے کہ جس کے
ارتکاب نے مولانا حسرت موہانی کو علیگڈھ کالج سے ہمیشہ کے لئے نکلوا دیا تھا۔
گویا یہ بات مولانا حسرت موہانی کے لئے باعث افتخار سمجھی گئی ہے۔ دراصل اس کے
مستحق مولانا اشہری ہیں۔ آپ اس آرٹیکل میں جو تیرہویں صدی میں لکھا
گیا تھا۔ فرماتے ہیں۔ کہ علیگڈھ کالج کو ان چار باتوں کی سخت ضرورت ہے۔
(۱) تمام مسلمانوں کے ایک صنعتی و حرفتی اسکول (۲) ایک قومی آزاد پریس جو مطبعی
آلات اور ساز و سامان وغیرہ سے بالکل مکمل اور لیس ہو۔ (۳) ایک خاص پولیٹکل
ایسوسی ایشن مسلمانوں کا علیگڈھ میں جس کا ایک سیاسی رسالہ بھی ماہوار شائع ہوا کرے
(۴) اسکول کلاسوں سے لیکر کالج کی تعلیم تک اسلامی۔ مذہبی تعلیم کا ایک جدید نصاب
تیار ہو۔ اس تجویز میں اپنے مجوزہ پولیٹکل رسالہ کے متعلق جناب مولانا اشہری صاحب فرماتے
ہیں۔ کہ جیسے سرسید نے قوم کے اخلاق کی اصلاح رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ
سے کی تھی۔ ویسے ہی ضرورت ہے۔ کہ یہ دوسرے سرسید نواب محسن الملک اس پولیٹکل
رسالہ کے ذریعہ قوم پر ایک سیاسی اثر ڈالیں۔ اور ادھر قوم کو ایک پولیٹکل [illegible]
اور ادھر گورنمنٹ پر یہ واضح کرنے کی کوشش اور جد و جہد کریں۔ کہ ہماری یہ قوم سرکار
سے کیا چاہتی ہے۔ اس وقت میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہم ایک بے لگام گھوڑے پر
سوار چلے جا رہے ہیں۔ اور وہ بھی محض لارڈ کرزن کے آگے چلنا چاہتے ہیں۔ اس لئے
نہ خود ہم کو یہ بھروسہ ہے۔ کہ ہمارا یہ بے لگام گھوڑا ٹھیک گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے
پہنچیگا یا نہیں [illegible]۔ اور ہنہنائے گا۔ اور نہ لارڈ کرزن ہی کو اطمینان ہو سکتا ہے

کہ ہم اس کے لئے یا سرکار کے لئے کوئی قابل قدر باڈی گارڈ ثابت ہونگے۔ پس مناسب ہے
کہ اس تجویز شدہ پولیٹیکل ایسوسی ایشن میں نواب محسن الملک کے علاوہ نواب وقار الملک
مولوی مشتاق حسین صاحب مدظلہ بھی ہمارے شریک کار ہوں اور طلبائے کالج کو
ایف اے کے بعد ہی ایک سیاسی بہار دانش کا سبق پڑھا ہیں۔ جو بہت مناسب ہوگا

سید محمود کی تاریخ وفات

ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ کہ مولانا اشہری صاحب ایک قابل شاعر تھے۔ جب سر سید کے جیتے
جی ان کا ایک بیٹا مرا اور پھر یہ سلسلہ اموات ان کے خاندان میں پھیلنے لگا۔ اور ان کا
دوسرا بیٹا بھی وفات پا گیا۔ اور وہ گھر کا گھر ہی صاف ہوتا چلا گیا۔ تو مولانا اشہری
نے یہ رباعی کہکر اپنا ایک حق شاعری ادا کیا۔

اللہ ہے ایک اور معبود نہیں	موجود وہ کون ہے جو مفقود نہیں
افسوس اجل نے گھر کا گھر صاف کیا	سید نہیں حامد نہیں محمود نہیں

مسدس حالی کو کس طرح شہرت دلائی گیا ہے

مولانا موصوف کی یہ شہرہ آفاق نظم جب سر سید کو پہنچی۔ تو آپ نے یہ خط
حالی کو لکھا۔ جناب مخدوم مکرم عنایت نامہ جات مع پانچ جلد مسدس پہنچے
جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی۔ جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی

۱؎ اگلے زمانہ میں نوجوانوں کو جبکہ ان کے زمانہ شباب کا آغاز ہوتا بہار دانش کا
مطالعہ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ تاکہ وہ کسی عورت کے دھوکے میں مبتلا نہ ہوں۔ اشہری
صاحب اس طرح نوجوانوں کے لئے یہ مطالعہ عین فرض خیال کرتے ہیں۔ تاکہ وہ گورنمنٹ یا
اور قوموں سے معاملات دنیوی میں خسارہ میں نہ رہیں۔ یا بہار دانش جیسے ایک ممنوع
کتاب ہے۔ ویسے ہی مضمون سیاست بھی طلبا کے لئے مضر خیال کیا گیا ہے۔ ایسا نہو

اور جب ختم ہوئی۔ تو افسوس ہوا۔ کہ کیوں ختم ہوئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے۔ تو بجا ہے۔ تعجب ہے۔ کہ ایک ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ اور تشبیہات دوراز کار سے (جو مایۂ ناز شعرو شاعری ہیں۔) بالکل مبرا۔ کیونکر اس خوبی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا۔ اس نظم میں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو پائی جاتی ہے۔ تو صرف انہی الفاظ میں ہے۔ جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا۔ اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں۔ کہ خدا پوچھے گا۔ کہ تو کیا لایا۔ کہوں گا۔ کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا۔ اور کچھ نہیں۔

خدا آپ کو جزا خیر دے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے۔ کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں۔ آپ کا خیال ہے۔ کہ اس کا حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے۔ مگر میں نہیں چاہتا۔ کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور اس کے ماتم کا ایک مرثیہ ہے۔ اس قید سے مقید کیا جائے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر مشہور ہو اور لڑکے اس کو ڈونڈوں پر گاتے پھریں۔ رنڈیاں محفلوں میں سارنگی پر گادیں۔ قوال درگاہوں میں گادیں اور حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں۔ اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا دل تو چاہتا ہے۔ کہ شہر دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف جمع ہوں۔ اور رنڈیاں نچواؤں۔ مگر وہ رنڈیاں بھی تمام یہ مسدس ہی گاتی ہوں۔

نواب محسن الملک کا ایک خط طلبائے کالج کے نام

علیگڑھ کالج کے لڑکوں نے ایک مرتبہ یورپین اسٹاف کے برخلاف بغاوت کردی۔ تو نواب محسن الملک ان پر انتہا سے زیادہ لال پیلے ہوئے غیظ و غضب میں یہ خط ان کے نام تحریر کیا۔

میرے عزیزو۔ تم بالکل پاگل ہو گئے ہو۔ تمہارے سر پر اسوقت بدنصیبی

اورادبار کا بھوت سوار ہے۔ جس سے تمہاری عقل جاتی رہی ہے۔ اور تم جاہلوں سے بڑھ کر ضدی ہو رہے ہو۔ مگر میری بات کو سنو اور دل سے سنو۔ کہ بہت جلد دو چار دن میں تم کو اپنی غلطی معلوم ہو جائے گی۔ تم کوئی نادان بچے نہیں ہو۔ تم جاہل نہیں ہو۔ تم کچھ شریر اور مفسد بھی نہیں ہو۔ تم کو صرف اپنی حالت کی نسبت چند شکایتیں ہیں۔ مگر لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ تم کانگریس میں شریک ہو گئے ہو۔ اور تمہارے دل میں انگریزوں کی نسبت اچھے خیالات نہیں رہے۔ اور تم اب گورنمنٹ کی نسبت بھی اچھے خیالات نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ تمہاری طرف سے انگریزوں کی جان پر بھی حملہ کرنے کا خوف پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں۔ کہ انگریزوں اور گورنمنٹ کی نسبت تمہارے خیالات اب تک ویسے ہی پاک۔ عمدہ اور شریفانہ ہیں جیسے کہ میں جانتا ہوں۔ مگر تم کو شرم اور رنج کرنا چاہیئے۔ کہ تمہاری بعض غلطیوں غلط فہمیوں یا غلط کاریوں سے ایسے غلط خیالات تمہاری نسبت پیدا ہو گئے ہیں۔ پس تم کو ڈوب مرنا اور زہر کھا کر مر جانا چاہیئے۔ کہ تمہاری نسبت ایسے غلط خیالات پیدا ہونے سے ساری کی ساری قوم مشتبہ ہو۔ اور سرسید کی پنجاہ سالہ کوشش برباد جائے۔

تم پر خبیث روح کسی موذی شیطان کی چھا گئی ہے۔ جس سے تمہاری آنکھیں سیاہ اور کان بہرے ہو گئے ہیں۔ کہ تم ایک بات بھی نہیں سنتے۔ چار روز ہو گئے۔ کہ میں تم کو سمجھا رہا ہوں۔ باہر سے ٹرسٹی بھی جو تمہارے باپ کے برابر ہیں۔ اپنا سب کاروبار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ مگر تم نے نہ مانا۔ نہ مانا۔ آخر وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ یہ تمہاری عقلمندی نہ تھی۔ بلکہ نہایت حماقت اور نالائقی تھی۔

ان سب باتوں کو سنکر تمہیں کوئی سعید نہیں کہیگا۔ بلکہ نہایت ہی نالائق اور بدنصیب کہیگا۔ خود تمہارے والدین تم پر لعنت کریں گے۔ اور تمہاری اس روش پر تمہاری صورت تک دیکھنا پسند نہ کریں گے۔ کیا سوائے دلی محبت اور شفقت کے کوئی اور وجہ ہے۔ کہ اسوقت جبکہ ساری دنیا آرام سے سو رہی ہے۔ اور میں

ستر برس کا بوڑھا بیمار آدھی رات کے بارہ بجے تم کو یہ آخری تلقین سنا رہا ہوں اور میرے کم بخت دل سے تمہاری محبت نہیں جاتی۔ اور وہی تکلیف دے رہی ہے

میرے نالائق فرزندو سنو! اور دل کے کان کھول کر سنو۔ کہ میں تمہارا سچا دوست۔ دل سے بہی خواہ اور تمہارے باپ کے برابر تم کو چاہنے والا ہوں۔ اب بھی تم ہوش سنبھالو۔ ضد کو چھوڑ دو۔ اور جو فیصلہ ہوا ہے۔ اسے یا تو قبول کرو۔ اور کل ہی اس کی تعمیل کرو۔ ورنہ جہاں تمہارے سینگ سمائیں۔ جاؤ۔ آگ میں گر و۔ اور اپنے ماں باپ کو عمر بھر رلاؤ۔ خوب سمجھ لو۔ کہ تمہارا کوئی دوست نہ ہوگا۔ اور کوئی تمہاری غم خواری نہ کرے گا۔ ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ امتحان میں تم نہ جا سکو گے۔ تعلیم کا دروازہ تم پر بند ہو جائے گا۔ اور اپنے بزرگوں کی نظروں میں تم نہایت ذلیل و ناکارہ ٹھہرو گے۔

غلط خیالات سے تم اپنے دماغوں کو پریشان نہ کرو۔ اس وقت حکم کی تعمیل کرنا تمہارے لئے برکت و رحمت ہوگا۔ ورنہ کالج کی بربادی۔ قوم کی بربادی اور سر سید کی محنت کی بربادی۔ تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔ تم بدترین اولاد اہل اسلام سمجھے جاؤ گے۔ تمہارے بزرگ تم پر لعنت اور تمہارے سچے دوست تم پر افسوس کریں گے۔ البتہ دشمن شاد ہوں گے۔ اور اس اسلامی کالج کو جو تمہارے ہاتھوں سے بنا تھا۔ تمہارے ہاتھوں برباد ہوتا دیکھ کر خوش ہوں گے۔ خدا کے لئے سمجھو اور اب سمجھو۔ کہ توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اور ابھی آفتاب مغرب سے نہیں نکلا اور جو اب بھی نہ سمجھو۔ تو خدا تم سے سمجھے۔ تمہارے لئے ایک دروازہ کھلا ہوا ہے دوزخ میں یا جہنم میں۔ میں بھرا جڑے ہوئے تکیہ پر فاتحہ پڑھنے کے لئے نہ رہوں گا میرے لئے بھی راستہ سیدھا کا کھلا ہوا ہے۔ تمہاری نالائقیوں اور تمہاری بدنصیبیوں پر روتا ہوا افسوس کرتا ہوا چل بسوں گا۔ لو عزیزو رخصت۔ رخصت۔ رخصت۔ محسن الملک کہتے ہیں۔ کہ اس غضب آلود تحریر کا اثر کالج کے باغی لڑکوں پر فوراً ہوا اور وہ راہ راست پر آ گئے۔ صد شکر ہے وہ میرا کہا مان تو گئے۔

سرسید کا زنیو بھیا کے نام ایک خط

مولوی زین العابدین صاحب اسب جج مچھلی شہر سرسید کے دلی دوستوں میں سے تھے - آپ ان کو پیار سے زنیو بھیا کہا کرتے تھے - سطور ذیل میں انہی زنیو بھیا کے نام سرسید کا ایک خط درج کیا گیا -

مکرمی زنیو - ابھی تمہارا خط نہ پہنچا - اس میں کچھ شک نہیں - کہ تم سے مجھ کو جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے - جیسے کہ لکھا ہے - مگر تم اس رنج کو کسی قدر نہ سمجھ سکے مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہوا - وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا -

میری زبان کھجلاتی ہے - اور کوئی یہاں نہیں - کہ میں اس کو برا بھلا کہوں - میرے دل میں غصہ آتا ہے - مگر کوئی یہاں نہیں ہے - جس پر اپنا غصہ نکالوں - ہاتھ کھجلاتے ہیں - اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماردں - حقیقت میں تمہارے چلے جانے سے مکان سونا نہیں ہے - بلکہ میرا دل سونا ہو گیا ہے - صبح اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا - بلکہ تم یاد آتے ہو سے ایک ہرگز فراموشت نکنم -

سرسید مرحوم سے ننگے سر بنگالیوں کے تعلقات

چونکہ سرسید سے نیشنل کانگرس بہت ناراض رہتی تھی - بنگالی ان کو کچھ اچھا نہ جانتے تھے - اور وہ بھی ان ننگے سر کالے کلوٹے بنگالیوں کی کائیں کائیں سنکر کبھی ان سے خوش نہ ہوتے تھے - چنانچہ ایک سیاسی لکچر کے دوران میں کہا - کہ ان دنوں ہمارے یہ بنگالی بھائی ریپریزنٹڈ گورنمنٹ مانگتے ہیں - مگر اے بھائیو - کبھی تم نے سنا ہے - کہ ان بنگالیوں نے بھی کسی زمانے میں حکومت کی ہے - یہ حکومت تو آج کل قوم انگریزی کا حق ہے - دیکھو اسوقت ایک یورپین (صاحب بہادر) شریک مجلس ہیں - وہ کالے نہیں ہیں - بہت گورے چٹے ہیں - تو ہم ان گورے منہ والوں کی جن کو خدا نے ہم پر حاکم کیا ہے - کیوں نہ اطاعت کریں - اور ان سے وفاداری کریں - تاکہ خدا کا

حکم بجا لائیں۔ جو یہ کہتا ہے۔ کہ اگر تم پر حبشی غلام بھی حاکم ہو۔ تو اس کی اطاعت کرو۔
اور یہ تو گورے چٹے یورپین اہل کتاب ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اگر ہم کو بھی گورنمنٹ سے
کوئی شکایت ہے۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ خدا کی گورنمنٹ میں بھی
تو لوگ کبھی اس کا شکر نہیں کیا کرتے۔

اہل کتاب سے کھانا کھانے میں افراط و تفریط

جب سرسید کے اس مسئلہ کو کہ اہل کتاب کے ساتھ کھا لینا جائز ہے۔
اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ یا جہاز کے سفر میں گردن مروڑی مرغی تک کھا جانا
روا ہے۔ عام مولویوں نے سنا۔ تو سرسید مرحوم پر ہر طرف سے کفر کے فتووں
کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ لہٰذا نواب محسن الملک نے اس کو ناواجب خیال کرکے
یوں ارشاد فرمایا۔ کہ اگر سرسید نے انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے کو بلاتحقیق
و تفتیش جاری کر دیا ہے۔ اور گردن مروڑی مرغی بھی حلال کہی ہے۔ تو
اس کا جواب یہی ہے۔ کہ انگریزوں کا کھانا اور انہی کے ساتھ کھانا نہ صرف
مکروہ خلاف تقوٰی ٹھہرایا جاتا۔ بلکہ بالکل ممنوع یا حرام یا قریب بکفر کر دیا
جائے۔ مگر اس بارے میں اتنا تشدد نہ ہو۔ کہ یہ سمجھا جائے۔ کہ مسلمانوں کا مذہب بھی
نعوذ باللہ کوئی ہندوؤں کا سا ہے۔ کہ کسی کے ساتھ کھانا کھانے یا کسی کے گھر کا
کھا لینے سے بس دین یا دھرم ہی جاتا رہتا ہے۔

انگریزی نہ جاننے سے آج کل زندگی بسر کرنا دوبھر ہو گیا ہے

سرسید ایک موقع پر انگریزی خوانی کی یوں تائید فرماتے ہیں۔ کہ قطع نظر
عمدہ نوکریوں کے ملنے اور معزز عہدوں کے حاصل ہونے کے بغیر انگریزی جانے
ہم اپنے روزمرہ کے ضروری کام بھی بخوبی کر نہیں سکتے۔ بغیر انگریزی تجارت
نہیں ہو سکتی۔ کام سے بخوبی ارتباط حاصل نہیں ہوتا۔ قوانین احکام

سرکاری کام نشار بخوبی سمجھ میں نہیں آتا ۔ غیر ملکوں اور زبانوں کا مطلق حال نہیں کھلتا ۔ یہاں تک کہ کبھی ریل پر جائیں ۔ تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اسٹیشن پر کون دروازے سے آئیں ۔ اور کون دروازے سے جائیں ۔

اولڈ فیشن اور نیو فیشن

سر سید لکھتے ہیں ۔ کہ ہمارے ہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں ۔ ایک اولڈ فیشن یا کھوڑ یا وہ عمر والے جن میں ایک میں بھی ہوں ۔ دوسرے وہ لوگ جن کو نئی روشنی والے کہتے ہیں ۔ یعنی نو فیشن ۔ اب ان دونوں گروہوں میں اختلاف پڑ گیا ہے پرانے فیشن کے لوگ تو یہ کہتے ہیں ۔ کہ یہ نئی روشنی والے فیشن ایبل جنٹلمین بغیر کسی دھکے کے سیدھے جہنم میں جائیں گے ۔ کیونکہ دنیا میں ان سے زیادہ کوئی بدمعاش نہیں ہے ۔ میں اس بات کو قبول کرتا ہوں ۔ مگر ان نو فیشنوں کو ہدایت کرتا ہوں ۔ کہ وہ اولڈ فیشن والوں کا ادب کیا کریں ۔ تاہم ان بزرگوں کو بھی یاد رکھنا چاہئیے ۔ کہ وہ لوٹا یکہ جس میں سینکڑوں ہچکولے لگتے ہیں ۔ اور جس میں ہم تم سفر کیا کرتے تھے ۔ اب بیکار ہو گیا ہے ۔ ریل جاری ہے ۔ اس ریل کو چھوڑ کر کون احمق ہے ۔ جو اس یکہ میں سفر کرے گا ۔ گویا آب آمد تیمم برخاست ۔

سر سید اور داڑھی کی نسبت ان کے خیالات

آپ فرماتے ہیں ۔ کہ داڑھی لب ٹھیک و جسیانہ پن سے نہ رکھی جائے ۔ تہذیب کے خلاف نہیں ہے ۔ چنانچہ ہزاروں لاکھوں انسان جو نہایت مہذب قوم کے ہیں ۔ داڑھی رکھتے ہیں ۔ اور ہمارے ملک کے بھی خوبصورت گورے رنگ کے چہروں پر کالی داڑھی نہایت عمدہ اور بھلی معلوم ہوتی ہے ۔ ہاں جب سفید ہو جائے ۔ تو منڈوا لینے کے قابل ہو جاتی ہے ۔ بشرطیکہ منہ کی جھریاں ۔ گالوں کے

کرتے ہے۔ اور منہ کا پھیلا پن صورت کو بدنما نہ کر دے۔ علاوہ ازیں منہ کی رونق۔ شجاعت۔ بہادری اور رعب اس سے پایا جاتا ہے۔ پس اس کا رکھنا نہ رکھنا ہماری بحث سے خارج ہے۔ اور ہم قطعاً ان مسائل سے بحث نہیں کیا کرتے۔ جن کی تہذیب بالغ نہیں ہے۔

اسی طرح اگر داڑھی منڈوانا ناجائز ہے۔ تو اس میں ہمارا کچھ حرج نہیں اور اگر جائز ہے۔ تو اس میں ہمارا کچھ نقصان نہیں ہے۔ لیکن اگر داڑھی کو ایک ایسی ٹٹی بنایا جائے۔ کہ جس کی اوجھل شکار کھیلا جا سکے۔ تو اس سے داڑھی کا منڈوا دینا ہی بہتر ہے۔

خطبات احمدیہ کا ایک چٹکلہ

ایک مرتبہ سر ولیم میور نے بعض نادان معترضین اسلام کے حوالہ سے یہ حدیث بیان کی تھی۔ کہ عبد اللہ مسعود نے حضرت محمد صلعم کی زبانی ایک رات کسی آیت کو لکھ لیا تھا۔ صبح کو اسے کاغذ پر دیکھا۔ تو اڑا ہوا پایا۔ اس کے متعلق آنحضرت سے دریافت کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ وہ آیت آسمان کی طرف اڑ گئی۔ اور پھر اسی واقعہ کے بعد غور سے دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہی آیت اور مسلمانوں کے قرآنوں سے بھی غائب ہو گئی ہے۔

سر سید مرحوم نے اس روایت کو جو بالکل غلط تھی۔ اور سر ولیم میور بھی اس کو صحیح نہیں جانتے تھے۔ جب پڑھا۔ تو کہا۔ کہ عجب ہے جس روایت کے راوی کا بھی حال معلوم نہیں۔ وہ بعض معترضین اسلام نے کیسے قبول کر لی۔ یہ تو محض یاروں کی ایک ایجاد اور گرد شیمی کے کبوتر کی طرح اصلیت سے بالکل خارج معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ گرد شیمی کا کبوتر کیا چیز ہے۔ اس کا حال سطور ذیل میں پایا جائے گا۔

گردشیمی کا کبوتر

ایک عیسائی محقق اسلام یقین رکھتے تھے۔ کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے۔ کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کبوتر ایسا سدھایا ہوا موجود تھا۔ جو آپ کے کان کی میل نکالا کرتا تھا۔ اور آسمان پر جاکر آپ کے لئے وحی بھی لایا کرتا تھا خوب۔ گیا وہ کام جو جبریئل علیہ السلام کے متعلق ہے۔ کبھی ایک کبوتر سے سرانجام پا سکتا تھا۔

سرسید۔ مولانا شبلی اور مولوی ممتاز علی صاحب

ایک صحبت میں یہ تینوں بہادران قلم موجود تھے۔ اور خوب باتیں ہو رہی تھیں کچھ ادھر کی۔ کچھ ادھر کی۔ اتفاقاً سرسید کا ایک ضروری کاغذ (جس پر کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی) کھو گیا۔ بہت ڈھونڈا۔ مگر کہیں نہ مل سکا۔ جب سرسید سخت پریشان ہوئے۔ تو کسی طرح مولوی شبلی مرحوم نے اس کاغذ کو پالیا اور سرسید کو ذرا اور ستانے کے تماشہ دیکھنے کی نیت سے اس کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ادھر سرسید بھی اس ادائے خاص سے بھانپ گئے۔ کہ مطلوبہ کاغذ کو مولانا شبلی دانستہ اپنے ہاتھ کے نیچے دبائے بیٹھے ہیں۔ اور محض خوش طبعی کے ارادہ سے کاغذ کو چھپا رکھا ہے۔ آپ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ اور کہا۔ کہ بزرگوں کا قول صحیح ہے۔ کہ جب چیز گم جاتی ہے۔ اس کو شیطان اپنے ہاتھ کے تلے دبا کر بیٹھ رہتا ہے۔ ذرا دیکھنا تو میرا وہ کاغذ کہیں تمہارے (شبلی مرحوم) کے ہاتھوں کے تلے تو نہیں۔ اس پر مولانا شبلی نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اور وہ کاغذ نظر آیا۔ تو سب کی باچھیں کھل گئیں۔ اور خوب ہنسی ہوتی رہی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں نواب محسن الملک کا پریزیڈنشل ایڈریس

دسمبر ۱۸۹۳ء میں یہ کانفرنس علیگڈھ میں منعقد ہوئی۔ تو سید مہدی علی یا نواب محسن الملک اس کے پریزیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اس اعلےٰ عہدہ پر فائز ہوکر اپنی کسر نفسی کا اظہار کرنے کے لیے نواب صاحب موصوف نے ایک عجیب انداز میں اپنے پریزیڈنشل اعزاز کا اعتراف کیا۔ یعنی اٹھ کر کہا۔

بزرگان قوم و برادران! جو عزت اس وقت یہ اپنے اس معزز اور قومی جلسہ کے صدر انجمن ہونے کی مجھ بخشی ہے۔ وہ ایک ایسی عزت ہے کہ ہر ایک نامور مسلمان اس پر فخر کرسکتا ہے۔ اور مجھ سا ناچیز آدمی تو جس قدر اس پر فخر کرے اور آپ کا شکر یہ ادا کرے۔ وہ کم ہے۔ میں جبکہ ایک طرف اس معزز خدمت کے مشکل فرائض کو دیکھتا ہوں۔ اور دوسری طرف اپنی ناقابلیت کو۔ تو چاہتا ہوں۔ کہ اس بیچارے مومن مسلمان کی طرح جسے نمازیوں نے زبردستی نماز پڑھانے کے لیے آگے کر دیا تھا۔ اور وہ نمازیوں کو سجدہ میں چھوڑ کر مسجد سے چل دیا تھا۔ میں بھی موقع پاکر نکل جاؤں لیکن چونکہ موقع کے ملنے کی مجھے امید نہیں۔ اس لئے برا ہوں یا بھلا۔ آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ اور بہ تعمیل آپ کے حکم کے اس کرسی پر بیٹھتا ہوں۔

(پھر اس تقریر کے بعد وہ وہیں سے پریزیڈنشل کرسی پر بیٹھ گئے۔)

ادب کیا چیز ہے

سرسید فرماتے ہیں۔ کہ ہمارے ہاں ادب کے یہ معنی ہیں۔ کہ لڑکا اپنے بزرگوں کے ڈر کے مارے کوئی سچی بات منہ سے نہ نکال سکے اور جھک جھک کر بلا ضرورت

سلام پر سلام کیا کرے۔ یہ ویسا ہی ادب ہے۔ جیسا کہ ایک بندر والا بندر کو سکھاتا ہے کہ ٹانگ اٹھا کر کھڑا رہے۔ ہاتھ جوڑ کر گردن نیچی جھکا کر سلام کرے۔ اور ایک اشارہ کے ساتھ ڈگڈگی پر چڑھ بیٹھے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ادب نہیں۔ بلکہ سوء ادب ہے۔ کیونکہ اس سے لڑکے کو ریاکاری و ظاہرداری کی تعلیم ہوتی ہے۔

آج کل کے مسلمانوں کی ہمدردی

نواب محسن الملک سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آپ نے کہا کہ اگلے زمانے کے مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ اور جب ایک کو تکلیف پہنچتی تھی۔ تو دوسرا اس کی مدد

کیا کرتا تھا۔ گویا یہ ساری کی ساری قوم ایک جسم تھا۔ اور اس پہ شیخ سعدی کا یہ قول صادق آتا تھا ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

لیکن اب کیا سبب ہے۔ کہ ایک کا دوسرے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق نواب صاحب نے یہ حکایت بیان کی۔ کہ عرفی اکبر کے زمانہ میں ایک مشہور شاعر گذرا ہے۔ اس نے جب اپنے وقت کی متعدد بے دردیاں اور لوگوں کے آپس کے ساتھ بڑے سلوک ہوتے دیکھے۔ تو اس نے اس رباعی کے مصرعہ اول کی ترمیم کی۔ اب وہ ترمیم شدہ مصرعہ ہمارے حسب حال ہے۔ کہ بجائے

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

مصرعہ

بنی آدم اعدائے یک دیگر اند

نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں۔ کہ نواب محسن الملک اور سرسید مرحوم کے وقت اگلے مسلمانوں میں تو کچھ اخوت بھی ہوگی۔ بقول کل مومن اخوۃ۔ لیکن اب ہماری حالت اس سے بھی گئی گذری ہے۔ سنیوں اور شیعوں کے اختلافات نے ایک ایسا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ کہ الامان۔

پروفیسر ذکاء اللہ بطور ناکم پیس

منشی ذکاء اللہ مرحوم مکانات کی مرمت کرایا کرتے تھے۔ وہ اور گھر میں ان کی گھڑی طور پر چلے گئے تھے۔ ٹھیک ایک ہی وقت پر آیا جایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ ایک دن سید حامد (فرزند سرسید) کی گھڑی ٹھہر گئی۔ وہ ذکاء اللہ صاحب کو دیکھ کر گئے اور جب قریب آئے تو گھڑی درست کرلی۔ گویا پروفیسر ذکاء اللہ نہ ہوئے ایک صحیح ٹائم پیس ہوئی
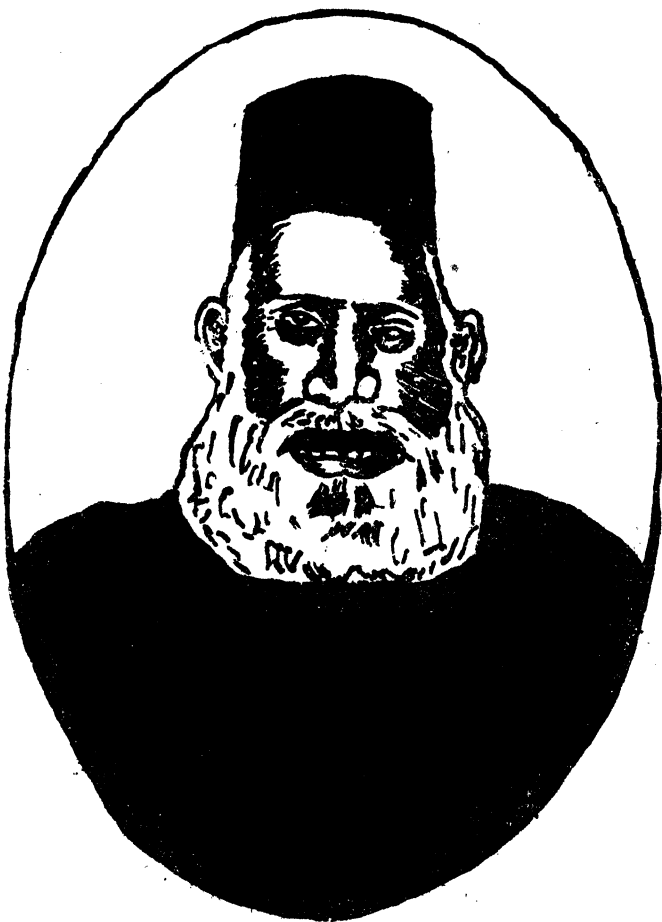
شبیہ نواب محسن الملک بہادر

مولوی نذیر احمد اور میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں

جذبات ہمایوں میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسے میں مولوی نذیر احمد صاحب نے حسب معمول اپنی تقریر کو آیات قرآنی و عربی معقولات و منقولات سے مزین کیا۔ میاں شاہ دین صاحب (چیف جسٹس متخلص بہ ہمایوں) عربی کے عالم نہ تھے۔ مولوی صاحب موصوف کے تبحر علمی کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمے دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

حاضرین جلسہ یہ شعر سُن کر مُسکرا دئے۔

میاں صاحب موصوف اور سید محمود مرحوم کا ایک لیکچر

ایک قومی مجمع میں یہ دو نو جج صاحبان (سید محمود و ہمایوں) موجود تھے جب اول الذکر نے اپنا وہ مشہور لیکچر پڑھا جو اس کتاب میں کہیں درج کیا گیا ہے تو جسٹس شاہدین صاحب خصوصاً مجلس سے مخاطب ہو کر یوں کہنے لگے۔

یہ لیکچر محض ایک لیکچر نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک صدائے عام ہے کہ اپنی خوبروئی و خوش خرامی پر ناز کرنے والو۔ آؤ۔ دم بھر کے لئے اس آئینہ خانہ میں ہوتے جاؤ۔ تاکہ تم کو خود معلوم ہو جائے۔ کہ تمہاری جماعت نوجوان۔ قوی ہیکل۔ وجیہہ ترکوں کا ایک جرار لشکر ہے یا کہن سال۔ گرسنہ شکل اور کریہ منظر حبشیوں کا ایک گرد آلود فرقہ۔

اگر تم کو اس کا یقین ہو جائے۔ تو پھر اس حبشی کی طرح جس نے پہلی ہی دفعہ کسی آئینہ میں ایسی بھونڈی صورت دیکھ کر اس آئینہ کو جھنجلا کے توڑ

ڈالا تھا۔ کہیں اس لیکچر کو بھی نہ پھاڑ ڈالنا۔ اور کہیں طیش میں آکر یہ نہ کہہ اٹھنا۔ کہ توبہ توبہ مسلمانوں کی قوم پر جو بلاشک خیرالامم ہے۔ یہ کیسے ناپاک الزام لگاتے گئے ہیں۔ خدانخواستہ ہم ایسے کیوں ہونے لگے۔ مگر ہاں ہم ایسے ہیں۔ ایسے ہیں اور ضرور ایسے ہیں!!

سید محمود کی بادہ پرستی و میخواری

یہ بات سب مسلمانوں کو معلوم ہے کہ سرسید کے فرزند ارجمند سید محمود مرحوم بڑی قابلیت کے آدمی تھے۔ لیکن انکو ذوق شراب اور یورپین طرز معاشرت نے بالکل کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ چنانچہ کلکتہ کی ججی اس مے نوشی کی وجہ سے ان سے چھوٹی۔ سرسید نے کالج کے بڑے بڑے جان نثاروں اور دلی دوستوں کو ناراض کر کے سید محمود کو اپنا جانشین بنایا۔ تو اس لال پری کی بدولت وہ اس اہم قومی عزت کو بھی سنبھال نہ سکے اور قوم کو مایوس کیا۔ پھر تھوڑی قانونی پریکٹس کرنے لگے تو اس میں بھی مے نوشی کے سبب پہلے جو کام چلا تھا دھرا رہ گیا۔ گویا بقول مرزا نوشہ ؂

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا آدمی تھے ورنہ ہم بھی کام کے

اس امر کی طرف اشارہ کر کے کسی لیکچر میں نواب سید محسن الملک صاحب فرماتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ایک سید محمود ہی تھے جو درحقیقت اپنے معزز اور نامور باپ کے سچے اور اصلی قائم مقام ہو سکتے تھے۔ اور جو اپنے بزرگ والد کے نا تمام کاموں کو نہایت خوبی سے پورا کر سکتے تھے۔ کاش وہ تندرست رہتے اور انکی طبیعت مائل الی القوم ہوتی اور مدرسۃ العلوم کا کام جیسا ابتدا میں انہوں نے کیا تھا۔ اور سرسید کو اس سے بہت مدد ملی تھی۔ وہ اب بھی کر سکتے۔ اور سرسید کی وفات کا اثر کسی پر محسوس نہ

ہوتا۔ اور علی گڑھ کالج کے یونیورسٹی ہوجانے میں کسی کو شک وشبہ نہ رہتا۔ کیا ان کے سامنے قوم کسی اور کو نظر اٹھا کے بھی دیکھتی ؟ یا ان کے مقابل پر کوئی کھڑا ہوسکتا تھا۔ غالباً بلکہ یقیناً سارا ہندوستان ان کے ساتھ ہوتا۔ اور سب سے اوّل تو میں ان کا غاشیہ اپنے دوش پر لیکر ان کے پیچھے پیچھے چلتا !!!

سیّد محمود مرحوم کی شاعری

سرسید کی اردو شاعری اور فارسی شاعری کے کچھ نمونے اس کتاب میں درج کئے جاچکے ہیں۔ اب سید محمود کی شاعری کا بھی ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ گویا ہرچہ پدر نکرد پسر تمام کند ؎

ہمے خواہم کہ چیزے خوب گویم بہر ہندستاں
کہ ہندوستاں نژادہستیم وہندوستاں جانم

چوں قید قافیہ بندی نباشد بر زبانِ من
بدل ہرگز نمے آید کہ ایں فن راہمے دانم

مرا یاریست شیریں کار و مے نازم کہ درگیتی
ندارد ہیچکس یارے چنیں یارے کہ من دارم

(ق)

الا اے ہندی مہدی کہ مشغول دگن گشتی ‏— مرا ہم باز پرس آخر کہ عشقت ہست در بانم
دریغ از گردش گردوں کہ دور افتادہ ام از تو ‏— کہ ہستی انتخاب از زمرہ احباب و اخوانم

ازاں گفتم من اے محمود ایں اشعار رنگیں را
کہ مخدومی اخی مہدی علی شدجان و ایمانم

خوب۔ یک نہ شد دو شد۔ باپ بھی شاعر بیٹا بھی شاعر مگر حقیقت یہ ہے کہ صحیح معنوں میں یہ دونوں مل کے بھی "ایک شاعر" نہ بن سکے!!
غرض جب سید محمود اس دنیا سے گذر گئے۔ تو مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے نے انکی تاریخ وفات لکھی۔ جس میں ایک یہ شعر بھی کہا تھا ؎

عظمت کبھی محسوس نہ اپنی ہوئی اُس کو
باطن میں فرشتہ تھا وہ ظاہر میں بشر تھا

سید محمود کی جانشینی کالج اور نواب وقار الملک صاحب بہادر

سرسید کی زندگی کے دن جب قریب ہوئے۔ تو انہوں نے اپنے فرزند ارجمند سید محمود مرحوم کو اپنے بعد کالج کا سیکرٹری بنانا چاہا اس پر سخت مخالفت ہوئی اور یہ بیجا مخالفت تھی۔ کیونکہ سید محمود مرحوم ہرگز اس اہم قومی عہدہ کے قابل نہ تھے۔ تاہم سرسید جو فطرتاً ایک ضدی شخص واقع ہوئے تھے۔ قریباً تمام ٹرسٹیوں کے اس امر میں مخالف ہو گئے اور یہ تجویز بزور پاس کرانی چاہی۔ مگر وہ جس قدر اصرار کرتے۔ نواب وقار الملک اتنا ہی انکار کئے جاتے تھے۔ آخر جھنجھلا کر سرسید سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے۔ اسیطرح دو ایک انسانوں کے متعلق اگر کوئی خطا کی ہو تو آپس میں صلح صفائی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک ملک اور قوم کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنے گناہ بخشواتا پھریگا (اجی حضرت) تمام عمر بھر بھی اسکی اگر صرف ہو جائے۔ تو وہ عہدہ بھلا نہیں ہو سکتا ؛

اجتماعِ ضدین

بشیر پاشا سربز کے عنوان سے جو سلسلہ کتب حال میں شائع ہوا ہے اس ہین کے تذکرہ سرسید کے صفحہ ۱۴۸ پر لکھا ہے کہ اگرچہ سرسید کی تعلیم مکمل نہ تھی۔ دولت و ثروت سے بھی وہ محروم تھے۔ نہ حکومت میں کوئی غیر معمولی حیثیت رکھتے تھے۔ اور جدید ترقیات و علوم سے تو مطلق بے بہرہ تھے۔ جیسے کہ سیاسات و تعلیم جدید کے اصولوں سے وہ ناآشنائے محض تھے۔ مگر بایں ہمہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے مصنف سب سے زیادہ صاحب جاہ و ثروت اور حکومت کے اعلےٰ ترین معتمد علوم جدید کے سب سے بڑے قدر شناس اور ماہر سیاسات و ماہر تعلیم قرار پائے۔ آجکل کی تعلیم یافتہ و مہذب پود میں کتنے ہیں۔ جو سرسید کے ایسے تناور و بار آور درخت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سچ ہے یہ اجتماع ضدین اسی شخص کا حصہ تھا۔ جو قدیم تعلیم اور ایک فرسودہ تہذیب کی خاک سے اٹھا۔ نہ کہ عہد موجودہ کے کسی اپ ٹوڈیٹ فشنیبل جنٹلمین کا بقول شخصے ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

سرسید کی وضع قطع

بچپن سے آپ شرفائے دہلی کی مانند ملبوس رہا کرتے تھے۔ یعنی سر پر ایک گول یا چوگوشہ ٹوپی نیچا کرتہ اس پر صدری۔ ٹخنوں سے اونچا مغلئی مولویوں کیسا پائجامہ۔ اور گلے میں ایک لمبا چوڑا رومال بھی بندھا رہتا تھا۔ تاکہ انکی لمبی داڑھی کے تلے جو ایک بڑی سی رسولی تھی وہ خوب چھپی رہے۔ لیکن وہ جب انگلستان

تشریف لیجانے کو تھے۔ تو بعض انگریزوں کے مشورہ سے ترکی ٹوپی۔ ترکی کوٹ اور پتلون کے ساتھ ولایتی بوٹ بھی پہننے لگے۔ پھر ہمیشہ کو یہی وضع اُنہوں نے اختیار کرلی۔ حالانکہ اس فرنگیانہ پوشاک سے سرسید کو اکثر تکلیف پہنچا کرتی تھی۔ مگر وہ اس وضع کو کبھی چھوڑ نہ سکے۔ بلکہ بعض یورپینوں سے بھی وہ اسلئے ملاقات نہ کرسکے کہ ان کے کمرون میں پاؤں سے جوتہ اُتار کر جانا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ حضور نظام کی خدمت میں جو وفد مدرسہ علیگڈھ کا حاضر ہُوا۔ تو اس میں بوٹ نہ اتارنے کی علت سے مجبور ہوکر وہ اس وفد کی شرکت سے بھی محروم رہے اور اسی طرح ایک دفعہ وہ نواب کلب علی خاں سے رامپور ملنے گئے۔ تو اُن سے بوٹ سمیت کمرہ میں جانے اور کرسی پر ڈٹ کر بیٹھنے کی پہلے ہی اجازت حاصل کرلی تھی۔

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب اور سرسید کے اختلافات

جن دنوں مسٹر بیک صاحب علیگڈھ کالج کے پرنسپل تھے۔ یورپین اقتدار بہت بڑھتا چلا جاتا تھا حتےٰ کہ بیک صاحب موصوف کالج کے تمام سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے تھے مگر یہ بات بعض ٹرسٹیوں کو ناگوار گذری۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں اس امر میں سرسید کے سخت مخالف ہوگئے۔ اور یہ تجویز پیش کی۔ کہ علیگڈھ کالج کا یورپین اسٹاف ہمیشہ ملازم کی حیثیت سے رہے۔ اور اس کی ذمہ واری محض تعلیم و تعلم کی حد تک محدود رکھی جائے نہ کہ ان صاحب بہادروں کو مسلمان بچوں کی نگرانی اور تربیت کا بھی ضامن گردانا جائے کیونکہ وہ اسلامی عقاید اور مسلمان بچوں کے محسوسات وغیرہ سے عموماً ناواقف ہُوا کرتے ہیں۔

یہ خیال تو بیشک بہت اچھا تھا۔ مگر سرسید نے اس کی سخت مخالفت

کی اور کہا کہ آجکل کے مسلمانوں کے اخلاق از حد بگڑ چکے ہیں۔ لہذا۔ یورپینوں ہی کا کالج کی ہر بات میں دخل ہونا۔ بہتر ہے۔ پھر ایک قانون بنام مجموعہ قواعد وقوانین ٹرسٹیان سرسید نے پاس کرانا چاہا۔ تاکہ اس قسم کے واقعات پھر کالج کے اندر کبھی نہ ہوسکیں اور یورپینوں کو علیگڈھ کالج کے اندر ہمیشہ من مانی کارروائیاں کرنے کی اجازت حاصل ہو۔

چونکہ سرسید اس بات پر اپنی ساری توجہ اور ہمت کے ساتھ ڈٹ گئے تھے۔ ادھر مسٹر بیک کا رسوخ بھی احاطہ کالج میں کچھ کم نہ تھا۔ آخر مولوی سمیع اللہ خاں کو شکست اور سرسید کی پارٹی کو فتح نصیب ہوئی۔ لیکن ایک عرصہ دراز تک اس پر پمفلٹ بازی ہوتی رہی۔ حتےٰ کہ مولوی صاحب موصوف کامل ۲۵ برس اس کالج کی خدمت کرکے اب اس سے مستعفی ہوگئے۔ افسوس یہ وہی مولوی سمیع اللہ خاں صاحب ہیں۔ کہ جنھوں نے سرسید کی عدم موجودگی میں ۱۸۷۵ء میں واقعی طور پر کالج مذکور کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے۔ کہ ان مولوی صاحب کو سرسید سے اکثر امور میں اختلاف رہا۔ اور وہ جب کبھی کسی بات پر اڑ بیٹھتے تو پھر ہرگز کسی کی کچھ مانتے ہی نہ تھے۔ اور اگرچہ اس کالج کے در و دیوار پر اکثر جگہ مولوی سمیع اللہ خاں کا نام ثبت ہے۔ مگر ان مرحوم کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی عزت نہ اس دنیا میں ہے نہ شاید اس دنیا میں ہوگی کہ سرسید نے انکی نسبت جو کتبہ لکھوایا تھا اس میں یہ فقرہ اب تک موجود ہے کہ جناب مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر رئیس دہلی جرات وہمت را بکار بردند وبتاریخ بست وچہارم مئی ۱۸۷۵ء کہ روز سعید سالگرہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر ہند بود۔ ایں مدرسہ را اجرا فرمودند۔

ایک دل آزار کتاب جس نے دو مضمونوں کو مصیبت میں مبتلا کیا

احمد شاہ شایق ایک عیسائی نے امہات المومنین لکھی تھی۔ جس میں آنحضرت کی ذات پر معمول سے کچھ زیادہ تبرہ بازی کی گئی تھی۔ سرسید اس کتاب کو دیکھتے ہی جل بھن گئے۔ اور بایں ہمہ پیری و ضعف اعضاء اس کتاب کا جواب لکھنا شروع کیا۔ مگر وہ تمام نہ ہو سکا۔ مولوی نذیر احمد نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور امہات المومنین کے جواب میں امہات الامۃ بہت اچھی کتاب لکھی اور مخالف کے دندان شکن جواب دئے لیکن قل اعوذی مولویوں کو اس سے کیا حاصل وہ تو محض فقرات کو دیکھتے ہیں نہ کہ معانی کو۔ مولوی نذیر احمد کے قلم سے لکھتے وقت اس کتاب میں کچھ شوخ کلمے نکل گئے تھے۔ اس پر وہ اودھم مچا کہ مولوی صاحب موصوف کے گھر کا محاصرہ کرلیا گیا۔ اور جب تک وہ کتاب جل کر راکھ نہ ہوگئی۔ دلی کے کٹر مولویوں نے دم نہ لیا۔

تعجب ہے کہ جن لوگوں نے اس کتاب کو سوختنی قرار دیا تھا۔ ان کی فہرست میں شمس العلما علامہ شبلی نعمانی صاحب کا بھی نام درج ہے۔ جو کتب خانہ اسکندریہ کے عنوان سے ایک ایسا مضمون لکھ چکے ہیں۔ کہ جس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی علمی کتاب کو نہیں جلایا۔

چہ خوش ست انت منہم یا بروطس۔ واہا ثم آہا ثم آہا

مولانا شبلی کا انتہائی تشدد

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی اپنی ابتدائی زندگی کے زمانہ میں مکتب پڑھایا کرتے تھے اور اسوقت وہ اسقدر کے پکےّ حنفی تھے۔ کہ جس کا کچھ حد و حساب ہی نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ وہ ان دنوں میں ایک تند مزاج مولوی صاحب کا مکمل نمونہ تھے۔ جو تارکین صلوٰۃ پر بیحد تشدد کیا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے بعض شاگردوں کو پورے دو دو گھنٹے محض اسلئے پیٹا کرتے اور سخت عذاب پہنچایا کرتے تھے کہ وہ آئندہ نماز پڑھنے کا مستحکم وعدہ کر لیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار +

اب یہی مولوی شبلی نعمانی صاحب جب ندوہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تو مذہبی تعصبات سے اسقدر پاک و مرفع ہو گئے تھے۔ کہ ایکبار ان کے عہد میں وہاں کے لڑکوں نے اسٹرائک کر دی۔ تو عام لوگوں نے یہ مشہور کر دیا۔ کہ چونکہ مولوی صاحب موصوف پکےّ مسلمان نہیں ہیں۔ بلکہ کافر و ملحد ہیں۔ ان کا ندوہ کے لڑکوں پر بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ اور ان کی تحریروں۔ تقریروں اور تصنیفات کی وجہ سے طلبائے مدرسہ اعمال مذہب سے بالکل لاپرواہ ہو رہے ہیں۔ لہذا ان کارروائیوں سے بددل ہو کر آخر ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے ندوہ سے اپنا تعلق قطع کر لیا تھا۔ اور وہ پھر تادم زیست ہندوستان کے مولویوں یا کسی مذہبی انسٹیٹوٹ (جامع) کی اصلاح کے کبھی درپے نہ ہوئے +

مرحوم سرسید اور مولانا حالی کی ستائش

خواجہ صاحب موصوف نے ۱۸۹۱ عیسوی کے اجلاس علیگڈھ میں جب وہ ترجیع بند پڑھا۔ جس میں متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت کو خودغرض امرا اور ٹکڑ

گداگری کی حالتوں سے بہتر بتایا گیا تھا۔ تو سر سید اسے سنکر مولانا حالی کو داد کلام دینے کے لئے کھڑے ہوئے پس کچھ تقریر کر کے فرمایا۔ کہ صاحبو۔ آیندہ زمانہ میں اگر پوچھا جاویگا۔ کہ فخر قوم فخر شعرا۔ فخر ملک۔ فخر علما اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے۔ تو کہا جاویگا کہ "حالی" *

شمس العلما علامہ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا "الناّمہ"

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ملا دو پیازہ نے اپنے عہد میں ایک "الُ نامہ" تصنیف کیا تھا۔ جو بہت ہی مقبول ہوا تھا۔ چنانچہ اسکے بعض مضحک جملے آجتک زبان زد خاص عام ہیں۔ مثلاً الحلوا۔ خوان یغما۔ الخاموشی نیم رضا وغیرہ وغیرہ۔ اس نمونہ پر اردو میں بیسیوں النامے لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں کا ایک یہ فقرہ عموماً شنا گیا ہے۔ کہ الکُپ تراوت المغز *

غرض۔ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے بھی ۱۹۰۶ء میں ایک النامہ مرتب کیا تھا۔ جس کا خلاصہ مندرج ذیل ہے۔

(۱) المذہب اعلان جنگ (۲) الدین تقلید با و اجداد (۳) قسم از جہل مرکب (۴) الامتحان۔ آزمایش قابلیت ممتحنان (۵) الیونیورسٹی۔ کارخانہ کلرک سازی (۶) ال علی گڈھ پارٹی شہید وفا (۷) الانجمن ہائے اسلامیہ سبزہ برشگال۔ (۸) الرئیس آنکہ از ریاست بے خبر باشد (۹) الامیر آنکہ تہیدست و قرضدار باشد (۱۰) المولوی آنکہ جمیع مسلماناں را از دایرہ اسلام خارج مے کند۔ (۱۱) الواعظ آنکہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند (۱۲) الشکار بہانہ آدم کشی

---

* علامہ حالی نے بجز اس النامے کے فن ظرافت کی کوئی خدمت نہیں کی گویا حالی خالی تھے۔

نواب وقار الملک صاحب بہادر اور فتویٰ کفر

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ مولوی مشتاق حسین صاحب یعنی نواب وقار الملک نماز کے اسقدر سختی سے پابند تھے۔ کہ جب وہ سرکاری ملازم تھے۔ تو اوقات دفتر میں بھی فریضہ نماز کے ادا کرنے میں کبھی غفلت نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ خواہ کیسا ہی ضروری سرکاری کام کیوں نہ ہو وہ اسے وہیں چھوڑ کر مسجد کیطرف بھاگ جاتے تھے۔ ایک دفعہ مسٹر کالون نے جو کلکٹر ضلع تھے۔ انکو روکا کہ اسطرح کام چھوڑ کر نماز کو نہ جاؤ۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ صاحب نے اصرار کیا۔ تو آپ نے فوراً اپنا استعفیٰ ہی پیش کر دیا۔

تعجب ہے کہ ایک ایسے متدین اور پابند نماز آدمی کو بھی عام مسلمانوں نے اسوقت محض سرسید کی دوستی کیوجہ سے کافر خیال کیا۔ اور ان کو ملحد۔ بیدین۔ زندیق۔ نہ جانے کیا کیا الزام لگا کے چھوڑا لہٰذا علامہ حالی کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

اسلام اے فقیہو ہے ممنون بہت تمہارا   امرت کو چھان ڈالا کافر بنا بنا کر

نواب وقار الملک اور مسٹر آرچبولڈ صاحب

جب علیگڈھ کالج میں یورپین اسٹاف ایک مدت دراز کی ملازمت اور عام ہندستانیوں کی بزدلانہ عادات سے متاثر ہو کر بالکل مطلق العنان ہو گیا اور اس کالج کے بعض انگریز پروفیسر اور پرنسپل صاحب بہادر ٹرسٹیوں تک کے وقار کو بھی ٹھکرا دینے لگے۔ تو نواب وقار الملک بہادر نے اسم بامسمےٰ کام کیا۔ یعنی اپنے قومی کالج اور ہندوستانی ٹرسٹیوں کی عزت و وقار کو برقرار رکھنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ اور کالج کے پرنسپل آرچ بولڈ صاحب کو صاف بتا دیا کہ تم ہمارے قومی کالج کے ایک ملازم ہو۔ تمہیں ہرگز اختیار نہ تھا کہ کالج کے جھگڑوں کے متعلق ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ سے براہ راست خط و کتابت کرتے۔ لیکن وہ تو صاحب بہادر

تھے۔کب اُنکی سُننے والے تھے۔نوبت بانیجا رسید۔کہ سب ٹرسٹی ایک طرف۔اور یورپین اسٹاف ان کا مدمقابل۔لاٹ صاحب بہادر کو بلا لیا گیا۔انہوں نے ٹرسٹیوں ہی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔بس پھر کیا تھا۔مسٹر ارچبولڈ صاحب تو مستعفی ہوگئے اور مولوی مشتاق حسین صاحب یعنی نواب وقار الملک نے نہ صرف کالج کی بلکہ ساری قوم کی عزت رکھ لی!! ؎
این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

نواب وقار الملک اور تقسیم بنگال کا مسئلہ

اس مشہور تنازعہ کے متعلق جب بنگالیوں اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان سخت کشمکش واقع ہوئی۔ تو آخر گورنمنٹ ہی نے ہار مان کر تقسیم بنگالہ کی تجویز منسوخ کر دی تھی۔لیکن اس سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچتا تھا۔ اسلئے نواب وقار الملک صاحب بہادر جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے ہمیشہ سے پاسبان رہا کرتے تھے۔سرکار سے کچھ خفا ہوگئے اور اپنے کسی دوست کو یہ خط لکھا۔ کہ سرکار کا تقسیم بنگالہ کو منسوخ کرنا۔اور مسلمانوں کے حقوق کا اس طرح سے نظر انداز کر دینا۔گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک ایسے توپ خانہ کے ہے۔کہ جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گذر گیا ہو۔اور بالکل بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں جان بھی ہے کہ نہیں یا انکو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوئی ہوگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اجی کس کا مراکو اور کس کی ٹریپولی اور کہاں کا ایران۔یہاں تو سرے سے اسلام ہی کا قلع و قمع ہوا جاتا ہے!!

نواب وقار الملک کی دلیری اور مستقل مزاجی

سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا ایک حصہ گرا دیا گیا اور مسلمانوں پر مسٹر ٹائلر کلکٹر ضلع

نے فائر کرائے۔ تو اس سے کئی جانیں ناحق تلف ہوئیں۔ تمام مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ نواب وقار الملک مرحوم بھی از حد متاثر ہوئے۔ لیکن انکی مستقل مزاجی تو دیکھو کہ انہوں نے کانپور کا ہنگامۂ محشر کے عنوان سے اخباروں میں ایک مضمون بھیجا۔ جس میں آپ لکھتے ہیں کہ اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ تو بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بدمزاجی پر قایم نہیں رہ سکتا۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانان صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں۔ یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اسکو بغیر کافی توجہ کے اپنے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک ٹائلر نہیں آیندہ ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہی ہمارے لئے ٹائلر ثابت ہوگا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

نواب وقار الملک کا سفر حج

نواب صاحب موصوف کو راقم خاکسار نے الہ آباد کی ایک نمایش میں دیکھا تھا۔ جب ان کے قریب جا کر مصافحہ کیا۔ مجھے ان کے چہرے ہی سے متانت و دیانت کے آثار نظر آتے تھے۔ چنانچہ وہ جب حج کو گئے۔ تو ہر منزل پر غربا و محتاجین کے لئے اپنے صرفہ سے لکڑی اور پانی کا انتظام کر دیا کرتے تھے اور اسقدر باحوصلہ شخص تھے۔ کہ ینبوع میں دو ضعیف عورتوں کو پیادہ تکلیف کے ساتھ رستہ چلتے دیکھا۔ تو آپ بے اختیار اپنے اونٹ پر سے اتر پڑے اور انکو سوار کرا دیا مگر یہ واقعہ دیکھکر مولوی مظہر علی علیم مرحوم سفیر کانفرنس جو اسوقت حج کر رہے تھے۔ معاً انکے قریب آئے۔ اور کہا۔ کہ نواب صاحب آپ بھی تو ضعیف ہیں۔ آئیے میرے اونٹ پر سوار ہو جائیے۔

لیکن نواب صاحب مرحوم نے صاف انکار کیا۔ اور کہا کہ صاحب "یہ مبارک راستہ تو آنکھوں سے طے کرنیکا ہے مجھے یوں ہی چلنے دو"

فرقہ نیچریہ کہاں ہے؟

باوجودیکہ سرسید نے کوئی خاص فرقہ مسلمانوں میں بنا کھڑا نہیں کیا۔ تاہم انکے مخالفوں نے آجتک یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ وہ ایک فرقہ نیچریہ کے بانی تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس شریعت کی وہ خاص خاص کتابیں کہ جن میں اُس جداگانہ فرقہ اسلام کی توضیح کی گئی ہو۔ کہاں ہیں (جیسے شیعہ و سنی مذاہب کا لٹریچر ہر جگہ علیحدہ علیحدہ موجود۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ سرسید اگر مسلمانوں کی عام جہالت سے فایدہ اٹھانا چاہتے۔ تو وہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرح فرقہ نیچریت کے ہادی بنجاتے اور ایک خاص گروہ اپنے ساتھ لگا کر پجوایا کرتے تو بہت اچھے رہتے وہ سیّد تھے ہی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک نیچری پیر بن جانے سے خواجہ اجمیری یا داتا گنج بخش صاحب لاہوری کی طرح مانے جاتے۔ اور ان کو عمر بھر بہت تھیں۔ بلکہ ہاتھی زندہ تو لاکھ کا اور مرے تو سوا لاکھ کا۔ وہ جب مر ہوتے اور دلی یا علیگڈھ میں ان کا بھی ایک مزار شریف ہوتا۔ تو انکے کُنبے کیلئے روٹیاں بہت تھیں۔ چہ جائے کہ اپنی قوم کیلئے انکو دردست پڑی سخت ذلیل اور خوار ہوئے۔ اور علیگڈھ کالج کو بنا کر ان کا اور ان کا ہمیشہ دیوالہ نکلتا رہا۔ اور مرتے وقت ایک جھنجی کوڑی بھی اِنکے گھر سے ہوئی۔ اور محض ایک مانگے تانگے کے کفن میں لپیٹ کر ان کو صحن کالج دبا دیا گیا تھا۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے کوئی فرقہ نیچریہ وضع نہیں کیا مگر ا انکے مخالفوں نے زبردستی انکو اس خاص فرقہ کا موجد گردانا۔ اور مولوی محمد صاحب مدرس حیدرآباد دکن نے مذہب نیچر کی حقیقت یوں بیان فرمائی کہ

دنوں تمام ہندوستان یعنی ممالک مغربی و شمالی۔ اودھ پنجاب۔ بنگالہ۔ سندھ۔ برہما اور حیدر آباد دکن وغیرہ سے نیچر نیچر کی صدائیں ہمارے کانوں میں آتی ہیں اور ہر شہر و قریہ میں چند اشخاص نیچری کے نام سے ملقب پائے جاتے ہیں۔ سنو اسکی حقیقت کیا ہے۔ سنو۔ نیچر کے معنی ہیں طبیعت کے اور یہ طریقہ نیچریہ وہی ہریہ طریقہ ہے جو کہ حضرت مسیح کی پیدائش سے بھی کچھ پہلے خطہ یونان میں نمودار ہوا تھا اس سے مراد دین حقہ کا اٹھا دینا اور حلال و حرام کو ہمیشہ ایک جاننا ہے۔ جس امت میں یہ قوم نحوس پیدا ہوتی ہے۔ اسکے دینی اخلاص کو فاسد کرکے وہ اسکے زوال کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ اس سے مدنیت بگڑ جاتی ہے۔ ہئیت اجتماعیہ میں سخت تباہی پڑ جاتی ہے۔ اور پھر وہ قوم یا ملک سارے کا سارا غارت ہو جاتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ گروہ حکمائے یونان کے وقت سے اب تک چلا آتا ہے۔ اور یہ قوم مادئین کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔ کہیں یہ لوگ علم کو فروغ دینے اور جہالت و بے علمی کی جڑ قطع کرنے کے بہانے سے اپنے عقاید کی اشاعت کرتے ہیں اور کہیں یہ علم باطن میں قدم رکھ کر صاحب اسرار ہونیکا دعوے کرتے ہیں۔ چنانچہ اکثر صوفیہ خیال کے لوگ اور صاحب باطن جو اپنے آپ کو کاشف رموز پنہاں بتاتے ہیں۔ جیسے مصر کے اہل اسرار اور ایران کے بابی وہ اس فرقہ مادیہ یا نیچریہ سے متعلق ہیں اور امریکہ میں قوم مارمن جو اٹھارہ جوروئیں کرنے کی صاف اجازت دیتی ہے۔ وہ بھی باوجود عیسائی ہونیکے درحقیقت اسی نیچری سلسلہ کی ایک کڑی ہے (خوب) ان آخرالذکر مارمنوں کے ہاں دو کمپنیاں ہوتی ہیں۔ ایک مارمن مردوں کی دوسری مارمن عورتوں کی جو آپس میں بیاہ شادی کر لیتے ہیں۔ اور ان کی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ تو اس لڑکا یا لڑکی سے آپ پوچھیں کہ تمہارا باپ کون ہے اور ماں کون ہے۔ تو یہی جواب ملیگا۔ کہ ہمارا تو کوئی ماں باپ ہی نہیں ہم ایک کمپنی کی اولاد ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ لہذا۔

یہ نیچری اسی قسم کا ایک فرقہ ہے کہ جسکی سر سید نے ہندوستان میں بنیاد ڈالی ہے*

قارئین کرام ذرا غور فرمائیں۔ کہ کہاں یونان کے پرانے فلسفی۔ اور ایران و مصر کے صاحب اسرار و بابی اور کجا جنوبی امریکہ کے نارمن لوگ۔ انکے خیالات و عقاید میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ تاہم سر سید صاحب کے مخالف انکو بھی انہی لوگوں کے ساتھ ضم کیا چاہتے تھے۔ اسقدر تو ان کا مبلغ علم تھا۔ اور وہ سر سید کے ایسے متبحر و عالم شخص کی مخالفت پر ہمیشہ تلے رہتے تھے۔ اور خواہ مخواہ انکو ایک نیچری فرقہ کا موجد قرار دیا گیا تھا۔ کیا ہندوستان میں ایسا کوئی فرقہ موجود بھی ہے؟

تعجب ہے کہ مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری جو بعض جامع کتابوں کے مولف ہیں وہ بھی کتاب "مذاہب اسلام" میں ایک فرقہ نیچریہ کا حال شرح و بسط کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں اور جو کچھ اناپ شناپ ان کو سوجھا ہے وہ سب لکھدیا ہے۔ مثلاً نیچر ایک انگریزی لفظ ہے اور وہ ٹھیک ٹھیک مترادف ہے۔ لفظ فطرت اللہ اور قانون فطرت کے پس نیچری وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ کہ جو سر سید احمد خاں کی تصانیف کے پیرو ہیں۔ (خوب) کیا علیگڈھ کالج کے پروفیسروں۔ استادوں اور طالب علموں میں کوئی ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو اپنے نام کے ساتھ نیچری کا دم چھلا لگایا کرتے ہیں۔ مثلاً سعید احمد انصاری نیچری اور مرزا حیدر بخش دہلوی نیچری وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ باتیں کسی کے خواب و خیال ہی میں نہیں ہیں۔ تو پھر ہم مولوی نجم الغنی صاحب موصوف سے دریافت کیا چاہتے ہیں کہ وہ بتائیں آیا فرقہ نیچریہ محمدیہ کہیں زمین پر ہے یا آسمان پر یا سر سید کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا؟

تمت